جلد (۵) اپریل سنہ ۱۹۱۳ء نمبر (۱)

تمدن

معاشرتی۔ تمدنی۔ ادبی۔ فلسفی۔ اخلاقی۔ تاریخی۔ اور علمی مضامین کا مخزن

ایڈیٹرز شیخ محمد اکرام بیرسٹر ایٹ لا۔ محمد عبد الراشد الخیری

(فہرست مضامین)

تصویر

باہتمام محمد عبد الراشد الخیری

تمدن پریس دہلی میں چھپ کر شائع ہوا ۱۳۳۱ھ — قیمت فی پرچہ ...

نئے شہنشاہی شہر میں

شاہی حکیموں کا دواخانہ یونانی نورتن دہلی

1952

معززین شائقین یہ مشہور قدیم دواخانہ نورتن اپنے خاندانی مجربات اور کل یونانی مرکب ادویات مثل اطریفل - جوارشات خمیرے حلوے عرق اور معجونین وغیرہ نہایت صحیح اور عمدہ بنا کر کے دنیا بھر میں اپنی شہرت اور نیکنامی حاصل کر چکا ہے یہ دواخانہ معتمد الملک احترام الدولہ عالیجناب حکیم محمد احسن اللہ خان صاحب مرحوم کی یادگار ہے اور عالیجناب حکیم محمد بدرالدین خان صاحب کی سرپرستی میں مدت دراز سے اپنے فرائض منصبی انجام دے رہا ہے یہ کوئی معمولی دواخانہ نہیں ہے اس نیکنامی اور ہر دلعزیزی اور عمدہ نفیس ادویات کا شہرہ - لندن - اسٹریلیا - افریقہ - جاوا عدن - وغیرہ پہونچ چکا ہے - اس دواخانہ کو بڑے بڑے شاہی حکما کے خاندانی مجربات کا بھی فخر حاصل ہے۔

اس دواخانہ کی بڑی فہرست مع جنتری طریق علاج مفت ملتی ہے

طلاء حیات جوانی کی غلط کاریوں کیلئے اکسیر کجی و لاغری کو بیحد مفید ہے فی بکس ایک تولہ دو روپے آٹھ آنے (عہ)

حب مقوی باہ اعضاء رئیسہ کی کمزوری کو دور کرتی ہیں سست کو چست نامرد کو مرد بناتی ہیں (۴۰ عدد) ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ)

حب سوزاک یہ گولیاں سوزاک کا بہت جلد روگ کھو دیتی ہیں قرحہ کو بہت جلد بھر دیتی ہیں (۲۰ عدد) ایک روپیہ آٹھ آنے - (عہ)

حب مسک یہ گولیاں منی کو گاڑھا کرتی ہیں اور بہتی کو روک دیتی ہیں باہ بڑھاتی ہیں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں (۲۰ عدد) ایک روپیہ -

المشتہر

حکیم محمد یعقوب خان مالک دواخانہ یونانی نورتن دہلی بازار فراشخانہ

دوستی

(ماخوذ از ولیم کوپر)

گوہر شب تاب عالم میں ہے گر ایسا کوئی
کھو سکے تاریکی قلب حزیں جسکی ضیا

ایسی شے لاریب دنیا میں فقط ہے دوستی
یہ وہ گوہر ہے کہ نور مہر ہے اسکی ضیا

گو بہت سی محبت کا زمانہ میں ہے کال
جب تلاش اس کی کروگے بر محل مل جائیگی

کوئی شے ایسی نہیں ہو جس کا ہاتھ آنا محال
آج گر ملتی نہیں ڈھونڈیے کل مل جائیگی

مہر و الفت کا مگر جب کوئی تم سے دم بھرے
سب فرائض دوستی کے جانچ لینا چاہیے

یار شاطر ہونے کا ہر چند وہ دعوی کرے
ہر کس و ناکس کو لیکن دل نہ دینا چاہیے

صاف طینت پاک باطن نیک دل و حق شناس
راز دل کہنے میں کرتے ہیں بہت کم پیش و پس

عام لوگوں کو بھی کر لیتے ہیں اپنا قیاس
ہوتے ہیں از خود اسیر دام کید بوالہوس

دور ہو جاتی ہے گو خود یہ غلط فہمی مگر
کس قدر نقصان سہنے اور پریشانی کے بعد

خوئے زشت بدظنی ہے جس کا بالآخر ثمر
سرگرانی جیسے کیف راح ریحانی کے بعد

لیں نہ اسرار میں گر آنکھوں سے اپنی کام ہم
اور خزف ریزوں کو سمجھیں گوہر با آب و تاب

خط الفت سے رہیں گے عمر بھر ناکام ہم
بزم خلوت کو بھی سمجھیں گے کہ دل خوش کن ہے

خود غرض کے دام میں پھنسنا نہ ضائیں دیکھنا
دوست ایسوں کے کبھی بنتے نہیں روشن ضمیر

ان کو تو مل نہیں سکتا ہے الفت کا پتا
خود فروشی اور دنائت سے ہوا جنکا خمیر

ضامن (کنتوری)

تمدن

مریخ کی ندیان

اگلے زمانہ والے اجرام سماوی کی کیسی تقدیس و تنزیہ کر گئے ہین کہ عناصر و
موالید ثلاثہ کے سوا ان اجرام کو اجسام کہنے مین بھی تامل تھا ثقل و خفت
سے ان کو بری سمجھتے تھے ان کو صاحب نفوس قدسیہ خیال کرتے تھے
ان کے حرکات کو حرکت ارادی جانتے تھے ان کے تاثیرات پر اعتقاد کامل
رکھتے تھے ان کو آبائے علوی کا خطاب دیتے تھے روم و یونان والے مشتری
کو خدائے بزرگ سمجھے ہوئے تھے اور امریکہ والے مریخ کو فلک الافلاک اتنے
بڑے قطر و محیط کے ساتھہ ایک شب و روز کے عرصہ مین آٹھہ آسمانون کو
بغل مین دبائے ہوئے منقلب ہو جاتا تھا اور یہ حرکت اوس کی
زمانے کا معیار تھی زمانہ خود قدیم و واجب الوجود ہے اس سبب سے حرکت

بھی قدیم سے ہے اور ہمیشہ رہیگی اس لئے کہ زمانہ کے واسطے فنا کا تصور نہین ہو سکتا لیکن تعجب کی بات تو یہ ہے کہ فلک یہ حرکت اپنے ارادے سے کرتا ہے اس خرافات کے رد کرنے کے لئے اور اس طلسم کے توڑنے کے لئے سب سے پہلے جس نے تمام عالم مین قلم اٹھایا وہ امام محمد غزالی ہین جنہون نے تہافت الفلاسفہ خاص اسی بحث مین لکھی جب سے فلسفہ کا ترجمہ عربی مین ہوا تھا متکلمین نے بھی اس باب مین بہت کچھ رد و قبول کر مباحث لکھے ہین وہ ہم تک نہین پہونچے۔ مگر فلاسفہ کی عظمت ایسی دلمین سمائی ہوئی تھی کہ لوگ یہی سمجھا کئے کہ ان کا لکھا پتھر کی لکیر ہے ابن رشد کے فلسفہ و حکمت پر مجھے یہ بڑا داغ نظر آتا ہے کہ اوس نے تہافت الفلاسفہ کا جواب لکھا لوگون نے سیارات کو موثر حقیقی سمجھکر صدہا طریقے دعوتون کے اور عمل کے ایجاد کئے منہ مانگی دعائین مرادین ملنے لگین کہتے ہین یہان تک اہل عمل کا زور بڑھ گیا کہ بادشاہ نے کسی عامل کی گرفتاری کے لئے دوڑ بھیجی یہ گھبرا کر کوٹھے پر چڑھ گیا دیکھا کہ مریخ خون آشام قبائے سرخ فام پہنے ہوئے طلوع کر چکا ہے۔ اب کیا تھا کہہ دیا اقتل یا مریخ۔ خواجہ آتش نے مریخ کی اسی صفت کو ایک مطلع مین اس طرح نظم کیا ہے ؎

لباس سرخ پہنکر جو وہ جوان نکلا
پناہ مانگتا مریخ آسمان نکلا

مریخ کی عظمت و جلال کا جو تصور قدما کو تھا وہ تو آپ نے دیکھہ لیا اب حکمائے وقت کا جو خیال ہے اوسے بھی سنیئے۔ مریخ مٹی کا بنا ہوا ایک کرہ ہے زمین سے جسامت مین کم ہے اوس کی موت کا زمانہ قریب آگیا ہے یعنی سمندر

خشک ہوچکا ہے دونون قطبونکی طرف جب برف پگھلتی ہے تو ندیان بہہ بہہ کر کھیتون کو سیراب کرتی ہین اتنی ہی سے پانی پر وہان لوگون کی زندگی ہے پانی کی قلت سے ریگستان وصحرا ونمک زار وہان بہت ہین - ہمارے کرہ مین یہی حالت افریقہ مین شروع ہوچکی ہے جو مریخ مین عموماً ہر مقام مین پائی جاتی ہے -

جو لوگ مریخ کو پہچانتے ہین اونھین تعجب ہوتا ہوگا کہ اتنا چھوٹا سا ستارہ جو بعض اوقات ثوابت کے قریب قریب معلوم ہوتا ہے اوس مین ندیان کیونکر دکھائی دین بات یہ ہے کہ ثوابت پر تو دوربین کچھ کام نہین کرتی مگر سیارات کو بہت بڑا کرکے دکھاتی ہے - رسالۂ سائنس پروگریس مین مسٹر جیمس ورتھنگٹن نے بہت مفصل مضمون حال مین مریخ کی ندیون پر لکھا ہے اوس سے معلوم ہوتا ہی کہ بے دوربین کے چودھوین کا چاند جتنا بڑا ہمین معلوم ہوتا ہی اوس سے پانچ گنا بڑا مریخ دوربین مین دکھائی دیتا ہے اور ویسا ہی روشن اور جس طرح چاند کی دھبے صاف صاف دکھائی دیتے ہین اسی طرح مریخ مین بھی کئی مقامون کی سفیدی اور سبزی صاف معلوم ہوتی ہے -

۱۸۷۷ء مین کچھ کالی کالی لکیرین سی ستارہ مین معلوم ہوئین مسٹر لاویل نے قرینہ سے یقین کرلیا کہ ندیان ہین - پروفیسر برنرڈ جس نے مشتری کا پانچوان چاند ڈھونڈھ نکالا جو آج تک کسی کو نظر نہ آیا تھا وہ یہ کہتے ہین کہ مجھے تو مریخ مین وہ لکیرین نہین دکھائی دیتین - لاویل جسے ندیان سمجھتے ہین -

مسٹر ورتھنگٹن لکھتے ہین کہ سنہ ۱۹۰۹ء مین جب مریخ و آفتاب مین مقابلہ ہوا تو مین نے اور مسٹر لاویل نے ساتھ مریخ کو دیکھا (اس زمانے مین یہ ستارہ زمین سے قریب تر ہوتا ہے) اوس کے ایک کنارے پر ایک روشن سا نقطہ مین نے دیکھا گمان ہوا کہ چاند ہے مگر کالی لکیرین مجھے اوس وقت نہ سوجھین لاویل کو تو

لکیرین صاف معلوم دین مگر وہ چاند جسے مین نے دیکھا تھا نہ دکھائی دیا - مگر قوی دوربین سے دیر تک اُس ستارے کو دیکھتے رہو تو لکیرین اس طرح سے دکھائی دیتی جاتی ہین جیسے ایک چیز نظر آئی اور پھر آنکھہ سے اوجھل ہوگئی ایک آدھ لمحہ تک وہ نقشہ کالی دھاریون کا جو قطب سے خط استوا کیطرف بخط مستقیم آئی ہوئی ہین صاف صاف دکھائی دے گیا اور پھر نظر سے چھپ گیا - یہ خیال نکرنا چاہیئے کہ یہ کچھہ دیکھنے کی غلطی ہی یا دوربین پر کانون کے دھوکا پیدا ہوا ہی نہین دھوکا اور چیز ہے اور واقعی چیز اور ہی کچھہ ہوتی ہے اس مین اکثر جگہ دوہری لکیرین بھی معلوم ہوتی ہین اسکا سبب بھی کچھہ اوسی ستارہ مین ہی ہماری آنکھہ یا آلات کا کچھہ قصور نہین ہی -

دوربین مین جب یہ ستارہ ماہ کامل سے پانچ گنا بڑا دکھائی دیتا ہے تو اوس کے قطبونکی سفیدی صاف معلوم ہوتی ہے وہ بھی اس طرح کہ مدت تک شمالی قطب مین سفیدی معلوم ہوا کرتی ہے پھر اتنی ہی مدت تک جنوبی قطب مین سفیدی رہتی ہی اور شمالی قطب کی سفیدی جب جاتی رہتی ہی تو اوس طرف کی لکیرین چوڑی ہو جاتی ہین اسی طرح جب قطب جنوبی کی طرف سفیدی غائب ہو جاتی ہی تو ادھر کی لکیرین چوڑی ہو جاتی ہین حساب سے معلوم ہوا کہ جس قطب کی سفیدی جس زمانہ مین جاتی رہتی ہی اوسی قطب سے ان دنون مین آفتاب کا میلان ہوتا ہی - یہ دلیل ہی اس بات کی کہ سفیدی برف کی ہی اور آفتاب کے قریب آنے سے برف گھُل جاتی ہی ندیون مین پانی آتا ہی اس سبب سے لکیرین چوڑی دکھائی دیتی ہین یہ قیاس ہم نے اپنے کرۂ ارض پر کیا ہے کہ جب آفتاب ہمارے کرہ کے خط استوا سے گذر کر شمال مین آجاتا ہی تو ارض تسعین مین یعنی قطب شمالی مین چھہ مہینے تک دن رہتا ہی اور برف گھلنا شروع ہوتی ہی - پھر جب آفتاب قطب جنوبی کے قریب جاتا ہی تو وہان چھہ مہینہ تک دن رہتا ہی اور برف گھلنے لگتی ہی - اس سفیدی کے

علاوہ خط استوا کے قریب قریب وجوار مین ایک نئی طرح کی سفیدی جا بجا
اس ستارے مین معلوم ہوتی ہے اور ہمیشہ ہر فصل مین معلوم ہوتی ہے۔ یہ سفیدی
برف کی نہین ہوسکتی اس سبب سے کہ اس مین ایک خاص قسم کی چمک ہے دوسرے
آفتاب اکثر اُن مقامون مین سمت الراس پر رہتا ہے اگر برف کی سفیدی ہوتی
تو ہر فصل مین یکسان نہ دکھائی دیتی۔ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ ہزارون کوس تک
سمندر اس ستارے مین خشک ہوگیا ہے اور یہ نمک باقی رہگیا ہے جو ایک خاص قسم
کی چمک اور نئی طرح کی سفیدی رکھتا ہے۔ اس معمے کے حل کرنے کے بعد ایک
اشکال اور باقی رہجاتی ہے۔ وہ یہ کہ اس ستارہ کے کنارہ مشرقی مین ایک طرح
کی سفیدی ہمیشہ دکھائی دیتی ہے مگر یہ سفیدی اون دونون سفیدیون سے
مغائر ہے اور آفتاب کے جنوب و شمال مین سرکنے سے یہ سفیدی بھی سرکتی رہتی
ہے۔ اس سفیدی کو برف یا نمک زار کی چمک کہتے بن نہین پڑتا۔ اس سبب سے
کہ مریخ کی حرکت یومیہ مین یہ سفیدی ذرا حرکت نہین کرتی اگر کوہستانی برف
یا دریائے نمک کی سفیدی ہوتی تو ستارہ کی حرکت یومیہ کے ساتھ مغرب سے مشرق
کی طرف اسے حرکت ہوتی مگر یہ ہمیشہ مشرق ہی مین دکھائی دیتی ہے بلکہ شمال
سے جنوب اور جنوب سے شمال مین حرکت کرتے معلوم ہوتی ہے۔ اس اشکال
اہل رصد نے اس طرح حل کیا ہے کہ یہ مشرقی سفیدی صبح کا کہرا ہے اور وہان
فصل مین صبح کو کہرا پڑا کرتا ہے اور اس سے یہ پتہ بھی لگا کہ مریخ مین ہوا کا طبقہ
ہے جس مین کہر پیدا ہوتا ہے۔

یہ تو ظاہر ہے جس کرہ مین پانی بھی ہو نمک بھی ہو ہوا بھی ہو وہان جاندار بھی ضرور
ہین مگر ندیونکا خط مستقیم آنا کہ دائرہ عظیمہ کی قوس معلوم ہوتی ہین اور پانی
اس سے زیادہ سیدھی راہ نہین ہوسکتی پھر اکثر ندیون کا طول ہزار ہزار میل سے

زیادہ اور باٹ تیس میل تک ہو بڑا قرینہ ہے اس بات کا کہ یہ انسانکی صنعت ہے انسان بھی وہ انسان جو فلسفہ و طبعیات مین ماہر ہو۔

ہم اپنی حالت پر قیاس کر کے تعجب کر سکتے ہین کہ اتنی بڑی بڑی ندیان انسان کیونکر بنا سکتا ہے۔ یہ استعجاب کئی طرح سے دفع ہو سکتا ہے ایک تو یہ کہ کرۂ مریخ مسطح ہے اوسمین پہاڑ نہین معلوم ہوتے اگر بارہ ہزار فٹ کی بلندی بھی کسی پہاڑ مین ہوتی تو وہ بھی طلوع و غروب آفتاب کے وقت سایہ ڈلنے سے پہچان لیجاتی۔ پہاڑ و نکے نہونے سے ندیون کا کاٹ کر نکالنا آسان کام ہے۔ دوسرے یہ کہ مریخ آفتاب سے زیادہ دور ہے ہم لوگ زیادہ قریب ہین مریخ کی جسامت بھی زمین سے کم ہے۔ اسکے لوازم مین سے یہ ہے کہ مریخ پر چیزون کا وزن اتنا نہین ہو سکتا جتنا ہمارے کرہ پر ہے حساب سے اہل رصد نے یہ بات معلوم کر لی کہ مریخ پر ہر شے کا وزن یہان سے ساٹھ فیصدی کم ہے۔ وزن کم ہو جانے سے بارہ کشی تو ان لوگون کو آسان ہو گئی ہے مگر دوسری مصیبت کا سامنا ہے۔ وہ یہ کہ طبقات ہوا کا وزن بھی وہان کم ہے۔ ڈاکٹر لاویل نے حساب سے اس کا ثبوت دیا ہے کہ میزان الحرارۃ کے درجہ مین وہان پانی اوبل جاتا ہوگا اور ہوا کا دباؤ کم ہونے کے سبب سے وہان پانی بہت جلد اوڑ جاتا ہوگا۔ دونون کی طرف سے جو ندیان بہتی ہوئی خط استوا کی طرف آتی ہین۔ ان ندیون مین پانی کو سفر کرنے کے لئے کئی ہفتہ گذرتے ہونگے۔ اس عرصہ مین اگر یہ پانی نلون مین نہو تو راستہ ہی مین بھاپ بن کر اوڑ جاے اس مسئلہ سے وہان کے لوگ واقف ہین اور بحکمت و تدبیر پانی کو ضایع ہونے نہین دیتے عجب نہین کہ پانی آنیکی فصل مین جو لکیرین چوڑی دکھائی دیتی ہین۔ اونکے چوڑے ہو جانیکا سبب یہی ہو کہ نل بہت سے لگا کر پانی کو اوڑ جانے سے بچاتے ہونگے۔

اسی طرح پہاڑ و نکے نہونے سے جہان ندیون کے کاٹنے مین آسانی ہو گئی ہے وہان یہ مشکل بھی پیش آئی ہے کہ ستارہ کی سطح کے ہموار ہونے سے پانی کا بہنا بہت

دشوار ہو گیا ہے جو ثقیل کے ذریعے سے پانی کو بلندی پر چڑھانا ہوگا اس سبب سے کہ قطبین کی طرف زمین پست ہو گی اور خط استوا کے مقام پر بلند اور کرۂ متحیر کا مقتضا طبعی یہی ہے اگر یہ کہو کہ سمندروں کے سوکھ جانے سے جابجا نشیب پیدا ہو گئے ہونگے اور پانی آسانی سے خط استوا کی طرف ان نشیبوں میں سے آسکتا ہوگا۔ تو اس صورت میں تمام ندیوں کا بخط مستقیم ہونا قرین قیاس نہیں۔ اور پھر تمام ندیاں باہم متوازی بھی ہیں تقریباً جہاں جہاں دو ندیوں میں تقاطع ہی وہاں تاریک سا ایک نقطہ دکھائی دیتا ہی۔ اور ایسا تاریک نقطہ محل تقاطع کے سوا سارے کرہ بھر میں اور کہیں نہیں نظر آتا۔ ان لکیروں کے ندیوں کا قیاس اس سبب سے اور بھی صحیح ہو گیا کہ مریخ میں اوسی فصل میں سبزی دکھائی دیتی ہی جب برف گھلتی ہی اور لکیریں چوڑی ہو جاتی ہیں۔ ہر ایک قطب اپنے اپنے طبقہ کو سیراب کرتا رہتا ہی نمک زار و نکے متصل بھی سبزی منڈی سیکڑوں کوس تک پائی جاتی ہی غالباً یہ سب کھیت ہیں۔ اس کی نظیر ہمارے یہاں بھی افریقہ کے بعض خطوں میں موجود ہے کہ نمک زار کے متصل زراعت ہوا کرتی ہی۔

ندیوں کے ساتھ ہی ساتھ سبز میدان نظر آتے ہیں حساب کے رو سے آدھے سے زیادہ سطح اس ستارے کی سرسبز معلوم ہوتی ہی۔ اور قرینہ سے معلوم ہوتا ہی کہ یہ ندیاں آبرسانی کے علاوہ تقسیم ممالک و حدود و بلاد کا بھی کام دیتی ہونگی۔ کیسے باجبر وزحمت کش وہ لوگ ہیں جن کے سمندر خشک ہو گئے تو انھوں نے اتنا بڑا کارخانہ آب رسانی کا قایم کیا کہ بوند پانی کی ضایع نہونے پاوے۔ مدت سے لوگوں کو یہ اعتقاد تھا کہ زمین کے سوا اور کسی ستارہ کی آب و ہوا مزاج انسان کے موافق نہیں ہو سکتی مریخ کا یہ کارخانہ دیکھ وہ خیال واہی دفع ہو گیا۔ مریخ کی ندیوں کی کچھ حقیقت ہی تو اسی قدر ہی۔

علی حیدر طباطبائی

گداگری اور خیرات

گداگری کا ہندوستان مین ایسا زور ہے کہ شاید کسی ملک مین اور کہیں نہو۔ یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ محنت مشقت انسان پیٹ بھرنے کے لئے کرتا ہے نہ کہ پیٹ محنت و مشقت کرنے کے لئے بھرتا ہے جب انسان کو بغیر ہاتھ ہلائے دونون وقت پیٹ کے لایق خوراک ملجائے تو پھر اُسکو نوکری ڈھونڈنے یا مزدوری کرنے کی کیا حاجت ہے۔ ہندوستان غریب ہورہا ہو یا اوسکی دولت بڑھ رہی ہو یہ تو بحث طلب امور ہین لیکن اسمین کوئی شک نہین کہ مزدورونکی مزدوری پہلے سے دو چند ہوگئی ہے پھر بھی گداگری کی آمدنی اسقدر زیادہ ہے کہ ہر شہر کی اگر مردم شماری دیکھی جائے تو مزدورونکی نسبت فقیرونکی تعداد زیادہ نکلیگی۔ یہ آفت گاؤن مین اتنی نہین ہے جتنی شہرون مین ہے۔ گاؤن والے کام کرنے کو عیب نہین سمجھتے شہر مین بھیک مانگنا عیب نہین ہے۔ فقیرونکی بھی قسمین ہین بعض فقیر تو جدی فقیر چلے آتے ہین اور اُن کو گداگری ورثے مین ملی ہی۔ بعض فقیر اس فرقے مین پہلی ہی پشت سے شامل ہوئے ہین۔ جدی فقیر تکیون مین رہتے ہین اُنکے محلے بندھے ہوئے ہین۔ آندھی جائے مینھ جائے لیکن انکا پھیرا خالی نہین جاتا۔ یہ ہر گھر والونکے نام سے واقف ہین جو نیا بچہ پیدا ہوتا ہے اُس کا بھی نام ان کو کسی طرح معلوم ہوجاتا ہی اور ایک ایک کا نام لیکر دعائین دیتے ہین اور روٹی ٹکڑا آٹا جو کچھ دیدیا چپکے سے لیکر چلے جاتے ہین۔ یہ اکثر افیم۔ بھنگ۔ چانڈو چرس وغیرہ نشون مین

سے کسی نشے کے تابع ہوتے ہین دن بھر تکیے مین بیٹھے حقے اڑاتے رہے نشہ پانی کرتے رہے رات کو اسی نشہ کی لہر مین بھیک کے گشت پر نکل جاتے ہین بعض فقیر مکار بدمعاش لٹیرے اور دغاباز ہوتے ہین یہ طرح طرح کے سوانگ بنا کر آتے ہین اور عجیب عجیب قسم کی بولیان بولتے ہین۔ کوئی یہ کہتا ہوا غل مچاتا پھرتا ہے کہ "ایک پیسہ لونگا اور سو گالی دونگا" کوئی رستہ چلنے والے ایک حاکمانہ آواز سے ٹھہرا کر اسکی آنکھون مین آنکھین ڈالکر زور سے کہتا ہے "فقیر کو ایک کمل دلوا دے" اور دلوا دے دلوا دے کہکر جان کھا لیتا ہے اور غل مچاتا ہے۔ جو پیسہ دو پیسے دیکر ٹالنا چاہو تو منہ پر مارتا ہے۔ اس قسم کے فقیر ڈیوڑہیون پر آکر عورتون کو بڑا دق کرتے ہین اور ان سے لوٹ مار کرکے خوب مال لیجاتے ہین۔ موٹے موٹے لٹھ زمین پر مارتے ہین اور حکم دیتے ہین کہ مائی دے ورنہ خدا جانے کیا قہر نازل ہو جائیگا۔ کوئی لوہے کی نوک دار گرز اور زنجیرین لئے پھرتے ہین اور اس سے اپنے بدن کو ہلاک کئے ڈالتے ہین اور اکثر بنیئون کو ڈراتے پھرتے ہین کہ پیسہ نہ دیگا تو اپنا سر لال کرینگے۔ بعض فقیر بڑے زور و شور کے ساتھ عورتون کو سنانے کے لئے پکار پکار کے مکانون کے دروازے کے باہر پیشین گوئیان کرتی ہین۔ ان قدیمی فقیرون کے علاوہ نئے فقیر بھی ہین جو شریفونکی سی شکل سے لئے ہوئے مظلومونکی صورت بنا کر آنکھون مین آنسو ڈبڈبا لائینگے اور چپکے سے آپکے قریب آکر نہایت مری ہوئی آواز مین سوال کرینگے کہ شریف ہین کچھ مدد کیجئے کسی کا مال چوری ہو گیا ہو۔ کسی کے

ہان بچہ ہوا ہے - کسی کی مان مرگئی ہے اور اوس کا جنازہ بے کفن پڑا ہے - کوئی پاک پٹن شریف سے واپس آیا ہے اور خرچ ہو چکا - کوئی حج کو یا اجمیر شریف کو جا رہا ہے غرضکہ یہ لوگ ہزارون بہانے بنا بنا کر لوگون کی جیب کترتے ہین اور جو حقیقی مصیبت زدہ غریب ہین اونکی راہ کھوٹی کرتے ہین -

اس سے زیادہ شریفانہ صورت کا گداگر کاغذ کا پرچہ لکھوا کر لئے پھرتا ہے - اس مین جھوٹا یا سچا اپنی حقیقت کا حال لکھوا لیا اور لوگون کو دکھاتے پھرے اور جو رقم وصول ہوئی شام کو چنڈو خانے مین اُڑا دی - اس زمرے مین چند جنٹلمین نئے فیشن کے فقیر بھی ہین ان مین بعض بعض حقیقی ہوتے ہین بعض جعلساز - حقیقی تو وہ جو انجمن حمایت اسلام - یا ندوت العلما - یا اسلامیہ کالج لاہور، علی گڈھ کالج ڈیولی وغیرہ وغیرہ کی طرف سے باقاعدہ چندہ مانگنے کے لئے بھیجے جاتے ہین - انمین سے بعض تنخواہ دار ہوتے ہین اور بعض مفت کام کرتے ہین یہ عموماً طلبا ہوتے ہین اور اگرچہ بھیک مانگنا خواہ وہ کسی نیک غرض کے لئے ہی کیون نہو ایکا احسن پیشہ نہین ہے تاہم وہ ایک جائز خیرات کا سوال کرتے ہین اور قابل عفو ہین لیکن انہی جنٹلمین اور مولوی نما اصحاب مین سے بعض حضرات جعلساز نکلتے ہین - کسی کالج یا انجمن یا جہاز ریلوے کی طرف سے چندہ مانگنے والے بنجاتے ہین اور لوگونکا سینکڑون روپیہ کہا جاتے ہین - یہ بدنام کنندگان نکو نامے چند مین سے ہین - مگر یہ کالجون اور انجمنون و یتیم خانون اور جہاز ریلوے کے چندہ مانگنے والے جنکو مین قومی

قومی گداگر ڈاکو کے نام سے ملقب کرنا چاہتا ہون پیشہ ور فقیرون سے کچھہ کم نہین ہونگے۔ آپ کے مکان کو خانہ بے تکلف سمجھکر آپ کے مہمان ہوجائینگے۔ اور ایکدم سے ایک دو تین چار چار۔ آپ کا گاڑی۔ گھوڑا۔ آپ کا ڈرائینگ روم۔ آپ کا آفس روم۔ آپکی لائبریری کوئی چیز اور کوئی جگہ انکے تخت و تاراج سے نہ بچیگی۔ کھانے کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ ایک دن کا مہمان دو دن کا مہمان" پورانے زمانے کی اولڈ فیشن مثل ہے۔ یہان تو حصہ برادرانہ بیار کے حکم پر آئے ہین اور بھائیون کی طرح رہتے ہین۔ اگر آپ خوشامد پسند ہین تو آپکی تعریف مین زمین آسمان کے قلابے ملادینگے اگر آپ اُس کالج یا انجمن یا یتیم خانے کی پالیسی کے خلاف ہین تو وہ اپنی دلیل مین آپ کو ثابت کردین گے۔ کہ آپ سخت بیوقوف ہین سخت جاہل ہین اور محض اولڈ فیشن نا تعلیم یافتہ شخص ہین۔ آپ نے اگر انکی خاطر خواہ تواضع کردی تو یہان سے جاکر کسی اخبار مین آپکے شہر کے ذکر مین آپکی فیاضی کا بھی حوالہ دیدیا لیکن جو آپ کہین اُنکے کالج مین یا انجمن یتیم خانے کے جلسے مین اُن سے ملجاوین اور کسی کام کو کہدین تو وہ آپ سے آنکھہ تک نہ ملائینگے۔ اور جو آپ نے اُنکو چندہ نہین دیا تو اخبار کے کالم کالم آپکے خلاف کالے کرڈالین گے بعض اخبار والے بھی تو انہی کے بھائی براوری ہوتے ہین وہ بھی بخوشی ایسی شکایات شایع کردیتے ہین۔ متذکرہ بالا فقیرون کے علاوہ ایک اور گروہ ہے جو زیادہ عظمت و بزرگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور جن کو درویش یا مذہبی فقیہ کہا جاتا ہے۔ یہ فرقہ ہر ملک اور ملت مین پایا جاتا ہے

اس فرقے کی اصلی بنیاد تو اس اصول پر ہے کہ آلائش دنیا سے بچنا چاہیئے اور خدا کی طرف دھیان لگانا چاہیئے آلائش دنیا سے بچنے کے لئے آسودگی چاہیئے یا قناعت و نفس کشی ورنہ پیٹ اور خواہش نفسانی انسان کے ساتھ لگی ہوئی ہین خدا کی طرف دھیان لگانے کے لئے نہ صرف یکسوئی کی ضرورت ہے بلکہ کسی رہبر کی بھی حاجت ہے۔ اہل دنیا باوجود اپنی معصیت کے من نہ کردم شما حذر بکنید پر کاربند ہوکر سالکان طریق معرفت کی نہایت خوش اعتقادی سے امداد کرتے رہے ہین چنانچہ ہر ملک اور ہر زمانے مین ایسا ہوتا رہا ہے اور ان اہل اللہ کی نان جو کا بخوبی انتظام ہو گیا ہے جنھون نے قناعت و نفس کشی کی سچی مثالین قائم کی ہین اور انکے بعد انکے شاگرد بھی پیٹ کے فکر سے آزاد ہے اور اون کے گذارے کے لئے بادشاہون اور اہل ملک نے بڑی بڑی جائدادین وقف کر دین اور اونکے معتقدین متواتر تو بھی اور انکے جانشینون کی امداد مین سرگرم رہے۔ ایسے اہل اللہ ہر مذہب و ملت مین بہت سے گذرے ہین ہر ایک کے پیرو اور معتقد اونکے نام سے مشہور ہو گئے اور اس طرح سے درویشون کے مختلف فرقے دنیا کے ہر ملک اور ہر مذہب مین پیدا ہو گئے۔

ابتدا مین اس گروہ نے دنیا مین ایسے عظیم الشان کام کئے کہ جوانسانی تاریخ مین اب تک سنہرے الفاظ مین لکھے ہوئے ہین۔ بڑے بڑے زبردست بادشاہون کو جن کے دبدبے اور جاہ و جلال سے دنیا تھرّاتی تھی اس گروہ سے نیچا

دیکھنا پڑا۔ یہ گروہ گمراہون کو راہ پر لانے والا۔ ستمگار کو سزا دینے والا۔ بدکارون کو بدکاری سے بچانے والا۔ بیکس وغریب کا حامی یتیمون ومظلمون کا مددگار۔ غرضکہ ہر طرح سے جنس انسانی کا سچا خیرخواہ تھا۔ لیکن جون جون اس گروہ کی تعداد مین ترقی ہوتی گئی اوصاف مین کمی آتی گئی۔ سچون کے ساتھہ جھوٹے ملتے گئے۔ نیکونکی صحبت بدون سے ہوتی گئی بزرگونکی اولاد مین امیری کی بو آنے لگی۔ امیری کے ساتھہ فقیری کے وصف معدوم ہونے شروع ہو گئے حتیٰ کہ ایک زمانہ وہ آگیا کہ فقیرا درگور وفقیری درکتاب ہی رہگئی۔ اور جس طرح ابتدا مین اہل دنیا معتقد تھے اسی طرح ان نقلی بزرگون یا اصلی بزرگون کی نقلی اولاد سے لوگ ایسے بدظن ہوگئے کہ اب فقیری صرف مکاری حیلسازی حرام خوری کے مترادف لفظ ہوگیا ہے اور دنیا کا فقیرونکی طرف سے بالکل اعتقاد اُٹھہ گیا۔ زیادہ قابل افسوس امر یہ ہے کہ جن بزرگون نے فقیری یا درویشی کے گروہ کو دنیا مین قایم کیا اونکی اولاد اپنے افعال بد سے اُسی گروہ کی بیخ کنی کر رہی ہے۔

یہ مذہبی فقیر ہندوستان مین ہندو مسلمان دونون مذہبون مین پائے جاتے ہین۔ مسلمانون کی نسبت ہندوٗن مین اس کے فرقے بہت زیادہ ہین۔ اسی قسم کے فقیرون کو سادھو سنیاسی۔ بیراگی۔ جوگی گسائین۔ سوامی جی۔ مہنت جی۔ وغیرہ وغیرہ نامون سے یاد کیا جاتا ہے۔ لیکن ان مین سے ہر لفظ علیحدہ

علیحدہ معنی رکھتا ہے۔ مثلاً سادھو کے معنی ایک پاک آدمی کے ہین اور ہر مذہبی فقیر کو سادھو کہا جا سکتا ہے۔ سنیاسی اُس فرقے کا نام ہے جو دنیا کو چھوڑ دیتے ہین۔ جو تن عریانی سے بہتر نہین۔ دنیا مین لباس پر عمل کرتے ہین اور جن کو بھیک مانگنا منع ہے۔ بیراگی ایسے فقیر کو کہتے ہین جس نے نفس کُشی سے اپنی ہستی کو مٹا دیا ہو اور نفس امارہ پر حاوی ہو گیا ہو۔ جوگی وہ لوگ ہین جو پتنجلا کے یوگ شاستر کے پیرو ہین اور جن کا یہ خیال ہے کہ انسان کی روح دنیا مین رہکر بھی خدا مین جا ملتی ہے اس اصول مدعا کے لئے وہ اکثر مفصلہ ذیل آسن استعمال کرتے ہین۔

(۱) آلتی پالتی مار کر اس طرح بیٹھنا کہ داہنی ٹانگ بائین ران پر اور بائین ٹانگ داہنی ران پر رہے اور آنکھہ سے ناک کی پھننگ کو برابر دیکھا جائے۔

(۲) سیدھے ہاتھہ کے دو انگلیون سے ایک نتھنے کو بند کیا جائے اور دوسرے نتھنے سے خوب زور سے اندر کو سانس لیا جاے اور ساتھہ ہی کچھہ منتر بھی دل ہی دلمین پڑھتا رہے۔

(۳) تیسرے جب سانس خوب اچھی طرح پھیپھڑونکو پھلا دے تو انگوٹھے سے دوسرے نتھنے کو بھی بند کر لیا جاے۔

(۴) اس حالت مین ایک منتر کو چند مرتبہ دہرایا جائے۔

(۵) پھر ناک کھولدی جاے اور اُسی منتر کو ہزار دفعہ پڑھا جاے اس عمل سے وہ اپنی مراد کو پہنچتے ہین گُشائین کے معنی مرشد کے

ہین۔ سوامی کے معنی آقا کے ہین مہنت سادھوؤنکے سردار کو کہتے ہین۔

سنیاسی لوگ اپنے بال بڑھا لیتے ہین اور اون کو بٹ کر کپڑونکی شکل مین شوجی مہاراج کے نمونے پر سر پر آگے کی طرف جٹا سا باندھ لیتے ہین۔ بدن پر راکھ ملتے ہین اور چیتے کی کھال ساتھ لئے پھرتے ہین۔ بعض اپنی پیشانی پر ایک آنکھ بنا لیتے ہین تاکہ شیو کی سی صورت ہو جائے۔ کسی کے ہاتھ مین سنکھ ہوتا ہے کوئی بڑا چمٹا لئے پھرتا ہے۔

ہندؤن مین سب سے زیادہ رواج مذہبی فقیرون کا بودھ کے زمانے مین ہوا جس کی زندہ مثال اس وقت تک اُن ممالک مین موجود ہے جہان بودھ مذہب کے پیرو موجود ہین مثلاً برہما مین۔ ہندؤن کے مذہبی فقیرون کے سب فرقے اور اُنکے حالات لکھنے کے لئے تو ایک بڑی کتاب چاہئے۔

لیکن یہان یہی لکھنا کافی ہوگا کہ علاوہ برہمنون اور پجاریون کے ایک بڑی تعداد ہندؤن کی کسی نہ کسی قسم کے فقیری فرقہ مین شامل ہے۔

سکھون مین بھی گوبند ساہی اوداسی۔ نرملا۔ اور ضبتن دھاری ہوتے ہین۔ گوبند ساہی نہایت خوفناک لوگ ہوتے ہین قتل خون لوٹ مار ان کا پیشہ ہے ...... پانچ چیزین ضرور انکے ساتھ ...... ہوتی ہین کھنڈا (چاقو) کڑا۔ کنگھا۔ کچھ (جانگیا) کھیس (لمبے بال) اوداسی دنیا کو ہیچ سمجھتے ہین سنگون مین بھی ....

ہمیشہ خدا کی یاد مین دھیان لگاتے ہین اور کبھی بھیک نہین مانگتے اور سر کے بال اور ڈاڑھی کو جہان تک بڑے بڑھائے جاتے ہین۔ نرملا شادی نہین کرتے اور اکثر ننگے پھرتے ہین۔ جٹن دھاری بالونکی جٹا بنا کر سر پر باندھ لیتے ہین اور اکثر زرد رنگ کے کپڑے پہنتے ہین مسلمانون مین چشتیہ۔ قادریہ۔ نقشبندیہ۔ سہروردیہ تو مشہور فرقے ہین چشتیہ حضرت خواجہ معین چشتی صمدانی رحمۃ اللہ علیہ کے پیرو کہلاتے ہین۔ پیران پیر غوث اعظم دستگیر شیخ عبد القادر جیلانی کے پیرو خاندان قادریہ کے مرید کہلاتے تھے۔ حضرت شیخ فرید شکر گنج سید محمد شاہ گوالیاری کا خاندان نقشبندیہ کہلاتا ہے۔

اس کے علاوہ اور بھی فرقے ہین۔ مثلاً رافعی یا گرزمار۔ مداری۔ ملنگ یا بھنڈاری۔ سدا سہاگ۔ بینوا۔ جلالیہ۔ پار اسیریہ۔ بڑ بڑ۔ وغیرہ وغیرہ جو ہندوستان کے مختلف حصون مین پائے جاتے ہین۔ رافعی سیّد رفیع شاہ لاہوری کے مرید ہین اور اپنے جسم پر زخم لگا لگا کر اور اپنے گرز مار مار کر بھیک مانگتے ہین۔ مداری بدیع الدین شاہ زندہ شاہ مدار فرخ آبادی کے مرید ہین اور بھیک مانگتے ہین۔ ملنگ اور بھنڈاری انھی مین سے ہین۔

یہ لوگ نہایت بے خوف۔ منہ پھٹ اور ننگ ہوتے ہین۔ سدا سہاگ عورتون کا سا بناؤ سنگار کئے رہتے ہین۔ ہاتھ مین چوڑیان پہنتے ہین اور اکثر طوائف اور بھانڈون مین مانگتے پھرتے ہین۔ بینوا کی پہچان یہ ہے کہ وہ جمپیل ہاتھ مین لئے پھرتے ہین۔ بڑ بڑ بھی بےنوائی کی ایک شاخ ہین یہ لوگ بڑ بڑ کرتے رہتے ہین اور فال وغیرہ کھولتے ہین۔

ان فقیرون کا زور یون تو ہندوستان کے ہر حصے مین ہے لیکن دیسی ریاستون مین خاصکر حیدر آباد دکن مین مذہبی فقیرون کی ایک بڑی تعداد پائی جاتی ہے جسکی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ علاقے ابھی تعلیم کی روشنی سے منور نہین ہوئے اسلئے وہان کے باشندون نے مذہب کو توہمات کا شکار بنا رکھا ہے۔
تعلیم و تہذیب جون جون ترقی کرتی جاتی ہے۔ لوگ اصلی بزرگون اور نقلی بزرگون مین تمیز کرتے جاتے ہین اور جھوٹے پیرون کا طلسم ٹوٹتا جاتا ہے
اس گداگری مین اہل ہند اب ہر سال کس قدر روپیہ صرف کرتے ہین۔ اصلی خیرات کے کیا معنی ہین۔ اُس روپیہ کو کس طرح اصلی خیرات مین لگایا جاتا سکتا ہے۔ فقیرون کی تعداد کم کرنے کے لئے کیا انسداد کیا جاسکتا ہے یہ سب امور اس مضمون کے دوسرے حصے مین زیر بحث آئینگے۔

مشتاق احمد زاہدی بی اے

قوت الخیال

پروفیسر صاحب موصوف کی دوسری کتاب جو اُس مشہور انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے جسکی تھوڑے عرصہ مین تیس چالیس ہزار جلدین فروخت ہو چکی ہین۔ کتاب کی خوبی دیکھنے سے معلوم ہو سکتی ہے
قیمت چار آنے۔
مینجر عصمت و تمدن۔

دہلی کے پنجابی

گذشتہ سے پیوستہ

اور اگر کوئی دیکھیگا بھی تو کیا کر لے گا۔ مرد ہو! رنڈی کے کوٹھے پر جا رہے ہو۔ کسی کے ہان ڈاکہ تو نہین ڈال رہے۔ دوسرے ہم تو فقط تھوڑی دیر کی دل لگی کے لئے جاتے ہین چخلس مچاکر واپس آجائینگے اور یارون نے بھی ہان مین ہان ملائی۔ محبوب کا قدم ڈگمگایا۔ سوچا کہ بات تو ٹھیک ہے آخر مرد ہون عورت تو نہین۔ اور اس طرح یارون کا ساتھ چھوڑنا بزدلی کی علامت ہوگی اور اگر کوئی دیکھیگا تو مین اکیلا تھوڑا ہی ہون۔ فیصلہ کر کے آگے بڑھا دروازے مین داخل ہو کر پھر ٹھٹکا مگر دوبارہ دل کڑا کر کے سیڑھی پر قدم رکھدیا۔ کاش اوس کو یہ خبر ہوتی کہ اُس بالاخانے کی سیڑھیون پر جو جو قدم اوپر کی طرف بےجارہا تھا اُتنا ہی اخلاقی زینے سے نیچے کی طرف اُتر رہا تھا۔ صحبت بد نے اُس کی جوانی کی اُٹھتی ہوئی کونپل کو گھن لگا دیا تھا اور اُس رات کے بعد اپنے کوٹھے پر محبوب کم نظر آنے لگا۔ مگر بازار حسن فروشان کے تاوے کاٹنا اُسکی عادت ہوگئی۔ اس زمانے مین محبوب ایک خوشرو اور چھیلا جوان ہے۔ جوانی کے خمار نے آنکھون مین لال ڈورے ڈال دئے ہین اور عشق و محبت کا سودا ہے ایسے عالم تصور مین محو کئے ہوئے ہے جہان کی فضا فرحت افزا اور باد صبا گلزار مسرت کی خوشبوؤن سے

معطر ہے۔ دل مین اگر تمنا اور شوق کی دو عملی ہے تو طبیعت مین ولولون کا زور ہے اور دماغ پر حصول مطلب کی تجاویز تسلط کئے ہوئے ہین۔ کسی بت طناز کے خم ابرو کا گھائل ہے قلب مضطر کی بیقراری ایک لمحہ چین نہین لینے دیتی۔ کبھی شب ہجران کی درازی کسی کے گیسوئے عنبرین کی یاد دلاتی ہے تو کبھی اُس دشمن ایمان کی چلبلاہٹ کا خیال آکر دل بھڑک اُٹھتا ہے۔ دن کو لب پر سرد آہین تو رات کو اُس کوچے کے ستو ستو پھیرے۔ جانتا ہے کہ انجام کار رسوائی و ذلت ہے۔ یہ کافر کب کسی کے ہوئے ہین۔ بیوفائی اِنکی سرشت ہے۔ سچی محبت کے نام سے انکے کان ناآشنا ہین۔ دولت کی الفت نے حُسن کا سودا لیکر سرِ بازار بیٹھنے پر مجبور کیا ہے۔ مگر دل کے ہاتھون لاچار ہے عقل و فہم کسی ہوش رُبا کے عشوے پر صدقے کر چکا ہے۔ جنون عشق کے جوش نے ایسا اندھا کر دیا ہے کہ کوٹھے کی بیٹھنے والی لیلی محمل نشین نظر آتی ہے۔

کر دیئے گُل آہ کتنے قلب سوزان کے چراغ
تیری آنکھون نے کئے کیا کیا دل فتنہ نہ باز

غرض ایک عرصہ تک محبوب اون گلیونکی خاک چھانتا پھرتا ہے جہان کی زمین مین سے شبانہ روز (سرور) بداخلاقی کے کثیف بخارات نکلتے رہتے ہین اور جو روح جیسی لطیف چیز کے حق مین از حد مضر ثابت ہوتے ہین۔ ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جبکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے لئے دلدل مین سے نکلنا محال ہے لیکن اُسی وقت محبوب اپنی ذاتی جوہر کا ثبوت دیتا ہے کیونکہ اوسکی طبیعت قدرتاً رو بہ صلاحیت

بنائی گئی ہے۔ دو اسباب ہین جو اوس کو تحت الثری تک جانے سے بچاتے ہین ایک تو یہ کہ عیاشی کے زمانے مین باوجود فرط تغافل کے اپنے کاروبار مین وہ کبھی اتنی غفلت یا سستی نہین کرتا کہ بعد مین دکان کا کام سنبھلنا محال ہو جائے اس لئے جب خواب سے بیدار ہوتا ہے تو از سر نو محنت کر کے سارا کام سنوار لیتا ہے اور دوسرے یہ کہ جب ہوش مین ہوتا ہے تو اپنی برادری کے بڑے بوڑھون کی بات مان جاتا ہے اور اُن کی صلاح و نصیحت پر عمل کرتا ہے جو سلیم الطبع ہونے کی علامت ہے۔ چنانچہ جب اس کی بے اعتدالیون کی اُڑتی اُڑتی خبر گھر کے لوگون اور رشتہ دارون کو پہونچتی ہے تو اونکو از حد تشویش دامنگیر ہوتی ہے اور اونکی پہلی کوشش یہ ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح بُری صحبت سے بچائین۔ ادھر تو گھر کے مرد چچا ماموں وغیرہ دیکھہ بھال کرتے رہتے ہین اور موقع محل دیکھہ کر فرمایش کرتے ہین جس کا خاطر خواہ اثر پڑتا ہے اور اُدھر گھر کی عورتین ماں بہن چچی پھپی وغیرہ اپنی برادری مین کسی خوبصورت اور سگھڑ لڑکی کی تلاش شروع کر دیتی ہین اور میان محبوب کو جلکڑ کر باندھنے کی تدبیرین ہونے لگتی ہین۔ اس طرح رفتہ رفتہ اوس کو راہ راست پر لایا جاتا ہے۔ بزرگونکی نصیحت یون کارگر ہوتی ہے کہ اوسکی توجہ فضولیات سے ہٹا کر کام دھندے کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے اور عورتونکی کوشش کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ اوس کے سامنے شادی کے بعد کی زندگی کا نقشہ کھچ جاتا ہے اور دل مین بیاہ کا شوق پیدا ہو جاتا ہے۔۔۔

برادری مین تلاش کے بعد مان کو اگر کوئی لڑکی پسند آگئی۔ باپ یا چچا کے موافق بھی بات ہوئی اور اپنے بیٹے کو کوئی اعتراض نہوا تو بیٹی والونکے ہان اپنی رسم کے موافق اُسی کا ذکر چھیڑا جاتا ہے اور جو وہ بھی راضی ہوگئے تو کوئی اچھی سی تاریخ دیکھکر عقد و داع ساتھ ہوجاتی ہے اِس کے ضمن مین یہ کہدینا غیر مناسب نہوگا کہ پنجابیونکی رسوم شادی دہلی کے دیگر مسلمان باشندون سے بہت مختلف ہین۔ موافقت صرف اُن باتون مین پائی جاتی ہے جو ضروری اور شرعی ارکان ہین مثلاً نکاح کے بعد دولھا کا دُلھن کے گھر پر جاکر وہان سے دُلھن کو اپنے گھر پر لانا ایک ضروری اور شرعی رکن ہے اِس لئے سب مسلمانون مین یکسان پایا جاتا ہے لیکن دہلی کے دیگر مسلمان گھرانون مین یہ رسم ہے کہ دولھا اندر زنانے مین بلایا جاتا ہے اور وہان آرسی مصحف ہوتا ہے یعنی دولھا دولھن کی صورت آئینے مین دیکھتا ہے یہ رسم جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ ہندی اور اسلامی اختلاط کا نتیجہ ہے کیونکہ لفظ آرسی ہندی ہے اور مصحف عربی اور دونون کا میل نہایت مبارک ہے۔ اُس کے بعد اور خدا جانے کیا کیا عورتون کا ڈھکوسلا ہوتا ہے۔ دولھا سے کچھ خوشبودار مصالحہ سل بٹے پر پسوا کر دُلھن کی مانگ بھروائی جاتی ہے پھر دولھا دولھن کو گود مین اُٹھاکر پالکی مین سوار کرتا ہے یہ تمام رسوم پنجابیون کے ہان غالباً نہین ہوتین۔ ایک اور بات یہ کہ عقد کے موقع پر جب پنجابی مرد اکٹھے ہوتے ہین تو تقریباً ہر ایک شخص اپنی حیثیت اور دولھا کے ساتھہ قرابت کے موافق کچھہ نقدی دیتا ہے۔

جس کا باقاعدہ حساب رکھا جاتا ہے گویا یہ ایک قسم کا قرض ہوتا ہی
جو دینے والے کے ہان شادی ہونے پر دولھا والے ادا کرینگے - برخلاف
اسکے ہمارے یہان مردونکے دینے کا دستور نہین البتہ دُلھن
کی مُنھ دکھلائی پر عورتین اپنی حثیت اور رشتہ دارونکے موافق رقمین دیتی
ہین - اسیطرح ہمارے یہان فقط دُلھن کا جہیز لیجانے اور دکھانے
کی غرض سے مردانے مین لایا جاتا ہے لیکن پنجابیونکے ہان علاوہ
جہیز کے دُلھن کا زیور بھی ایک طباق مین لگا کر مردانے مین لاتے
ہین - علیٰ ھذا اور بہت سی رسوم ہین جنمین اختلاف ہے اور حق یہ ہی
کہ پنجابیون کے ہان کا باوجود بہت سی ایسی رسمین ہونے کے جو بالکل فضول
ہین اگر ہمارے ہان کی رسوم قبیحہ اور جاہلانہ توہمات سے مقابلہ
کیاجائے تو انکی سادگی تعریف کے مستحق ہے - علاوہ برین
شادی کے بعد کی ایک اور رسم ہے جو اپنی اہمیت کے لحاظ سے درجہ
اولی رکھتی ہے کیونکہ نئے شادی شدہ میان بیوی کی آیندہ زندگی
مین باہمی اتحاد اور خوشی کا بہت کچھہ انحصار اُس پر ہے وہ
یہ ہے کہ شادی کی تھوڑی مُدت بعد دولھا کی والدین اپنے
بیٹے کے لئے ایک علیحدہ گھر لے دیتے ہین اور گھر کے متعلق کل
ضروریات مُہیا کردیتے ہین یہان تک کہ پھکنی اور دست پناہ تک
دینا نہین بھولتے - پھر ایک دن ساس خود اپنی بہو کو لے جا کر
گھر اُس کے حوالے کردیتی ہے اور اُس دن سے بہو اپنے
گھر کی خود مختار حاکم و مالک ہوتی ہے اور ساس کو انکے گھر یلو
انتظام سے آیندہ کوئی سروکار نہین رہتا - ہمارے ہان کی طرح

نہین کہ بہو کو ساس کے ساتھ رہنا پڑتا ہے اور اگر آپس مین نہین بنتی
جیسا کہ اکثر ہوتا ہے تو بیٹے کا الگ نفس ضیق مین آجاتا ہے اور ساس
بہوؤن کے تعلقات مین جو ناگفتہ بہ کشش پیدا ہوتی ہے اور
اُس سے جو شرمناک نتایج نکلے ہین اون کا خیال کرتے ہوئے
رونگٹے کھڑے ہوتے ہین۔ صدہا گھر صرف ساس بہو کے یکجا ہونے
سے برباد ہوئے ہین اور انکی آپس مین تکا فضیحتیان ضرب المثل
ہین۔ مان بہو کے خلاف بیٹے کے کان بھرتی ہین اور بیوی کی قدرتاً
یہ خواہش ہوتی ہے کہ خاوند میرا ہو کر رہے اس لئے وہ مان کے
خلاف بھڑکاتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مرد کی نگاہ مین دونون کی قدر
جاتی رہتی ہے اور گھر دوزخ نظر آتا ہے۔

پنجابیون مین شادی کے بعد الگ ہونے کا رواج نہ صرف قابل تحسین
ہے بلکہ قابل تقلید ہے اور ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ اس
رسم کو رواج دے۔ انگریزون مین یہی قاعدہ ہے اور اُنکے ہان
بھی ساس بہوؤنکی شکایت کبھی سُننے مین نہین آتی مگر پنجابیون کا طریقہ
ایک لحاظ سے انگریزون پر فوقیت رکھتا ہے وہ یون کہ انگریز تو ادھر شادی
ہوئے دیر نہین ہوتی اور ادھر علیحدہ مکان مین جا کر بس جاتے
ہین لیکن پنجابی فوراً ہی شادی کے بعد الگ نہین ہوتے بلکہ جب
دولھا کی مان کے دل کا ارمان اچھی طرح نکل جاتا ہے اور بہو سے
گھر بھرا دیکھہ کر طبیعت سیر ہو جاتی ہے تو علیحدہ ہونے کا
نام آتا ہے۔ چنانچہ جب محبوب الٰہی کا پلہ اپنی برادری کے رواج کے مطابق
ایک بڑے سوداگر کی بیٹی سے بندھ گیا تو تھوڑے دنون کے بعد

اپنے والدین سے الگ ہوکر اُسی محلہ مین ایک اور مکان مین جاکر..... ہنسی خوشی رہنے لگا۔ محبوب کی زندگی مین یہ عہد متانت کا عہد ہے۔ ہم اوپر یہ لکھہ چکے ہین کہ صحبت بد کے اثر سے راہ راست سے بھٹک کر وہ عیاشی مین پڑ گیا تھا لیکن یہان آنکر معلوم ہوتا ہے کہ وہ لہو لعب کا زمانہ اوس کی تربیت کے لئے اگر ضروری نہین تو بیکار بھی نہ تھا۔ اگرچہ عیاشی بذاتہ مذموم ہے لیکن ہماری گھریلو تعلیم کی تاریخ مین ایک وہ زمانہ بھی رہ چکا ہے جبکہ والدین آداب مجلس سکھانے اور طریقہ تکلم نشست و برخاست اور تربیت عامہ کی غرض سے اپنے بچون کو ڈیرے دار طوائفون کی صحبت مین بھیجا کرتے تھے۔ جس طرح فی زمانہ کولجون اور سکولون مین معلمون کی کوشش ہوتی ہے کہ طلباء مین کیریکٹر پیدا کرین اور اون کو تمیز اور انسانیت سکھائین اسی طرح پہلے زمانے مین اکثر شرفا کے لڑکے تمیز اور انسانیت کا سبق بالاخانون پر جاکر حاصل کیا کرتے تھے لیکن اب اس پیشہ والون مین نہ وہ شستہ اطواری باقی ہے اور نہ اُس پُرانے خیال کے والدین دیکھنے مین آتے ہین تاہم اکثر مشاہدے مین آیا ہے کہ جو لوگ اوائل شباب مین عیاشی کے ورطے مین پڑ چکے ہین اور جنکے مزاج مین صلاحیت کا خمیر ودلیعت کیا گیا ہے اُن کے لئے جب سنورنے کا وقت آتا ہے تو وہان سے اچھی طرح منجھکے نکلے ہین اور اونکی توبہ مردونکی توبہ ہوتی ہے جو مرتے دم تک توبہ ہی رہتی ہے فن عیاشی کے مداری نے ایسے ایسے کیریکٹر کے آدمی پیدا کئے ہین کہ جنکی لوگ مثالین دیتے ہین اول تو یہ سکول ہی ایسا ہے کہ جسمین ایسا ویسا آدمی داخل نہین ہوسکتا

کیونکہ اِس کے نصاب پر چلنے کے لئے انسان مین حوصلہ جُرأت قوت۔ ارادہ اور سکت ہونا لازمی ہے اور دوسرے علمی تعلیم کا ایسا سخت کورس ہے کہ اُس کا برداشت کرنا معمولی جبہہ کے آدمی کی طاقت سے باہر ہے۔ قدم قدم پر ٹھوکر کھانی پڑتی ہے۔ زمانہ خود اُستاد بنتا ہے اور عربی کی مثل ہے الدھر افصح المؤذبین لہذا اس کے شاگرد بھی اوروں کے لئے عبرت کا نمونہ ہوتے ہین جس طرح لوہے کو باری باری سے گرمی و سردی پہونچا کر فولاد بناتے ہین اسی طرح زمانے کے گرم و سرد سے اس سکول کے آدمیون کا کیریکٹر بنتا ہے۔ جو ہر پہلو سے فولادی حکم رکھتا ہے ایسے لوگ عموماً خاوندونکے فرایض بہترین طریقہ سے ادا کرتے ہین۔ انکی نگاہ مین عورت مرد کی خدمت کے لئے نہین ہوتی بلکہ اُس کو تمام اوصاف حمیدہ اور جذبات لطیفہ کا مرکز تصور کرتے ہین اُسکی عزت کرنی فقط اپنا فرض ہی نہین سمجھتے بلکہ درحقیقت اپنی زندگی کا مقصد عالی گرادنتے ہین۔ بہت سی مثالون مین ان کو خوش قسمتی سے بیویان بھی ایسی ملتی ہین جنھون نے بہت سی بگڑی ہوئی زندگیان اپنے ذاتی اثر سے سدھار کر قابل رشک بنا دی ہین۔ اس مین بھی شک نہین کہ ایسے خاوند کی درستی جو عیاش رہ چکا ہو۔ بیوی کی عقلمندی محبت اور حسن باطنی پر بہت کچھ انحصار رکھتی ہے لیکن عیاشی مین طبعاً وہ مصالح موجود ہوتے ہین جن کو کام مین لانے کے لئے فقط ایک ہوشیار صناع کی ضرورت ہوتی ہے عیاش خاوند کی نسبت یہ کبھی سننے مین نہین آیا کہ وہ اپنی بیوی سے حیوتا لیکر بات کرتا ہے

یا بدسلوکی سے پیش آتا ہے - اگر اُن دونون میان بیوی مین نفاق بھی ہوگا
تو فن عیاشی کے ماہر خاوند کے لئے یہ بالکل ناممکن ہے کہ وہ اپنی
بیوی کے ساتھہ گنوارون یا بازاری جاہلون کی طرح برتاؤ کرے
یا عورت ذات پر ہاتھہ اُٹھائے - جہان اخلاقی پہلو سے وہ ہماری ہجو کا
مستحق ہے وہان اُن خوبیون کا اعتراف نہ کرنا جو عموماً ایسے لوگون
مین پائی جاتی ہین غیر انصافی ہوگی - ہر شخص جو اس مذاق کے
لوگون سے ذرا بھی واقف ہے اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ عورت
کی دیوی کی طرح پرستش کرتے ہین اُس کو لطافت حسن اور
نزاکت کی مجسم تصویر اور قدرت کی نیرنگی کا قابل قدر کرشمہ خیال
کرتے ہین - یہی وجہ ہے کہ اچھی بیوی ملنے پر وہ بالکل کایا پلٹ ہوجاتے
ہین - چنانچہ محبوب الٰہی کی بیوی مین بالعموم وہ خوبیان موجود ہوتی ہین
جن کا ہونا گھر کے انتظام اور خوشی کے لئے لازمی ہے محبوب الٰہی کی
زندگی شادی سے پہلے محبوب کی زندگی سے کچھہ کم دلچسپ نہین ہوتی
بچپن مین محبوب کی طرح نور النسا کو بھی قاعدہ لیکر محلے کی بیوی
جی کے ہان بٹھایا جاتا ہے جہان یہ معصوم بارہ تیرہ برس کی عمر تک
نہ صرف قران شریف ناظرہ ختم کرتی ہے بلکہ سینا پرونا
کاڑھنا کترنا بنُنا اور کھانا پکانا وغیرہ سیکھہ جاتی ہے -
اور چونکہ مان کا سُگھڑاپا دیکھے ہوئے ہوتی ہے اس لئے گھر کا
رکھہ رکھاؤ خود بخود آجاتا ہے - اسکی طبیعت مین اول ہی سے چستی
اور پھُرتی کی عادت ڈالی جاتی ہے اور کاہلی کبھی پاس آنکر نہین
پھٹکتی - خالی بیٹھنا اس کے ذہن مین ایک بہت بڑی بُرائی ہے اِسلئے

کچھ نہ کچھ دھندا مشغلے کے لئے ضرور نکال لیتی ہے۔ گھر مین بیٹھے کاڑھتے کاڑھتے بہت جی گھبرایا تو سر پر برقع ڈال اپنے محلے کی سہیلی کے ہان چلی گئی کُرتا یا دوپٹہ ساتھ لیگئی۔ وہان منھہ سے باتین بھی کرتی جاتی ہے اور ہاتھہ سے بوٹیان بھی ڈالتی جاتی ہے غرضکہ اس طرح اپنے کام مین مشغول رہکر سچی خوشی کے ساتھہ اپنی زندگی بسر کرتی ہی یہان ہم کو پھر کسی پُرانے وقتونکے شریف میرزا حشمت علی کی صاحبزادی آفتاب جہان بیگم اور سوداگر بچی خیرالنسا کی عادات مین بین تفاوت نظر آتا ہے خیرالنسا ایک دولتمند سوداگر کی چاہتی بیٹی ہے اور ہم نے اوپر مجملاً لکھا کہ اُس کے والدین کس عمدہ طریقے سے اُٹھاتے ہین۔ اب ذرا بی آفتاب جہان بیگم کی تربیت ملاحظہ ہو۔ اول تو میان حشمت علی بیگ کے گھر مین دو دو نوکر ہین اور نورن کے باپ پاس اگرچہ اتنی دولت ہے کہ بقول شخصے میرزا صاحب جیسے شریف کو چار دفعہ مول لیکر چھوڑ دے لیکن گھر مین فقط ایک ماما ہے وہ بھی اوپر کا کام کاج کرنے کے لئے باقی ہنڈیا کی دیکھہ بھال کرنا اور پکانا ریندھنا نورن اور اوسکی والدہ خود کرتی ہین اور باوجود دو دو نوکرون کے مرزا صاحب کے گھر کا انتظام ٹھیک نہین ہوتا۔ ہو تو کیونکر۔ لاڈلی صاحبزادی سوتے سوتے آٹھہ نو بجے کے قریب بیدار ہوئین تو ماما کو حکم ہوا کہ ہاتھہ دھونے کے لئے آفتابے مین پانی لاکر رکھے۔ ایک باہر سودے کو گئی ہوئی تھی دوسری مصالح بگھار رہی تھی۔ گھبراہٹ مین جلتی پتیلی چولھے پر چھوڑی اور چھوٹی بیوی کی حکم کی تعمیل کی ورنہ صبح ہی صبح

خدا جانے اُنکے مُنہ سے کیا کچھ بُرا بھلا نہ سنتی - واپس آن کر جو دیکھا تو مصالحہ جل چکا تھا خیر اُدھر تو فضیحتیان ہوتی رہین اور ادھر چھوٹی بیگم ہاتھ مُنہ دھو کر اندر کے دالان مین گاؤ تکئے سے لگ کر بیٹھ گئین جس چیز کی اُنھین ضرورت ہوئی وہان سے حکم صادر ہونے شروع ہوئے پھر اِن کو ہل کر تنکا توڑنے کی بھی قسم ہے - کوئی مہمان آیا ہوا تو اُس سے باتین چیتین کرنے مین وقت گذار دیا - ایسے گھرون مین تقریبًا ہمیشہ ہی رشتہ کی بہن بھانجیان مہمان آتی رہتی ہین - دسترخوان بچھ گیا تو کھانا تناول کر لیا - دوپہر ہوئی اور ذرا نیند کا غلبہ ہوا تو سونے کی ٹھہرائی - چھوکری نے آنکھی جیتی کی جب نیند بھر گئی تو اُٹھ کر اگر خدا نے توفیق دی وضو کیا اور عصر کی نماز پڑھی پھر بہت جی گھبرایا اور پڑھنا آتا ہوا تو کوئی ناول لیکر ہو بیٹھین اور نہین تو ہفتون کا کپڑا آیا پڑا ہوا ہے اُس کو کترنے کے لئے منگوایا - مختصر یہ کہ ؎

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے

زندگی یون تمام ہوتی ہے

اور یہی کاہلی کی عادتین اکثر شادی کے بعد تک برقرار رہتی ہین - برخلاف اس کے نورالنسا بیوی بنکر نہ صرف زیادہ چست و چالاک ہو جاتی ہے بلکہ اپنے گھر کا انتظام اس خوبی کے ساتھ کرتی ہے کہ اگر خاوند کے مزاج مین بات بات مین کیڑے ڈالنے کا مرض بھی ہو تو اُس کو نکتہ چینی کا موقع نہین ملتا - شادی کے تھوڑے دنون بعد ہی محبوب اور نورن مین انتہا درجہ کی محبت ہو جاتی ہے اگر وہ بیوی کا دل رکھنی

کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہین کرتا تو وہ بھی فرمانبرداری اور محبت مین کسیطرح پیچھے نہین رہتی۔ سچی محبت کا اقتضا ہے کہ اپنے محبوب کی دل مین عزت ہو اور اگر محبت کے ساتھ محبت کرنے کا سلیقہ بھی آتا ہو جو محبوب الٰہی جیسے صحبت یافتہ شخص کو آنا لازمی ہے تو یہ سلیقہ سونے پر سہاگے کا کام کرتا ہے اور دو ذاتون کو الفت کے خمیر سے ایک مین مدغم کر دیتا ہے۔ ان دونون میان بیوی کی نسبت شاید اعتراض ہے کہ محبوب الٰہی اپنی بیوی کو واری تری کر کے پکارتا ہی جو بلاشبہ کانونکو کرخت معلوم ہوتا ہے اور جس سے ظاہر پایا جاتا ہے کہ پنجابی مردونکو اپنی عورتون کی توقیر کرنی نہین آتی لیکن حقیقت یہ ہے کہ انکے ہان بیوی سے تو تکار کے ساتھ بات کرنے کا رواج پڑ گیا ہے وہ لفظ تو کو تحقیراً استعمال نہین کرتے۔ مگر یہ بہتر ہو کہ وہ تو کی جگہ تم بولا کرین۔ ہمارے ہان اگر کوئی بیوی سے تو کرکے خطاب کرے تو اوس کو بے ادب اور بازاری خیال کرتے ہین تاہم اس سے انکار نہین ہو سکتا کہ محبوب اور ونکی نسبت اپنی بیوی کے ساتھ زیادہ امن محبت اور خوشی سے زندگی بسر کرتا ہے۔ شادی کے بعد اُس کا روزانہ معمول یہ ہو جاتا ہے کہ صبح اٹھکر دوکان پر جانا اور رات کو دوکان بڑھا کر سیدھا گھر آجانا۔ اگر گرمیون کے دن ہوے تو واپس گھر آتے مین بیوی کے لئے پھول خریدتا لاتا ہے۔ یا جو فصل کی ترکاری ہو وہ رومال مین باندھکر ساتھ لیتا آتا ہے۔ گھر مین بیوی شام کا کھانا پکا رکھ کر فارغ البال بیٹھی ہوتی ہے اوسکی آنکھین دروازے کی طرف لگی رہتی ہین کہ کب کواڑ کھلے اور کب اپنے سائین

کی صورت دیکھے۔ برس دو برس مین اگر خدانے کوئی لڑکا مرحمت گیا تو گھر مین اور رونق نظر آئیگی۔ تھوڑے دنون تک تو میان محبوب باپ بنکر اپنے آپ مین پھولے نہین سماتے۔ ادہر محبوب والی کا دل اپنے کلیجے کے ٹکڑے کا چاند سا مکھڑا دیکھکر اندر ہی اندر باغ باغ رہتا ہے مگر نئی مان ہونے کا قدرتی لحاظ مانع آتا ہے کہ اپنی محبت کا جوش سب کے سامنے ظاہر کرے غرض ان دونونکو ایک ایسا کھلونا ملجاتا ہے جس سے یہ اپنا دل بہلایا کرتے ہین۔ آگے تو محبوب کو فقط اپنی بیوی کا خیال لگا رہتا تھا مگر اب بیوی کے ساتھہ ہی اپنے ننھے کا خیال بھی دامنگیر رہتا ہے اس کے دل سے خودبخود دعا نکلتی ہے کہ یارب اگر تو نے ہم پر یہ رحمت فرمائی ہے تو اس کو عمر بھی عطا کر۔ جب کبھی کاروباری تفکرات کی وجہ سے اس کی طبیعت پریشان خاطر ہوتی ہے تو دلمین یہ ڈھارس بندھی رہتی ہے کہ اگر خدا نے میرے لڑکے کو عمر دی تو بڑھاپے کا عصا ہوگا اوپر کہا جاچکا ہے کہ محبوب کی عمر کا یہ عہد متانت کا عہد ہے کیونکہ اس زمانے مین وہ ایک محبت کرنے والا خاوند۔ اور مہربان باپ ہی نہین بلکہ بیرونی دنیا مین ایک اقبالمند تاجر اور دوکاندار بھی ہے جہان گھر کی سنبھالنے کا بوجھ اوس کے سر پر دھرا ہوتا ہے وہان دوکاندار ہونے کی ذمہ داریان ایسی نہین کہ جو آسانی سے اٹھائی جاسکین۔ اگر ایک دن دکان نہ کھولے تو بازار مین خدا جانے کیا افواہ مشہور ہو جائے۔ اگر کسی تاجر کا جس سے محبوب کا لین دین ہے دوالہ نکل جائے یا اور کوئی ایسی اچانک بپتا آن پڑے تو اوس کو اپنا کام سنبھالنا مشکل ہو جائے اور اب یہ چھوٹے دم تو ہے نہین کہ ان خدشات کی پرواہ نہ کرے۔ بیوی بچون کے ساتھہ آکر ہر قدم پھونک پھونک کر دھرنا ہوتا ہے اس لئے ہر معاملے کے مختلف

پہلوؤن پر غور کرنے کی مزاج مین خو پیدا ہو جاتی ہے اور متانت سرشت
قرار پا جاتی ہے ۔ اسی عہد مین اسکو مذہب کی طرف بھی تھوڑی بہت
توجہ ہونی شروع ہوتی ہے طبعاً محبوب الٰہی سادگی پسند ہے لہذا
مذہب مین بھی اپنی سمجھہ کے موافق سیدھے سادے طریقون کا دلدادہ ہے
اور مذہبی نکات اور باریکیون اور فرقہ بندیون سے گھبراتا ہے لیکن مولوی
لوگ کبھی اسکا پیچھا چھوڑنے والے ہین ۔ مقلدون کے مولوی صاحب غیر مقلدون
کو بدعتی ٹھہراتے ہین ۔ رفع یدین کرنے والے مقلدون پر منبر پر بیٹھکر
تبرا بھیجتے ہین ۔ پکار کے آمین کہنے والون کی مسجدین چپکے کھڑے رہنے والون
سے علیحدہ ہین اور یہ ساری تفرقہ پردازی اُن حضرات کی ہے جو کسی زمانے
مین فخر اسلام تھے لیکن اب علما کے نام پر دھبا لگاتے ہین ۔ یہ امر قابل
غور ہے کہ یہ مولوی جنھون نے پنجابی برادری کو مذہباً دو فرقون مین منقسم
کر دیا ہے بذات خود پنجابی نہین ہین ۔ دراصل پنجابیون کو اپنے کاروبار سے
اتنی فرصت نہین کہ وہ مولوی بننے کی طرف متوجہ ہون ۔ اُنکے ہان
شاذ و نادر ہی برادری کا کوئی مولوی ہوگا ۔ پنجابی برادری کو اس پر بجا
فخر ہونا چاہیئے کہ اُن مین سے ابھی تک مولوی یا پہونچا ہوا درویش جیسا
فضول آدمی نہین پیدا ہوا اور خدا نہ کرے کہ وہ پیشہ محمدیہ یعنی تجارت کو
جس ... کے ذریعہ نہ صرف اپنے تئین فائدہ پہونچاتے ہین بلکہ قوم کو
سرخرو بناتے ہین ۔ چھوڑ کر ان فضولیات کی طرف رجوع ہون ان کوتاہ
اندیش مولویون کی روزی کا انحصار اس پر ہے کہ بھائیون بھائیون مین
آمین اور رفع یدین کے مسئلو پر لڑائی کرائین اور ساری وعظ و نصیحت کا
مقتضے یہ ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اپنی پلاؤ کی رکابی نکل آئے ۔ اگر کسی مولوی

مسلم سے خطاب

یعنی وہ نظم جو خواجہ دل محمد صاحب ایم اے۔ ایم آر ایس اے (لندن) پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس مین پڑھی۔

مسلم اے دل شدۂ لذتِ عرفان مسلم ! ۔۔۔ مسلم اے قافلۂ حق کے حدی خوان مسلم !

جو رہے صرفہ کئے تجھپہ زمانے نے بہت ۔۔۔ ہاے اے دفترِ تسلیم کے عنوان مسلم !

کاخِ ملت ترا بہ جائیگا ڈر ہے مجکو ۔۔۔ غرب سے اُمڈا چلا آتا ہے طوفان مسلم !

نسیہ و نقدِ دو عالم سے ترا ہاتھ ہے صاف ۔۔۔ ترے قربان مرے بے سروسامان مسلم !

غیر اب تیرے حرم کو بھی لیا چاہتے ہین ۔۔۔ ہوش مین آ مرے کعبے کے نگہبان مسلم !

شمع ہے تو یہ سرِ رہگذر صرصرِ غرب ۔۔۔ تا بکے جلوہ سرِ گورِ غریبان ۔ مسلم !

اپنی ہستی ہی تجھی بار ہوئی جاتی ہے ۔۔۔ غنچہ سان بیٹھا ہے کیون سر بگریبان مسلم !

مثلِ نے ہمدم فریاد ہوا تو کیا ہے ۔۔۔ پھونک دے گرمیٔ آتش سے نیستان مسلم !

ہدفِ ناوکِ بیداد رہا ہے برسون ۔۔۔ چھد گئے لاکھون ترے سینہ مین ارمان مسلم !

شوقِ دل ہم سفرِ گردشِ ایام ہوا ۔۔۔ ہے بھنور مین تری امید پریشان مسلم !

سر کٹے جان چلی جائے سرکنا کیسا ۔۔۔ قطع منزل گہِ غیرت نہین آسان مسلم !

بحرِ ظلمت مین تری ذات تھی نوری مینار ۔۔۔ راہبر تو تھا سرِ قلزمِ طوفان مسلم !

خلق کو منزلِ حق تجھ سے ہی آسان ہوئی
آکے تہذیب ترے گھر مین مسلمان ہوئی

پھر قفس حوصلہ پیمائے شکیبائی ہے ۔۔۔ دل ہوائے چمنستان کا تمنائی ہے ...

درد نے پھر کوئی طوفان اٹھایا دل مین
چشم امید جو یون شوق مین بھر آئی ہے

کیا ہوا دل کو کہ احساس گھٹا جاتا ہے
دل نہین سینے مین اک چوٹ ابھر آئی ہے

کچھ اس انداز سے آئی ہے گلستان مین بہار
نگہ یاس بھی محو چمن آرائی ہے

پھونک دون شعلہ دمی سے خس خاشاک قفس
کہ طبیعت بہت اس قید سے اکتائی ہے

ہم اسیران قفس سبزہ و گل کیا جانین
ہان صبا سے یہ سنا ہے کہ بہار آئی ہے

ساغر عیش مرا چھین کے اورون کو دیا
پیر مے خانہ یہ اچھی ستم آرائی ہے

کیا کہے کس سے کہے دیکھنے والے ہی نہین
دیر سے داغ بکف لالہ صحرائی ہے

قصہ بلبل و گل بزم مین اے یار نہ چھیڑ
سچ تو یہ ہے کہ یہ بے وقت کی شہنائی ہے

کل تلک ریزہ خور خوان کرم تھے جن کے
آج دیکھو کہ انھین دعوی یکتائی ہے

تو ہے اور گنبد فانوس خیالی تیرا
وہ ہین اور فوج عزیمت کی صف آرائی ہے

رنگ ادبار سے مسلم تو خجل ہے کہ نہین
اب ترے سینے مین پہلا سا وہ دل ہے کہ نہین

محفل دوش کا سر مین ترے سودا کیون ہے
دل مین پہلی وہی یاد انجمن آرا کیون ہے

اور امید کے گھوڑے پہ چڑھے جاتے ہین
تجھے رونا ہی ہے ہائے تمنا کیون ہے

کج روی اپنی سے ہو منفعل رسوائی
شکوۂ سخت ستم گنبد مینا کیون ہے

نہین مے گران کو ہوس غارت دل کی ایسی
بزم اغیار مین شب کو میرا چرچا کیون ہے

چشم عبرت کو ہو نقش قدم اک آئینہ
ہو کے بیدار منزل کو تو بھولا کیون ہے

تیرا انداز تغافل ہے ادبار بکف
اسے حیرت تجھے اتنی ہے کہ رسوا کیون ہے

قلزم حسن عمل جامع اخلاق تھا تم
اب وہ آئین وفا بزم سے عنقا کیون ہے

خضر جادۂ تہذیب جہان تھا مسلم
مگر اب آپ ہی گم گشتہ صحرا کیون ہے

پر گئی قافلہ کی بانگ درا بھی دھیمی
نالہ قید گرہ آبلۂ پا کیون ہے

پائمال اس کو کیا خواب نے اس کی ورنہ — باغ مین سبزۂ خوابیدہ تہ پا کیون ہے

آتش اندوز کیا دہر نے اکثر تجھکو

داغ پر داغ دئے خام سمجھکر تجھکو

آگ سے زر نکل آتا ہے درخشان ہوکر — ہنس پڑی نار براہیم گلستان ہوکر

تیری محفل مین تو پہلے ہی نہ تھا کوئی جلیس — اب تو امید بھی جاتی ہی پشیمان ہوکر

تو وہ حیرت زدۂ دوری منزل ہی جسے — ذرے ذرے نے ڈرایا ہی بیابان ہوکر

تخت اورنگی ہوا مین لئے پھرتی ہی نسیم — اور تو خاک پہ بیٹھا ہے سلیمان ہوکر

اب تو انسان کی عناصر نے غلامی کر لی — برق آئی ہے گلستان مین فروزان ہوکر

طالب العلم ہے گر رکھ کوئی مقصد در پیش — ورنہ اس علم سے کیا لے گا پریشان ہوکر

وقف مشق ستم منتان کیون ہے یہان — سیکھہ آ فن کوئی امریکہ و جاپان ہوکر

آ ترے واسطے خالی ہی ترا تخت عزیز — چاہ مین بیٹھہ رہا تو مہ کنعان ہوکر

سرمۂ دیدۂ دشمن تھی تری گرد سفر — بڑھ گئے غیر تری گرد مین پنہان ہوکر

سر ہر نخل اٹھا جوش نمو سے اوپر — اور تری پشت ہے خم سرو گلستان ہوکر

صرف آئینۂ دل کر جو ہے خاطر مین غبار — عکس عالم یہ دکھائے گا درخشان ہوکر

نہ تجھے پر زنی عرصۂ ایجاد کا شوق — رہ گیا دل شدۂ حکمت یونان ہوکر

اب نئے دور مین کچھہ تجکو خبر ہے کہ نہین

اے کلی تجھہ صبا کا بھی اثر ہے کہ نہین

باغ مین گل بھی نئے آئے عنادل بھی نئے — ولولے دل کے نئے جوش نئے دل بھی نئے

کٹ گئے اگلے شجر مٹ گئین پچھلی روشین — رہ نئے راہ نوردو نئے منازل بھی نئے

فرس باد پیما نئے کاٹھی کس لی — نئے میدان نئے شہ گام مراحل بھی نئے

تارے دن رات نظر آنے لگے چرخ پہ اور — اب ہین کوکب بھی نئے اگلے منازل بھی نئے

شراب

اہل یورپ ہی جنکی غذا مین شراب داخل ہوگئی ہے اس سے دن بدن متنفر ہوتے جاتے ہین ۔ ٹیمپرنس سوسائیٹی کے حکیمانہ تقاریر اور لکچرون نے عوام الناس کو آگاہ کردیا ہے کہ شراب کے استعمال مین بےحد نقصان ہین بلکہ ہر مُنَشّی چیز جسمین الکحل شریک ہو انسانی اجسام کے لئے سُمِّ قاتل ہے ۔ خدا کا شکر ہے کہ مقدس مذہب اسلام نے اپنی غیر فانی علم سے آج سے تیرہ سو برس پہلے شراب کو حرام قرار دیدیا اور شراب خوری کو ایک فعل شیطانی ظاہر کردیا ۔ اور ماکولات اور مشروبات مین ایسی طیب اور پاکیزہ اشیا کو داخل کیا کہ دنیا مین کسی مذہب کو یہ بات نصیب نہین ہوئی ۔ تاریخ بین حضرات جانتے ہین کہ شراب ابتداء آفرینش عالم سے دنیا مین حلال تھی مگر اسلام کے مقدس دین نے شراب اور خون دونونکو ایکدم حرام قرار دیا چنانچہ بعض کتب مقدسہ مین بھی مذہب اسلام کی تعریف مین اسبارہ مین اشارہ کیا گیا ہے ۔ جس سے مفسرین اُن بشارات کو اسلام سے منسوب کرتے ہین ۔ اسلام کے عظیم الشان برکات کا نتیجہ ہے کہ عربستان اور بھی بعض ممالک مین ابتک شراب کا وجود نہین ہے اور وہان کے باشندے کسی مُنَشّی چیز کے استعمال نہ کرنے سے بالکل تندرست اور اپنی عمر طبعی کو حاصل کرتے جاتے ہین ۔ سبحان اللہ ! اسلام کی کیسی پُر اثر تعلیم تھی کہ جب ارشاد باری ہوا کہ شراب حرام ہے تو وہ

مسلمان جو اُس زمانہ مین شراب کی تجارت کرتے تھے اُنھون نے شراب زمین مین دفن کردی مگر اوس کو فروخت کرکے ایک پائی کا نفع بھی لینا اپنے لئے حرام قرار دیدیا۔ افسوس کیسی زمانے کی نیرنگی ہے کہ نسلاً بعد نسلاً ہمارے اباواجداد تو شرابخوری کو بالیقین ایک فعل شیطانی سمجھتے رہے۔ مگر اہل مغرب کے میل جول نے ہماری مدت دراز کی پرہیزگاری کو ایک دم چھین لیا۔ ہائے وہی مسلمان جو شراب کے ایک قطرہ کو نجس خیال کرتے تھے کیسے بیخوفی کے ساتھہ شراب کے کنٹر کے کنٹر ہضم کرتے جاتے ہین۔ مگر کون ہے جو اُن پر حد شرعی جارے کرے۔ اور کون ہے جو مسلمانون کو بتلائے کہ سیندھی جو شراب کی بہن ہے ہمارے مذہب مین حرام ہے آجکل کا فیشن بنا جاتا ہے کہ جو شخص شراب استعمال نہ کرے وہ جنٹلمین نہین کمسن ہونہار بچے جب اپنے والدین یا اپنے عزیزون کو شراب کا استعمال کرتے دیکھہ لیتے ہین تو وہ اوس کو اچھی چیز جان کر چھپ چھپا کر استعمال کرنے لگ جاتے ہین اور رفتہ رفتہ شراب کے عادی بنجاتے ہین اور اپنی موت کی منزل پر قبل از وقت پہونچکر دنیا سے نامراد ناکام چلتے ہوتے ہین۔

طبی تحقیقات سے ثابت ہوچکا ہے کہ میدان جنگ مین بھی شراب کے عادی ہمیشہ شکست پر شکست اُٹھاتے ہین اور شرابخور آدمی جب زخمی ہوتا ہے تو اوس کی زیست کی کم اُمید کیجاتی ہے۔ حکماء یورپ جاپان کی فتحیابی کو شراب سے محفوظ رہنے کی جانب منسوب کرتے ہین۔

دوسری تحقیقات سے یہ ثابت ہوا ہی کہ جسم انسانی مین خون کے سرخ کارپسل جن سے خون کی نصف ترکیب واقع ہوئی ہے چھوٹے چھوٹے خوشنما مناسب اجسام کے ہوتے ہین جو دوران خون کے ساتھ سارے جسم مین گشت لگاتے ہین اور شُش سے اکسیجن کو لیکر جسم کے ہر چھوٹے چھوٹے عضو مین پہونچانے جاتے ہین اِن کارپسل کی زندگی کے لئے شراب اور الکحل سخت مضرت رسان ہی۔ شراب کے استعمال کے ساتھ ہی خداوند تعالیٰ کی اِس چھوٹی مخلوق مین سخت مرض کا دورہ ہوجاتا ہے اور وہ اپنے فرلیضہ کو اچھی طرح انجام دے نہین سکتے اور جسم مین آکسیجن کی کافی تعداد فراہم ہونے کے باعث خون مین ایسیڈ اور زہریلا اثر پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہی ذیابیطس اور پھیپڑون کا ورم اور ورم جگر اور درد پہلو یہ اُسی کے امراض ہین جو ظہور پذیر ہونے لگتے ہین۔ افسوس ہے ہماری حالت پر کہ آجکل ہم دنیا کے قوم کو شرابخواری کے بُرے اثرات مین مبتلا پاتے پر بھی عبرت حاصل نہین کرسکتے۔ شراب کا عادی جب اِن مہلک امراض مین مبتلا ہوتا ہے۔ اور زلیست کی امید نہین دیکھتا تو عملا اپنے کرتوت پر نفرین کرتا ہے اور نادم ہوتا ہے۔ مگر ایسے وقت کا افسوس اُس کو موت سے بچا نہین سکتا اور جب دنیا ہی مین خداوند تعالیٰ کی نافرمانی کا ایسا سخت وبال ہے تو اُس شخص کے لئے جو گناہ کی حالت مین اپنے مالک حقیقی کے حضوری مین حاضر کیا جادے اوسکی ندامت اور شرمساری کی کیا حالت ہوگی! خداوندا! تو اپنے فضل اور رحمت سے ہمارے دنیا ء قوم کو شراب خوری سے محفوظ رکھ اور توفیق نیک عطا فرما! (محمد نعمت خان)

سوز دروں

اٹھیں گے ملت بیضا کو پھر پاسباں کبتک
رہیگا گلشن اسلام میں دور خزاں کبتک

تنزل میں ہی ایوان قیصر ساغر کوثر
مسلمانوں پہ نازک وقت ہی خواب گراں کبتک

دکھا دو پھر جہاں کو ہاشمی شمشیر کے جوہر
بنو گے تختہ مشق جفائے دشمناں کبتک

فلک دشمن۔ زمیں بیزار گلچیں درپے ایذا
گلستاں میں پھر بلبل کا دیکھیں آشیاں کبتک

کبھی تو بیکسوں کا قتل ناحق رنگ لائیگا
بہینگی مومنوں کے سرخ خوں کی ندیاں کبتک

نہیں بچنے کے گرداب فنا کی رو سے بلقانی
یہاں پھولینگی ظلم ناروا کی کھیتیاں کبتک

کبھی تو غیرت حق جوش میں آئیگی اے ناصر
رہینگی یوں شریک حال غم ناکامیاں کبتک

(ناصر علی اٹاوی)

قوت خیال

پروفیسر صاحب موصوف کی دوسری کتاب جو اس مشہور انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے جسکی تھوڑے سے عرصہ میں تیس چالیس ہزار جلدیں فروخت ہو چکیں ہیں کتاب کی خوبی دیکھنے سے معلوم ہو سکتی ہے۔

قیمت چار آنے ۴ر

مینجر تمدن وعصمت دہلی

یورپ مین روحانیت کے کرشمے اور سائنٹیفک تحقیقات

جو عروج کہ روحانیت کو ایشیا مین ہوا وہ کسی دوسرے براعظم مین نہین ہوا کم سے کم اس صورت مین نہین ہوا۔ تاہم اس سے یہ نتیجہ نکال لینا کہ مغربی ممالک مین روحانیت سے لوگ ناآشنا اور نابلد ہین صحیح نہین ہے ایک انگریزی مثل مشہور ہے کہ دنیا مین واقعات کا دور بندھا رہتا ہے اور ہر پھر اُن کا وقوع ہوتا رہتا ہے۔ یہی کیفیت دور ازمنہ کی ہے۔ ہر ملک زمانے کے ایک دور مین سے گزرتا رہتا ہے کوئی دور توہمات کا ہوتا ہے کوئی مذہبیت کا کوئی فلسفے کا اور الحاد کا۔ چنانچہ یورپ مین ازمنہ وسطی کا دور توہمات اور مذہب سے منسوب کیا گیا ہے اور یہی وہ زمانہ تھا جب روحانیت کا یورپ مین کسی نہ کسی شکل مین دور دورہ تھا۔ مذہبی خانقاہون اور کلیسا مین عیسوی راہب مذہبی تعلیم دیتے تھے اور روحانیت کی تلقین کرتے تھے۔ چنانچہ خانقاہ مین رہنے والون کو اکثر خواب مین حضرت عیسے اور حضرت مریم نظر آتے تھے اور اُنکی عقدہ کشائی کرتے تھے اور ایسے ایسے حیرت انگیز کرشمے دکھاتے تھے کہ جن کو معجزہ ہی سمجھنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ اُس زمانے کے عیسوی مذہب کے بڑے بڑے پیرون اور مرشدون کے کرشمے بھی تاریخ اور قصص وحکایات کی کتب مین جابجا پائے جاتے ہین چنانچہ اس قسم کے قصص وحکایات

مارس چینی کی لکھی ہوئی تاریخ شارٹروز بہت مشہور و معروف ہے اس کتاب مین کشف و معجزے کی عجیب عجیب کہانیان درج ہین۔ فرشتون اور خیالی ارواح کے طرح طرح کے قصے نقل کئے ہین۔ مثلاً اخی جارج ایک دن نماز کے وقت بجاے اپنا مذہبی فرض ادا کرنیکے کلیسہ مین ادہر اُدہر گشت لگا رہا تھا کہ جوہین وہ حضرت عیسےٰ کی تصویر کے سامنے سے گذرا تو خودبخود تصویر اوسکی طرف سے پلٹ گئی گویا حضرت عیسےٰ نے اُس سے مُنہ پھیر لیا۔ جس کا اثر اخی جارج پر ایسا ہوا کہ بدن مین رعشہ پڑ گیا اور نزع کی سی حالت طاری ہوگئی۔ اخی جان ڈیلی نے کھانے کی ناشکری کی یعنی جب وہ کھانا کھانے بیٹھا تو کھانا بدمزہ تھا اُس کے منہ سے یہ نکل گیا کہ اُس کھانے کی بجائے تو آدمی مینڈک کے بچے ہی کھائے تو اچھا تھا۔ فوراً اُس کو چارونطرف سے مینڈکون نے آن گھیرا اور اوس کی کوٹھری مین تین مہینے تک مینڈک ہی مینڈک ہوگئے۔ وہ مہینون توبہ کرتا رہا اور طرح طرح سے اپنے جسم کو الحاح و زاری کی غرض سے اذیتین دیتا رہا تب جاکر اُس کا قصور معاف ہوا۔ اسی طرح ایک موقعہ پر مارس لکھتا ہے کہ "جب شارٹروز کی خانقاہ پر مصیبت آنے والی تھی، تو ایک دن ہم نماز و دعا مین مشغول تھے کہ روح القدس اور خدا کا ظہور ہوا۔ جس وقت کہ ہم رکوع مین تھے ایک بادصرصر کی سی آواز سنائی دی اور ہمارے چہرون پر اُس کا کچھ اثر محسوس ہوا تحقیق یہی خدا کا ظہور تھا۔ بعض نے اوس کو اپنی آنکھون سے دیکھا اور بعض نے روحانیت کے ذریعے معلوم کیا۔ مگر یہ معاملہ پوشیدہ کسی پر نہ رہا اور ہم سب کو یہ اطمینان ہوگیا کہ خدا ہم مین اُس وقت موجود تھا"

ان خانقاہون مین اُس زمانے مین عیسوی مذہب کے بزرگان دین کی یادگار نہ صرف انکی قبر سمجھی جاتی تھی بلکہ اُنکے لباس۔ اُنکے بال اُنکے ناخون و ہڈیان وغیرہ بطور آثار متبرکہ کے رکھے جاتے تھے جیسے کہ بُدھ مذہب والے آجتک اپنے بزرگان دین اور خاص بدھ کے آثار کو رکھتے ہین اور اُس پر جو عمارت بنائی جاتی ہے اُس کو دگھمبہ کہتے ہین۔ اکثر صلیب اور حضرت مریم کی مورت کی بھی پرستش ہوتی تھی۔ ان آثار متبرکہ کی زیارت کو لوگ دور دور سے آتے تھے اور حسب حیثیت طرح طرح کے چڑھاوے چڑھاتے تھے اور انکے متعلق طرح طرح کی عجیب وغریب روایات مشہور تھین چنانچہ علاقہ کینٹ کے موضع باک مین ایک حیرت انگیز صلیب تھی۔ اس صلیب کا معجزہ یہ تھا کہ اگر زائرین چڑھاوا اچھا چڑھاتے تھے تو جو مورت حضرت عیسےٰ کی اس پر چڑھی ہوئی تھی وہ خوشنودی ظاہر کرتی تھی مُسکراتی تھی اور سلام کرتی تھی لیکن اگر چڑھاوا اچھا نہوتا تھا تو یہی مورت خفگی کا اظہار کرتی تھی علاقہ سفوک مین ڈورکورٹ کے مقام پر ایک اور اسی قسم کی مورت تھی جس کا معجزہ یہ تھا کہ اس کا دروازہ شب وروز کھلا رہتا تھا اور کسی انسان کی یہ طاقت نہ تھی کہ اُس کے دروازے کو بند کرسکے۔ اس مورت کا حشر افسوسناک ہوا یعنی ایک دن چند بدمعاشون نے ملکر اسے چرالیا اور اسمین جو زر و جواہر تھا اُس پر قبضہ کر باقی کو آگ لگادی۔

علاقہ ورسٹرشائر مین قصبہ ہیلی مین ایک شیشی تھی جس مین خون بھرا ہوا تھا اور یہ خون سینٹ جنورلیس کا فرض کیا جاتا تھا اس شیشی سے بھی بہت سے معجزے سرزد ہوتے تھے۔ اسی طرح حضرت مریم

کی مورت کے متعلق بہت سے معجزے مشہور تھے - چنانچہ ایک مورت کا قصہ
مشہور ہے کہ دریائے ٹیوی کے کنارے حضرت مریم کی مورتی گود مین شیر
خوار بچہ لئے اور ہاتھہ مین ایک جلتی ہوئی شمع لئے کھڑی ہوئی ملی عقیدت
مندون نے فوراً اُسے بعد تعظیم و تکریم کارڈیگن کے کرائسٹ چرچ
مین پہنچا دیا مگر دوسرے دن یہ مورتی جہان ملی تھی وہین خودبخود پہنچ
گئی آخر شش اُسی جگہ اس مورتی کیلئے ایک گرجا کی عمارت تعمیر کیگئی - اس
گرجا مین یہ مورتی نو برس رہی اور اس نو برس کے عرصے مین
وہ جو شمع مورتی کے ہاتھہ مین جل رہی تھی برابر روشن رہی یعہ نہ کم ہوتی
تھی نہ بجھتی تھی مگر بوکسلے کی صلیب کی طرح اس مورتی کی بھی مذہب
عیسوی کے اصلاح کے زمانے مین بُری گت بنی - یعنی چند "سے
عتقادے" ویلز کے باشندون نے اس شمع روشن پر جھپٹا مارا اور قصہ
یون کھلا کہ ایک شمع کی رنگ کے خول مین فنر کے ذریعہ سے ایک بتی
لگادی جاتی تھی جو چوبیس گھنٹے تک روشن رہنے کی قوت رکھتی تھی -
پجاری لوگ جب موقع دیکھتے تھے اندر ہی اندر بتی بدل دیتے تھے اوپر کا
ول اتنا کا اُتنا ہی رہتا تھا اور دیکھنے والون کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ بتی
م ہی نہین ہوتی -

ِ قسم کی مورتیان بھی واسنگھم - اپسوچ - ڈونکاسٹر اور پنہرس مین بھی تھین ان
ب کا قلع قمع ایک ہی وقت مین ہوا - اور یہ وقت مذہبی اصلاح کا
ت تھا یعنی وہ وقت جبکہ پروٹسٹینٹ عیسائیت کی ابتدا ہوئی - سولہوین
سدی نصف سے زیادہ گزر چکی تھی اور ازمنہ وسطی اختتام پر آگئی تھی
ی صدی سے ازمنۂ موجودہ کی ابتدا ہوتی ہے اور یہ دور سائینس کا

دور سمجھا جاتا ہے جبکہ علم کی روشنی نے توہمات باطلہ وخیالات فاسدہ کی ظلمت سے یورپ کی دنیا کو پاک کردیا چنانچہ اسی دورمین جنیوا اور جرمنی سے شروع ہوکر ندرلینڈ مین خونریز لڑائیان لڑنے کے بعد انگلستان مین شاہ ہنری ہشتم کی حمایت مین پرورش پاکر پروٹسٹنٹ مذہب عیسوی نے توہمات قدیمہ کو جو زمانۂ جہالت مین مذہب کے گردپیش جمع ہوکر اسکی اصلی صورت بگاڑ رہا تھا سائنس کی کسوٹی پر کھوٹا جانچ کر پس پشت ڈال دیا۔ اور رفتہ رفتہ سائنس کی ترقی نے یورپ کو اس قدر مادی بنادیا کہ اب اہل یورپ روحانیت کو ایک محض ڈھکوسلہ سمجھتے ہین اور اس کے کرشمون کا تعلق مادیت سے بتاتے ہین چنانچہ مسمر[1] نے قدیم کرامات کے تماشے مادی ذرایع سے کردکھائے اور ہپناٹزم نے روحانیت کے راز سربستہ کو ایک عام بازی گر کے تماشے کی صورت مین طشت ازبام کردیا۔

یورپ والون کو خدا نے کچھہ ایسی فراغت دی ہے کہ وہ کچھہ نہ کچھہ تحقیق کرتے ہی رہتے ہین۔ چنانچہ اگرچہ روحانیت کو یورپ سترھوین صدی سے بھول چکا تھا تاہم انیسوین صدی مین پھر اس کی طرف کچھہ رجحان شروع ہوا اور لوگون نے طرح طرح کے شعبدے دکھانے شروع کئے جو بقول ان شعبدہ گرون کے ارواح کے ذریعے سے کئے جاتے تھے۔

چنانچہ کسی نے یہ اشتہار دیا کہ ہم مرے ہوئے لوگونکی ارواح کو بلا سکتے ہین کسی نے بات چیت تک کرانے کا وعدہ کیا۔ کسی نے ان ارواح سے پیشین گوئیان کرائین۔ کسی نے ان کے ذریعے سے کمرے کی کرسیان غائب

[1] مسمر علم مسمریزم کا بانی۔

کرادین یا ہوا مین معلق شکوا دین کسی نے ہوا مین مردونکی تصویرین کھینچکر دکھا دین
کسی نے مُردون کی شکلین تک دکھا دین غرضیکہ اسطرح کے بہت سے شعبدے دکھائے جاتے رہے - اول اول یہ سلسلہ ۱۸۴۷ء مین ایک شخص مسٹر فاکس اور اُسکی بیوی مسز فاکس کے مکان ہائیڈوسن ولی - نیویارک امریکہ سے شروع ہوا مسٹر فاکس کی لڑکی کیٹ فاکس کو اکثر کواڑ کی کھٹ کھٹ کی آواز سنائی دیتی تھی - مگر جب دروازے پر جاتی تو کوئی آدمی نظر آتا - رفتہ رفتہ سارے گھر کو یہ آواز سنائی دینے لگی مگر کوئی آدمی کبھی نظر نہ آیا پھر ایسا ہوا کہ جب مِس کیٹ کہتی اُسی وقت کھٹکھٹانے کی آواز آنے لگتی - ان لوگون نے یہ مکان چھوڑ دیا اور مِس کیٹ اور اوسکی بہن روچسٹر جا رہے وہان انھون نے اس علم مین اور بھی ترقی کی اور رفتہ رفتہ انھون نے روحون سے ایسا ارتباط پیدا کر لیا کہ اُن سے جو بات چاہتی تھین دریافت کر لیتی تھی - مگر وہ یہ بات چیت کھٹ کھٹ ہی کے ذریعے سے کرتی تھین چنانچہ اگر ایک دفعہ کھٹکا ہوا تو اوس کے معنی تھے "ہان" اگر تین دفعہ ہو تو اوس کے معنی تھے نہین - مثلاً کسی نے پوچھا کہ میرا خاوند بیمار ہے کیا وہ بچ جائے گا ؟ تو اوس کے جواب مین اگر ایک کھٹکا ہوا تو سمجھو بچ جائے گا - تین دفعہ کھٹکا ہوا تو سمجھو مرجائیگا امریکہ سے چلکر انگلستان مین یہ مرض ۱۸۵۲ء مین پہونچا - یہان میزکے پائے اٹھنے کا زور ہوا - انگلستان مین مسز ہیڈن کے ذریعہ یہ وہم پھیلا جو بوسٹن سے آئی تھین اور انگلستان

مین بہت دن تک اپنے کمال دکھاتی رہین اور بہت سے شاگرد لیے پھر چھوڑ گئین۔ ہوتے ہوتے یہ ہوا کہ تماشائیون کو گھنٹون باجون کی آوازین سنائی دیتین حالانکہ کوئی بجانے والا نظر نہ آتا کبھی سوالات کے جوابات لکھے ہوے مل جاتے حالانکہ کوئی لکھنے والا آس پاس بھی نہوتا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ سخت سے سخت گرہ لگا دو وہ خود بخود کھل جاتی کبھی جلتے ہوئے کوئلے لوگ ہاتھ مین لے لیتے۔ کبھی تماشا کرنے والون کا قد اتنا بڑا ہو جاتا کہ چھت سے سر لگ جاتا۔ کبھی یہ ہونے لگا کہ جس طرح ہمارے ہان ماموں الہ بخش عورتون کے سر پر آجاتے ہین اسی طرح عورتین بے ہوش ہو جاتین اور طرح طرح کی پیشین گویان کرتین چنانچہ امریکہ کی رہنے والی ایک عورت مسز پائپر یہی پیشہ کرتی تھی۔ اور ان سب شعبدہ بازون کا قول یہ تھا کہ یہ جو کچھ بھی وہ کرتے ہین ارواح کے ذریعے سے کرتے ہین۔ اور انیسوین صدی کے یورپ اور امریکہ نے انھین شعبدون کا نام روحانیت رکھ چھوڑا تھا۔ سائنس دان حیران تھے کہ یہ معاملہ کیا ہے چنانچہ انھون نے تحقیقات شروع کی جس کا مفصل حال زیادہ تر ان نہایت دلچسپ کتابون مین پایا جاتا ہے۔ جو مسٹر بینیٹ اور فریہ نے انٹرنیشنل سائنٹفک سیریز کے ذیل مین شایع کی ہین۔ اس سلسلہ مین اول ۱۸۴۱ء مین ڈاکٹر بریڈ نے قدم مارا جو مانچسٹر سرجن تھے۔ یون تو الیف اے مسمر کے زمانے سے جو سترھوین صدی کے آخر مین مرا ہے لوگونکی اس طرف توجہ ہوئی تھی اور فن مسمریزم تب ہی جاری ہوا لیکن ۱۸۲۸ء مین مسمر کے شاگرد رشید مارکوئس ڈا پویسے غور۔

نے مسمر کے علم پر اتنی ایزادکی کہ مسمر تو بیمارون کا ہی غشی کے ذریعہ علاج
کرتا تھا مارکوس غشی والون سے کام بھی لے سکتا تہا۔ ڈاکٹر برئیڈ نے اس پر
غور کر کے یہ بات نکالی کہ جب ایک شخص کو عمل کے ذریعہ عالم غشی مین لایا
جاے تو اوس کے حواس بجاے درماندہ اور سست ہو جانے کے نہایت
تیز ہو جاتے ہین اس قدر تیز کہ معمولی حالت مین ممکن نہین۔ یعنی جو دوسرے
ہوش والے آدمی کو نہ سنائی دے وہ اسے سنائی دینے لگتا ہے
اور جو دوسرے کو نہ دکھائی دے وہ اسے دکھائی دینے لگتا ہے۔ اور یہ
بھی معلوم کیا کہ ایسی حالت مین معمول اشارے پر کام کرنے لگتا ہے
چنانچہ ڈاکٹر برئیڈ نے یہ تجربہ کر کے دکھا دیا کہ ایک معمول سے کہا کہ تیرا
منہ بند نہین ہو سکتا چنانچہ کئی آدمیون نے ملکر زور سے اُس کا منہ بند
کرنا چاہا مگر جبڑا کھلا ہی رہا۔ اسی طرح ایک اسکاٹ لینڈ کی رہنے والی ماما
کو جو بیہوش کیا گیا تو وہ عبرانی مین انجیل پڑھنے لگی۔ حالانکہ وہ عبرانی زبان
سے بالکل واقف نہ تھی۔ ڈاکٹر برئیڈ کو حیرت ہوئی جب وہ عورت ہوش
مین آئی تو اُس سے سوالات کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ عورت ایک
پادری کے پاس نوکر تھی جو عبرانی مین انجیل پڑھا کرتا تھا وہ الفاظ
اس عورت کے کان مین پڑتے رہتے تھے لیکن اُن کا دماغ پر اتنا
کافی اثر نہوتا تھا کہ یاد رکھ سکتی۔ لیکن اس غشی کی حالت مین اسکے حواس
اس قدر تیز ہو گئے تھے کہ فوراً وہ الفاظ یاد آ گئے۔ ایسا ہی ایک
قصہ اور لڑکی کا سنا گیا ہے کہ جس کا باپ فوجی کرنیل تھا۔ اس لڑکی
کو تپ محرقہ ہوا اور بہکنے لگی۔ بہکنے مین قران شریف پڑھنے لگی۔ انگلستان
مین ایک لڑکی کا قران شریف پڑھنا جس نے کبھی عربی کا نام بھی

نہ سنا ہو نہایت ہی حیرت کا باعث ہوا۔ تحقیق کئے سے معلوم ہوا کہ اس لڑکی کا باپ مصر کی فوج میں رہا تھا اور مصر ہی میں یہ لڑکی پیدا ہوئی اس پر جو آیا نوکر تھی اس کا میاں قرآن شریف کی تلاوت کیا کرتا تھا چنانچہ وہ الفاظ اس کے کانوں میں پڑتے تھے۔ اب جو بخار کی حدت سے اس کے حواس میں تیزی پیدا ہوئی تو وہ الفاظ یاد میں تازہ ہو گئے ایسا ہی اکثر خواب میں ہوا کرتا ہے کہ بڑے پرانے پرانے سین برسوں کے بعد خواب میں ایسے نظر آتے ہیں کہ جیسے کل کی بات تھی۔ اسکی وجہ یہ ہوتی ہے کہ سوتے وقت دماغ ایسے سکون کی حالت میں ہوتا ہے کہ اس پر اور کوئی اثر اس وقت نہیں پڑتا ہوتا اس لئے کمزور سے کمزور مدت مدید کا نشان بھی تازہ ہو جاتا ہے اور اپنا اثر دکھاتا ہے

ڈاکٹر برینڈ کی تحقیق کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہپناٹزم کا علم ظہور پذیر ہوا چنانچہ فرانس کے عالم ڈاکٹروں نے پیرس کے مشہور ہسپتال سالپیتریر میں ہپناٹزم۔ روحانیت۔ جادو۔ سحر۔ ڈھٹ بندی وغیرہ وغیرہ قسم کی غیر معمولی اور خرق عادت معاملات کی تحقیقات کے لئے ایک کمیٹی بنائی جسمیں بڑے بڑے سائنس دان "بے اعتقادے" اور علم ڈاکٹری کے ماہر جمع کئے۔ دوران تحقیقات میں انھوں نے ہپناٹزم کے عجیب عجیب تماشے دیکھے۔ چنانچہ ایک جگہ لکھا ہے کہ "ہم نے ایک ہپناٹزم کے معمول سے حالت غشی میں کہا کہ جب تو ہوش میں آئیگی تو زید کو نہ دیکھ سکے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا جب وہ ہوش میں آئی تو سامنے زید کھڑا ہوا تھا مگر وہ نہ دیکھ سکی اور الٹا یہ سوال کرنے لگی کہ زید کہاں چلا گیا۔ ہم نے کہا وہ اپنے کمرے گیا اب تم بھی اپنے کمرے جاؤ وہ جانے لگی۔

زید کو ہم نے جس دروازے سے اس عورت کو گذرنا تھا اُس مین عین بیچون بیچ مین کھڑا کردیا تو یہ عورت زید سے اس طرح ٹکرائی کہ گویا اوس کو زید بالکل ہی نظر نہ آتا تھا پھر ہم نے ایک ہیٹ (ٹوپی) اُسے دکھائی اور زید کے سر پر رکھدی۔ یہ دیکھکر عورت حیران تھی کہ یہ کیا ماجرا ہے کہ ہیٹ ہوا مین معلق ہے پھر کہنے لگی کہ شاید تم نے کسی تار کے ذریعہ سے لٹکا رکھی ہوگی اسی طرح ایک اور تجربہ ہوا!۔ ایک عورت سے عالم غشی مین کہا گیا کہ تو عمر ہے۔ جب وہ ہوش مین آئی تو عمر اُس کے سامنے کھڑا تھا وہ عمر کو نہ پہچان سکی اور خود عمر کی سی حرکات کرنے لگی حتیٰ کہ مونچھ پر ہاتھ بھی پھیرتی تھی اور اُسی طرح اکڑ اکڑ کر چلتی تھی گویا کہ بالکل مرد ہے لوگون نے اُس سے اس کا اپنا نام لیکر پوچھا کہ تم فلان عورت کو جانتے ہو۔ تو تحقیر کے لہجے مین کہنے لگی ہان جانتی ہون ایک پاگل سی عورت ہے تم اُسے کیا سمجھتے ہو وہ تو بالکل عقل سے خارج ہے۔

ایک اور تجربے مین مقناطیس نے عجیب تماشے دکھائے۔ ایک عورت سے غشی کے عالم مین کہا گیا کہ ہوش مین آنے پر تو بکر پر حملہ کریگی چنانچہ اُس نے ایسا ہی کیا اور کہنے لگی خدا جانے کیا بات ہے مرا جی چاہتا ہے کہ اس کو مارون پھر ایک مقناطیس اس کے داہنے پاؤن کے پاس رکھا گیا تو وہ فوراً پلٹ گئی اور بکر کو چمٹ گئی اور کہنے لگی خبر نہین کیون میرا جی اس سے لپٹنے کو چاہتا ہے۔

اس قسم کے تجربونکے بعد کمیٹی نے جو دیگر روحانیت وڈھٹ بندی کے شعبدے دیکھے تو اوس کو یقین ہو گیا کہ ہپناٹزم مین جو کچھ بھی

اصلیت ہے وہ مادی ہے اس مین کوئی روحانیت نہین ہے اور لیس کے دعوے دار چونکہ روح سے اپنا تعلق بتاتے ہین اس لئے روحانیت کے جس قدر شعبدے ہین سب مادیت سے تعلق رکھتے ہین اور ارواح سے کام لینا اور تعلق پیدا کرنا سب لغو اور بے بنیاد ہے بہت سے ایسے شعبدہ گرون کی حقیقت عدالت مین کھل چکی تھی اور جس طرح کہ ازمنہ وسطی کے مذہبی شعبدہ گرونکی کارستانی معلوم ہوگئی تھی اسی طرح اس اُنیسوین صدی کے روحانیت کے بہت سے دعویدارون کی بھی قلعی کھل چکی تھی لیکن جو باقی رہگئے تھے اب اُن کا بھی یہ دعوے کہ وہ مادیت سے تعلق ہی نہین رکھتے بلکہ محض روحانیت کے بل پر سب کرشمے دکھاتے ہین غلط ثابت ہوا۔

اسی سلسلہ مین ایک اور چیز ہے جس کو انگریزی مین "خیالات کا پڑھنا" کہتے ہین جس کے معنی ہین دوسرے کے دل کا حال معلوم کر لینا اس فن کے بھی بڑے بڑے ماہر گزرے ہین اور انھین سے اکثر اپنے آپ کو روحانیت کا معتقد بتاتے رہے اس کے متعلق سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا سوائے ارواح کے واسطہ کے کوئی اور ایسا ذریعہ ہے جس سے ایک دماغ دوسرے دماغ کا حال معلوم کر سکے یا اپنا خیال دوسرے کے دماغ مین بغیر آواز و اشارون کے واسطے کے پہونچا سکے۔ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ عام طور پر ایسا کوئی مادی وسیلہ نہین ہے ایک شخص کا خیال دوسرے شخص کے دماغ مین صرف دو ہی طریقون سے پہونچایا جاتا ہے۔ فرض کیجئے کہ الف کے دماغ مین ایک خیال پیدا ہوا۔

خیال پیدا ہونے کی صورت دماغ مین یون ظاہر ہوگی
کہ دماغ کی چھوٹی چھوٹی کوٹھریون یا خانون مین ایک خاص
حرکت پیدا ہوجائیگی جس سے ایک رو پیدا ہوگی
جو اعصاب کے ذریعہ سے اُنکے اختتام تک پہونچکر خاص خاص پٹھون
مین ایک عصبی تحرک پیدا کردیتی ہے یہ تحرک ہوا کی آوازی لہرون
(امواج صوت) مین منتقل ہوکر جبکہ اعصابی اختتام سے جاملتا ہے
اور اس راہ سے جبکہ دماغ کی کوٹھریون تک جاپہونچتا ہے
اور وہان وہی حرکت پیدا کرتا ہے جو الف کے دماغ کی کوٹھریون
سے جاری ہوئی تھی جن سے وہی خیال جو الف کے دماغ مین پیدا
ہوا تھا۔ ب کے دماغ مین پیدا ہوجاتا ہے۔ یہ صورت سماعی
ہوئی یعنی ایک کا خیال دوسرے کے دماغ مین آواز کی معرفت
کان کے ذریعہ سے پہنچا دوسری صورت عینی ہے اس مین عصبی
تحرک بجائے آوازی لہرون اور ہوا کی وساطت کے روشنی
کی لہرون اور ایتھر کی وساطت سے منتقل ہوکر وہی اثر کرتا ہے۔
جو یہ امواج صوت کرتی ہین۔ تیسری صورت مس کرنے کی ہے۔
اس مین کسی وساطت کی ضرورت ہی نہین الف کا اعصابی اختتام
ب کے اعصابی اختتام سے جہان چھوا گیا اور ب پر اثر ہوا۔ اب رہی
قوت شامہ و ذائقہ ان کا انسان اس معاملہ مین کام ہی نہین لیتا ہان بعض
جانور انکے ذریعہ سے تبادلہ خیالات کرتے ہین۔ بات فقط اتنی
ہے کہ حواس کی قوتون کو اس قدر بڑھا سکتے ہین کہ اُن سے حیرت
انگیز کام لئے جاسکتے ہین۔ دیکھنے کی قوت کو اس قدر ترقی دی جاسکتی ہے

کہ بشرے سے ایسی ایسی باتین دکھائی دے جاسکتی ہین جو معمولی
نگاہ والا نہین دیکھہ سکتا۔ اسکی مثال سر جان لبک نے ایک کتے
کے متعلق دی ہے۔ اس کتے کا یہ قصہ بیان کیا گیا ہے کہ بہت سے
کاغذ کے پُرزون پر اعداد لکھہ کر ہر پُرزے پر ایک عدد ڈالدیے
جاتے تھے اور اُس سے کہا جاتا تھا کہ فلان رقم جمع کرکے اس کا
جواب نکالو۔ تو کتا علیحدہ علیحدہ اُس رقم کے اعداد کو جمع
کرتا اور جو جواب ہوتا وہ بھی پُرزے برابر ملا کر نکال دیتا۔ یورپ
کے ملحدون نے اس کتے کو کسی روحانیت یا ولایت کی شان مین
نہ دیکھا صرف اُس کی قوت باصرہ کی داد دی۔ اصل بات یہ تھی کہ کتا
اپنے آقا کے بشرے کو دیکھتا تھا اور اس سے یہ معلوم کر
لیتا تھا کہ کونسا نمبر یا عدد اُٹھانا چاہیئے اور اس طرح
وہ یہ کرامات دکھا سکتا تھا۔ جس طرح قوت باصرہ دوسرے کے دل
کا حال معلوم کرنے مین اُس کے بشرے کے دیکھنے سے امداد دیتی
ہے اسی طرح اگر قوت لامسہ کو ترقی دیجاے تو اُس مین یہ بات
پیدا ہوسکتی ہے کہ اُس اعصابی تحرک کو جو دماغ مین
خیال پیدا ہونے کا نتیجہ ہوتا ہے اعصابی افتتام کے چھونے
سے معلوم کرسکے اور اُن کو پڑھ سکے۔ یورپ کا اس فن مین
سب سے بڑا ماہر مسٹر کمبر لینڈ اس سے زیادہ نہین کرسکتا
کہ کسی آدمی کو سامنے بٹھا کر اس کی طرف دیکھکر اس کا ہاتھہ
ہاتھہ مین لیکر اس کے دل کا خیال بتا سکے۔ یعنی یہ اُس
سے بھی نہین ہوسکتا کہ نہ معمول کی طرف دیکھے نہ اس کو چھوے اور

اس کے دل کا خیال بتا دے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس فن کیلئے قوت باصرہ اور قوت لامسہ کی سخت ضرورت ہے اور اس کا بہت کچھ دارومدار ان قوتون کے نشوونما پر ہے۔ مسٹر کمبرلینڈ ہرگز کسی خرق عادت معجزے یا روحانیت کا حوالہ نہین دیتا وہ اپنے فن کو محض مادیت پر مبنی کرتا ہے اس سے ظاہر ہے کہ روحانیت کے دعویدار مادیت سے فائدہ اٹھاتے ہین اور روحانیت کا نام پیش کر دیتے ہین تاکہ اس سے انکی عظمت اور تقدس مین اضافہ ہو اور توہم پرست دنیا اُن کو خدا رسیدہ مخلوق مین شمار کرے۔

روحانیت کی تحقیقات کے سلسلے مین امریکہ مین ۱۸۸۴ء مین ایک سائی برٹ کمیشن قایم ہوا جس کی صورت یہ تھی کہ مسٹر سائی برٹ روحانیت کے بڑے دلدادہ تھے مرتے وقت ایک زر کثیر روحانیت کی تحقیق کے لئے وقف کر گئے چنانچہ فلیڈلیفا کی یونیورسٹی نے دس چیدہ پروفیسران و ماہران سائنس کی ایک کمیٹی تحقیقات کے لئے قایم کی جسمین اکثر اصحاب ایسے تھے جو روحانیت کی طرف بہت کچھ رجحان رکھتے تھے۔ چنانچہ پریزیڈنٹ ڈاکٹر فرنیس بہت حد تک روحانیت کے قائل تھے اس کمیشن نے کئی سال تک تحقیقات کی اور ڈاکٹر سلیڈ جیسے فن روحانیت کے ماہر کی شہادت قلمبند کی لیکن اس کمیشن نے آخرش یہی فیصلہ کیا۔ کہ یہ سب بالکل ڈھکوسلہ ہے اور محض پیٹ کا دھندا ہے مذکورہ بالا دو کمیشنوں کے علاوہ بھی بہت سے لوگون نے امریکہ اور یورپ مین روحانیت کی تحقیق کی اور اس وقت بھی بہت سے لوگ اس فن کے معتقد ہین لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس سے اُنکے مذہب پر کچھ اثر نہین پڑا

نہ اس سے کوئی نیا مذہب جاری ہوا۔ فرانس مین ایلن کارڈک نے اس قسم کا سلسلہ شروع کیا تھا مگر انگلستان اور امریکہ مین لوگون کے مذہبی اعتقاد جو تھے وہی رہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہی کہ وہ روحانیت کا کسی مذہبی خیال سے مطالعہ نہین کرتے بلکہ محض ایک عجوبہ سمجھکر روحانیت کی تلاش کرتے ہین اور اسے بھی ایک وقت گذارنے کا شغل سمجھتے رکھا ہے۔

مشتاق احمد زاہدی۔

اثبات الوجود

حبیبؓ ابن مظاہر

آب زر سے جسے لکھین وہ بیان کس کا ہے — سائبان جس کا فلک ہو وہ مکان کس کا ہے
نور عرفان کی طرح وصف عیان کس کا ہے — مدح گو کس کا ہے دل مرتبہ دان کس کا ہے

مہبط نور خدا باطن وظاہر کس کا
نام نامی ہے حبیب ابن مظاہر کس کا

مصدر معرفت و منبع عرفان ہے حبیبؓ — آبرو دین کی ہے سرچشمہ ایمان حبیب
قاری و حافظ و معنی رس قران ہے حبیبؓ — اشجع النّاس ہے فخر عربستان حبیب

اہل دل سارے اسی شمع کے پروانے ہین
کارنامے اسی جرار کے افسانے ہین

ان کو ہر فعل سے مقصود جو تھی حق طلبی — دل نہ تھا سینہ مین آئینہ تھا گویا جلبی
کیا بھلی لگتی تھی قامت پہ قبائے عربی — صاف چہرہ سے عیان ہوتی ہے عالی نسبی

کب تھا عالم مین کوئی حق کا مظاہر ایسا
باطن اس طرح کا شفاف تو ظاہر ایسا

عہد طفلی سے بنایا تھا انہین حق نے سعید — ان کے اخلاق اسی وقت سے تھے لایق دید
جتنی خوبی تھی ہوئی آکے جوانی مین مزید — ہوئی پیری یہ مبارک کہ ہوئے آپ شہید

رشتہ محکم ہوا خالق کے ولی سے ان کا
مل گیا خون حسین ابن علی سے ان کا

سجدہ و حصر ہین اس شیر دلاور کے صفات — غازی کا ہے سرمایہ یمن و برکات
خاک پا انکی بنے کوئی تو ہو جائے نجات — مین فدا تجھپہ حبیب ابن مظاہر کیا بات

مر کے بھی الفت شبیر تھی آب و گل مین
لاکھ باری ہون تصدق یہ ہوس تھی دل مین

عمر ستر سے سوا ضعف سے قامت لرزان — جھریان منہ پہ فزون شان بڑھاپے کی عیان
قد خم گشتہ مین رعشہ سے نہ تھی تاب و توان — دفعتہ ہو گئے دسوین کو محرم کی جوان
آ گئی سب وہی پھرتی کہ جو تھی بچپن مین
تن کے نعرہ جو کیا تنگ زرہ تھی تن مین

تیکھی نظرون سے جو دیکھا سوئے افواج زبون — کھنچ گئے سارے رگ و پے بڑھا جسم مین خون
دل ہوا کوہ گران بازہی صبر و سکون — طاقت بھرے ہوئے شانو نکی ہوئے دو فزون
سرخ آنکھیں تو شکن غیظ سے تھی ابرو مین
آ گیا تو لیتے ہی تیغ کے کس بازو مین

یا تو تھے سن کی درازی سے ضعیف و زار — زرد رنگت تھی خزان دیدہ ہون جیسے اشجار
اب جو دسوین کو محرم کی نظر کی اک بار — رنگ کچھ اور ہوا بھر گئے دونون رخسار
جوش جرأت مین رگین خون سے بھر آئی تھین
مچھلیان بازو نکی صاف ابھر آئی تھین

کج عمامے کے وہ پیچ آور وہ جبین روشن — نوجوانو نکی طرح حسن تین جتنہ بدن
سرخی رنگ عبا ساق سے نیچا دامن — سر آنکھو نمین بھری غیظ و غضب مین چتون
تسمے نعلین کے باندھے تھے جری کس کس کر
جب بڑھے پاؤن تو سر کاٹ لئے نو دس کے

(شاد عظیم آبادی)

صدائے بیوہ

قدسی منزلت جناب قبلہ گاہی صاحب

قربانت شوم -

اب جبکہ میرا وقت بالکل قریب ہے - اور مین اس دنیا اور اوس کے بھلائیون، برائیون، خوش نصیبیون بدبختیون، کو الوداع اور موت کو خیر مقدم کہنے والی ہون - ایک ایسی یادگار چھوڑنا چاہتی ہون جو آنے والی نسلون کے والدین کے لئے عبرت خیز سبق اور اونکی عزیز اولاد کے لئے نصیحت آمیز واعظ ہو - (کاش وہ اس سے نصیحت اندوز ہون) -

آبا جان - آپ اس دنیا ہری بھری دنیا مین مدتون رہین رہکر بسین مجھسی ..... بدنصیب بٹیان ہون گی، ہوہو کر رہیگی، رہ رہ کر مرینگی مجھے دنیا اور اوس کے دلچسپیون کو دیکھنے کی اب مطلق تمنا و آرزو باقی نہین رہی دنیا دیکھہ لی بہت کچھہ دیکھہ لی اب اس دنیا سے جس قدر جلدی جاون اوسی قدر میرے لئے بہتر ہے -

مجھے آپ سے نسبت ابوبیت دیتے ہوئے بے انتہا شرم دامن گیر ہوتی ہے - یہ کوئی طعن نہین واقعی امر ہے اسی لئے کہ مین جس فسق و فجور معصیت گناہون کا شکار رہوئی اوس کا جب کبھی خیال آتا ہے - تو بیحد خوف ہوتا ہے - میرا جسم لرزتا ہے مجھپر سکتہ کی سی کیفیت ہوتی ہے - اور رہ رہ کر افسوس ہوتا ہے کہ ہاے مین دین کی

رہی نہ دنیا کی - اس دنیا سے کہ جہان سبکو ایکدن آگے پیچھے جانا ضرور ہے مین کیا خاک صورت لیکر جاؤن - جاؤن بھی تو کس بھروسے پر - شاید میری قسمت مین یہی بدا تھا - میرے اعمال کا یہی نتیجہ تھا - کہ سرخ رو آؤن - سیاہ رو جاؤن - معصوم آؤن بدکار کہلاؤن -

مین جانتی ہون مجھے کامل یقین ہے - کہ میرے افعال - میرے اعمال میرے کارنامے ایسے نہین کہ عصمت مآب خاتونین سنین اور نہ کانپ جائین عفت کوش نازنینین دیکھین اور نہ تھرائین انھین حق ہے کہ مجھپر لعنت و ملامت کے تیر برسائین - لیکن وہ انصاف سے دیکھین کہ مین اس مین کس حد تک قابل مواخذہ ہون ؟ چہ جائیکہ آپ تو میرے ایجاد عالم کے باعث ہین اس لئے میرے وجود سے آپکو نہایت دردانگیز رقت خیز صدمات کی برداشت کرنی پڑی - کیونکہ آپکے پارسا خاندان کے دامن عصمت پر رسوائی - بے حیائی کا دھبہ آیا -

آپکے نورانی ماتھے پر کلنگ کا ٹیکہ لگا - آپ کے بے داغ نیک روپہ پر حرف گیری کی گئی - آہ آپکے پیمانہ تمنا مین زہر ہلاہل ملانے والی - آپکے بزم نشاط کا ساغر توڑنے والی - آپکے چمنستان عشرت کی ہستی برباد کرنے والی - آپکے ولولہ انگیز - مسرت خیز - خوشیون کو زہریلا بنانے والی - آپکو ترقی عرش سے قعر مذلت مین گرانے والی آپکے دولت کو افلاس سے بدلنے والی - مین ہون ہان ہان مین ہون دوسرا کوئی نہین - مجھی سزا دیجئے - زندہ درگور کیجئے -

آپکو میری وجہ سے محفل میرے وجہ سے دنیا کے معاشرتی جلسون سے بھی باز رہنا پڑا اس لئے کہ آپ اون جلسون مین کس طرح شرکت حاصل

فرماتے جو کہ آپکی مسرتون کو بڑہانے والے۔ آپ کو راحت و آرام پہونچانے والے تھے کیونکہ آپ کو اون الفاظ کے برداشت کا یارہ نہ تھا جو طعنہ دینے والون فضیحتی کرنے والون کی زبانون سے نکلکر آپکے دل مجروح پر نمک بر جراحت ہوتے ہین!

ابا جان۔ منصف مزاج ابا جان۔ غور کیجئے۔ انصاف شرط ہے۔ یکطرفہ فیصلہ نہ کرنا۔ تالی ایک ہاتہہ سے نہین بجتی۔ اگر آپ نہونے تو مین نہوتی۔ جو مین نہوتی۔ تو یہ سب کچہہ نہوتا۔

بتائیے للہ بتائیے۔ کہ مدت کے گرسنہ کے سامنے لذیذ سے لذیذ کھانون کا دسترخوان بچھا ہوا ہے وہ نہایت ذوق وشوق سے ایک لقمہ لے چکا ہے۔ دوسرے کی نوبت ہی آئی نہین کہ دسترخوان بڑھا دیا گیا۔ ایک پیاسا کہ شدت پیاس کی وجہ ہونٹو نپر جان ہے اور وہ پانی کے لئے ہر طرف پریشان پھر رہا ہے۔ کہ کہین ایک کٹورا پانی ملے۔ وہ ایک گھونٹ پی چکا ہے جسکی تشنگی ہل من مزید کی آوازین لگا رہی ہے۔ دوسرا گھونٹ نہایت بے تابی کے ساتھہ پینا چاہتا ہے کہ پیالہ ہاتھہ سے گر پڑا۔ ہاے اوس کے شدت پیاس کا کیا عالم ہوگا؟ بعینہ میری بھی یہی حالت تھی ہاے میری وہ شادی جس کو آپ شادی فرماتے ہین۔ میرے حق مین حقیقی معنون مین بربادی کا باعث ہوئی۔ مہینہ بھی نہوا تھا کہ میرے ازلی ساتھی کو پیغام اجل پہونچا۔ وہ اوس کی موت نہ تھی۔ بلکہ میری موت تھی۔ وہ موت آنے سے مرگیا۔ لیکن مین بے موت کے مرگئی۔ اب کون ہے جو میرے ساتھہ ہمدردی کرتا۔ میرے زخمی شکستہ دل پر

مرہم رکھتا۔ جس طرف دیکھتی تھی۔ بجز یاس و حسرت کے کچھہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ ٹھنڈے دل سے کہنا۔ تنہا بحالہ زمانہ۔ فراق کی طول طویل وحشت ناک۔ اندہیری۔ راتین کس کرب کس بیچینی کس مصیبت۔ کس سختیون مین کٹی ہونگی ؟!!

مین اپنے ساتھہ والیونکو دیکھتی تھی گھنٹون سوچتی! ورغور کرتی جو میری ہی ہمسن۔ آخر مجھہ مین اونمین فرق ہی کس چیز کا تہا۔

وہی ہاتھہ۔ وہی پیر، وہی مُنہ۔ وہی بال، وہی زیور، وہی لباس، وہی گفتگو، وہی چال، وہی حسن وہی انداز۔ وہی خواہش، وہی جذبات پھر بہی میرے سمجھہ مین نھین آیا کہ وہ شادان خندان، اور مین مغموم۔ محزون، یہ کیا فرق۔

سوچتے۔ سوچتے اس نتیجہ پر پہونچی کہ ہاے اونکے سر و نپر تاج شوہری رکھا ہوا ہے۔ میرا تاج جاتا رہا مردونکے شمع حسن کا حاضر باش پروانہ انپر فدائیت کا راگ آلاپ رہا ہے اور میرا پروانہ جل گیا آجڑ گیا۔ تو دہ خاک ہوگیا۔ اس کا صدمہ اس قدر روح فرسا جان لیوا ہوا کہ جسکے صبر کی برداشت جس کے ضبط کی تاب مجھ مین نرہی اور بے اختیار میری آنکھون سے آنسو روان ہوگئے اوراسی رونے مین بار بار کنکھیون سے آپکی جانب دیکھہ لیتی تھی اور خیال ہوتا تھا کہ آپ بھی از سر نو تاج سنہائینگے، مرے شمع حسن کو جو بجھہ گیا ہے روشن فرمائینگے لیکن افسوس کہ مجھے جس قدر امید تھی آپکی جانب سے اوسی قدر یاس ہوتی چلی دینا افسوس وسیع۔ دنیا مین میرا کون باقی رہا جس کو میری

احتیاج سے ہمدردی ہو۔ حالانکہ مین نے آپ کو اپنا شکستہ۔ زخمی دل دکھایا۔ اور اوس کا علاج چاہا۔ لیکن آپ نے سکوت اختیار کیا اور آپ نے سکوت محض اسلئے گوارا کیا کہ میری یہ بھی درخواست آپکی عزت وقعت، شان، کے شایان نہ تھی حالانکہ میری یہ جائز التجا کوئی نا جائز نہ تھی جسکو خدا اور اوس کے رسول تک نے جائز رکھا۔ اُس کے طلب کرنے کی اجازت عطا کی ہے۔

لیکن حقوق کے غاصب سنگدل، انصاف کے گلے پر الٹی چھُری پھیرنے والے۔ ظالم، بے رحم، کٹر، کیون متاثر ہونے لگے...... کسیکی جان جاتی ہے! بلا سے۔ ہمین تو اپنے کام سے کام ہے۔ مین بھی تو آخر انسان ہون۔ دل رکھتی ہون، رگ رگ مین بہی خون دوڑتا ہے، جذبات مجہی بھی تو اُبھارتے ہین میرے منہ مین بہی زبان ہے صبر کہان تک، ضبط کی بھی انتہا ہے۔

"حد بھی کوئی سِتم کی آخر بشر ہین ہم بھی کب تک سہا کرینگے ہر شئی کی انتہا ہے"

ابا جان۔ مساوات کے فدائی۔ ابا جان۔ آپ ہی بتائیے۔ یہی انصاف ہے۔ یہی مساوات ہے۔ خود تو کھائین دوسرونکو نہ کھلائین آپ اچھے سے اچھے کپڑے پہنین دوسرونکو نہ پہنائین۔ ہم کیونکر اندازہ کرین کہ آپ کے دل مین رحم۔ نیکی، انسانیت، ہمدردی، کا مادہ ہے آپ کس صورت پر آزادی کے خواستگار ہین جبکہ اپنی مان۔ بہنون۔ بیٹون۔ بی بیون، کو غلامی سے آزادی نہین دے سکتے، وہ کیا انصاف کرینگے جو خود منصف نہین، ہم کمزور ذات ہین، ناقارغا

مین طوطی کی آواز ،، کون سنتا ہے - یہ کیسی منطق ہے - یہ کیسا انوکھا قانون ہے - کہ جس شخص کی بیوی مرجائے تو جلتی دفعہ شادیان کرلے جائز ، اگر اتفاق سے ہمارا پہلا شوہر مرجائے تو ہم ہمیشہ بیوگی کا تلخ ، کٹھن ، زمانہ کاٹنے پر مجبور کئے جائین ، جن لوگون کے دلون مین جیتا جاگتا دل ہے وہ اوس پر ہاتھ رکھکر بتائین تو سہی کہ جب تمہاری پہلی بی بی فوت ہوجاتی ہے تو ہماری طرح تنہا - گوشہ نشینی کیون نہین اختیار کرتے ؟ عیش وعشرت سے نفرت کرنے لگتے ؟ ہان اسلئے کہ تم اپنے لئے اس کی ضرورت نہین سمجھتے عیش وتنعم مین مشغول رہتے ہو ، اور ہمین مصیبتون مین چھوڑ دیتے ہو ! کیا یہی تمہارا انصاف ہے جس کے تم مدعی نہین ؟ !!

پھر یہ ستم نہین تو کیا ہے کہ ،، درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ باز میگوئی کہ دامن ترمکن ہوشیار باش ،، کس طرح ہوسکے گا ، مین اس دریا مین ڈوب گئی تختہ سے جدا ہوگئی ، شرابور ہوگئی ، اب ممکن نہین کہ آفتاب کی تیز شعاعین میرے بھیگے دامن کو سکھائین ! کیونکہ ان مین سکھانے کی قابلیت ہی نہین رہی -

ابا جان ، میرے پیارے ابا جان - اطاعتہ گذار ، فرمانبردار ، احکامات پر تیلی صفت پھرنے والی - بدنصیب ، بیکس ، لاچار بیٹی مد ول حکمی کو گناہ عظیم ،، نافرمانی کو فرمان موت ، سمجھنے والی کو کیا اس کا بھی کوئی حق نہین کہ وہ یہ پوچھے ؟ کہ آخر یہ سب ظلم وزیادتی جبر وتشدد ، کس لئے ؟ کیا حقوق پدری اسکی بھی اجازت نہین دیتے مجھ پر کھڑے ہوکر عصمت وپارسائی کا موثر الفاظ مین وعظ کہنے والے

کرسی عدالت پر بیٹھکر حقوق و مساوات کا فیصلہ کرنے والے منصف۔ مرض لاعلاج کی تشخیص کرنے والے ۔ نباض طبیب۔ دنیا سے گوشہ نشینی اختیار کرنے اور اُس کے دلفریبیوں پر نہ فریفتہ ہونے کی تلقین کرنے والے ۔ زاہد۔ دُنیا مین حق و راستی کے پھیلانے والے ۔ راست باز۔ مدعی ۔ مظلوم کو ظالم کے ظلم سے رہائی دلانے والے ۔ حاکم، اب مین تم سے ہان ہان تم سے پوچھتی ہون ؟ کیا تمہارے وعظ و تلقین کا یہی مدعا تھا ؟ کیا تمہارے راستی، انصاف، کا یہی نتیجہ ہے ؟ کہ ایک کمزور، معصوم ،مظلوم ،مرحوم ،فرقہ پٹ رہا ہے۔ مر رہا ہے ۔ اور اہل دانش، بینش ،کھڑے ہوے اُوسکی حالت زار کا تماشہ دیکھہ رہے ہین وہ یہان کیون چپ ہین، ہمدردی خیر خواہی ،کہان گئی ۔ کہ کسیکے حقوق غصب ہوتے ہوئے دیکھکر خواہ نخواہ اپنا فیصلہ پیش کیا کرتے تھے۔ اور اُنھین قانونی شکنجون مین کستے تھے ۔ کیا دصرف دکھاوا ہی دکھاوا تھا ؟ کیا دنیا اسی سے عبارت ہے کہ ظالم پیٹنے ۔مظلوم رونے نہ پائے ۔!!

مبصر ہو چشم بینا رکھتے ہو تو جاؤ کبھی گور غریبان کی سیر کرو دیکھو کہ اوسکی ٹوٹی پھوٹی شکستہ قبرین اور اُن مین کی وہ بوسیدہ ہڈیان ۔ جو خاک مین مل چکی ہونگی ،لب گور سے تمہین ایسی پُردرد داستان سُنائینگی کہ وہ ہمیشہ پر استمرار اُتم پر بھروسہ کرنے والی تمہارے محبت کا دم بھرنے والی ،تمہارے احکامات کو بسر و چشم تعمیل کرنے والی ثابت ہونگی ۔لیکن افسوس کہ اُس کے عوض تم نے اوُنہین کیا دیا ؟۔

سرکش، مغرور، ظالم، جو فرش مخمل پر چلنے کو عار سمجھتے تھے، جن کے عالیشان سر بفلک محل مین راتدن نقارہ و نوبت ٹھنٹے تھے بتائین کہ وہ غرور، تکبر، سرکشی، کہان گئی، آخر یہ کے دن کے لئے تھا۔ اور آج چپ کیون پڑے ہین، حکومت کا کس بل کہان گیا، جو ایک عالم کو اپنا تابع فرمان بنالیا تھا۔ للٰلہ اُٹھو، اٹھو، ایک حاجت مند، جائز حق کی طلب کرنے والی بیکس، مجبور، معذور لڑکی تم سے درخواست کرتی ہے۔ کہ اوس کے قسمت کا فیصلہ کردیا اوس کے جائز دعوے کی ڈگری دلاؤ اوس کے یک طرفہ فیصلہ کی اپیل سنو، ہین، جواب کیون نہین دیتے۔ ہان شاید تمہاری مغرورانہ طبیعت اس کو جائز نہین رکھتی کہ سائلہ کا سوال معرض قبول مین آئے، اچھا تو یہان بھی میری شنوائی نہین! لوجاتی ہون،

سوؤ، سوؤ، میٹھی نیند، سوؤ، تمہارے خواب شیرین کا دامن قیامت کے دامن سے بندھا ہوا ہے۔ تمہاری بیداری کا راز یوم نشور پر منحصر ہے!۔

آبا جان میرے اچھے اباجان۔ آپ دنیا مین شاد، بامراد، رہین، آپکی مظلوم دکھی بیٹی کی رام کہانی جو آپکے عیش کو تلخ کر رہی ہے قریب الختم ہے ہمیشہ کے لئے قریب الختم ہے، آپکی خلش کو رفع کردے گی جو آپکے دلمین باربار خلش پیدا کرتی ہے، یہ کانٹا تلوؤن سے نکلے گا، خلش جائیگی طبیعت چین پائیگی! زندگی میری نامراد، پر حسرت، پرارمان، زندگی جسمین نے بہت کچھہ صبرواستقلال

سے کام لیا، میرے دامن کو جذبات کھینچ رہے ہین، ہوا و ہوس کے جن کا مجھپر قبضہ ہو رہا ہے، جذبات، و خواہشات کا دریا موجین لے رہا ہے، میری حیات دوروزہ کی ناؤ گرداب معصیت مین تھپیڑے کھا رہی ہے۔ عجب نہین کہ مین ہمیشہ کو اوس مین ڈوب جاؤن، لیکن پھر بھی کنارۂ عافیت کی تمنا ہے، یہ تمنا مجھہ اکیلی سے پوری ہونے کی نہین تاوقتیکہ آپکی تائید میرے بیڑے کو پار لگانے مین نہو (کاش آپکی سعی میرے کامیاب بنانے مین ہوتی تو مجھکو آج اس طرح شکایت کرنے کی نوبت نہ آتی) خواہشات، جذبات، بری طرح میرا بازو پکڑے ہوئے ہین اور مجھے کشان کشان، اپنے طرف لیے جا رہے ہین لیکن میرا جانا میرا اختیاری فعل نہ تھا، اسی کشمکش مین پلٹ کر نگاہ کرتی ہون تو کچھہ روشنی، موہوم سی روشنی، دکھائی دیتی تھی اور طبیعت اوسکی طرف کھنچتی تھی، اور کوشش کرتی تھی کہ اوس سے قریب ہو جاؤن، مگر پھر وہ یکایک غائب، گویا غفلت کا پردہ تھا جو آنکھون سے ہٹا دیا گیا تھا یا ایک خواب تھا جس سے بیدار کیگئی، یا خیالی نظارہ تھا آنکھون کو فریب دینے والا۔ اور مین پھر انھین مشفقون مین گھری ہوئی جو طرح طرح کے سبز باغ دکھا کر میری مسرتون کو بڑھا رہے تھے۔ اور میرے جذبات کو ابھار رہے تھے، جاتے جاتے۔ اونھون نے مجھے لیجا کر ایک ایسے کنوئین پر کھڑا کر دیا جس کو دیکھکر میرے دل مین ایک بیخودانہ ولولہ اُٹھا، اوس کا پانی ایسا نظر فریب دلچسپ خوشگوار، شیرین تھا اور جسمین سے میٹھی میٹھی راگنیان نکل رہی تھین کہ میرے برحسرت دل پر سحر کی تاثیر پیدا کر دی اور مین مجبور

ہوگئی، اب مجھ مین برداشت کا بار نہ رہا دامن استقلال میرے ہاتھ سے
چھوٹ گیا، اور مین مجبورانہ۔ آنکھین بند کئے یا بغیر سوچے سمجھے موازنہ کئے
اندھا دھند سر کے بل گر پڑی - اور جب آنکھین کھلین تو معلوم ہوا
کہ آہ! زندگی! زندگی! جس کی ایک عالم کو تلاش ہے، ایک
خواب گران ایک نشہ خمار دھوکہ دینے والا۔ اوس کی دلچسپیان
نظر فریب۔ مکروہ۔ آرزو و تمناؤن کا مشتاق فریب خوردہ، جذبات
و خواہشات کا تابع منفعل شرمندہ، کامیابی، شادمانی، کا کلب
آنکھونکا اندھا، بس اب نہ پوچھیے میرے افعال، میرے اعمال، میرے
کارنامے، ایک ایک کر کے میری آنکھون کے سامنے موجود ہین اور
مجھے خوفناک صورتین بنا بنا کر ڈرا رہے ہین۔ موت کا فرشتہ تاک
لگائے، منتظر کھڑا ہے۔ حکم کی دیر کہ روح قبض کرے۔
لیجئے حکم قضا اب پہونچ چکا۔ آہ فرشتہ موت نے اپنا عمل کرنے کے
لئے دست دراز۔ آہ! آہ۔

ابا جان۔ میرے آخری وقت کے ابا جان، میرے یہ آخری
الفاظ جو شکستہ دل کی سچی صدائین ہین، فلک ہستی کے جیتے
جاگتے چند روزہ درخشندہ ستارون تک پہونچا دیجئے کہ ایسے
خوفناک، برباد کن معصیت سے اپنے عزیز اولاد کو باز رکھنا چاہتے ہو تو
ٹھہر ٹھہر، اے موت کے فرشتے، ٹھہر، تھوڑی دیر کیلئے ٹھہر مین خود چلنے پر
آمادہ پابرکاب ہون لیکن دو باتین ہان دو باتین، دنیا، اہل دنیا، اور اوس
کے حصہ لینے والون سے کر لون، آہ مجھ پر رحم کر رحم مجھے کہ لینے
دے کہہ لینے دے۔ ادر اقلیم ہستی کی بستی پر نازان، او مٹی اور

سوسایٹی کی اندرونی حالت

سلسلے کے لئے اگست کا پرچہ ملاحظہ ہو۔

(۱) محترمہ مسز خلیقی صاحبہ کا یہ مضمون جسکی پہلی قسط اگست کے پرچہ مین شایع ہوئی تھی افسوس ہے کہ مسودہ کے نہ ملنے سے سلسل شایع نہو سکا آج حسن اتفاق سے یہ مسودہ ملگیا ہم اس کو نہایت خوشی سے شایع کرتے ہین لیکن اپنی بہن مسز خلیقی صاحبہ سے نادم ہین کہ آنکے اس ضروری مضمون کی داد دینے کے بجاے ان کا مضمون اس قدر تاخیر سے شایع ہوتا ہے۔

بیگم۔ خیر یہ معاملہ سچ ہو خواہ جھوٹ مگر تم غور ضرور کرنا، آبرو کا معاملہ ہے۔ زمانہ کو جاتے دیر نہین لگتی جب ہم پہلے کان دھرینگے تب ہی کام چلیگا۔ اور رہا جبیبہ اور خاندان کی شادی کا مسئلہ اس پر غور ضرور کرنا۔ یہ رشتہ میری رضیہ کے لئے کوفت اور باہمی رنجشوں کا پیش خیمہ بن جاے گا جس گھر مین آفتاب کی بہن وہان آفتاب کا

۶

برس دن کے قریب ہوا ہو گا، ہنڈرت کے کوچے مین ۱۹ ہزار کا ایک مکان خریدا اور اوس کی ضروری مرمت وغیرہ کرا کے بیگم کلثوم النسا بھائی کے ہان سے علحدہ ہو کر یہان سکونت پذیر ہو گئی ہین، کیا کرتین ماشاءاللہ اب بچے سیانے ہو گئے، خدا رکھے فاخرہ کی شادی منشی حیدر رضا ڈپٹی کلکٹر الہ آباد کے صاحبزادے سے ہو چکی تھی داماد کو ساس کے پاس آتے جاتے دیکھکر

منشی احمد علی کی بیوی کہنساتی تھین، یہ ناگوار معلوم ہوا، اور اب آفتاب کبھی خیر سے بائیسوین برس مین لگا سیانے نیچے اپنے کو نسے پہلے اسکی کو خدا وہ دن کرے کہ آفتاب کی شادی بیاہ کا موقع ہو، تو بڑی دقت تھی"!۔

بڑے بڑے دالان در دالان والدہ کی نشست کے لئے مخصوص تھے سامنے کا بڑا کمرہ فاخرہ خاتون کے لئے تہا، جب وہ سسرال سے آتین تہین تو وہ اد کھول جاتا تھا ورنہ قفل کنجی لگ کے بند پڑا رہتا تہا! مگر آجکل فاخرہ آئی ہوئی ہین، اور اُن کے خاوند بھی مہمان ہین"!

بڑے دالانو نکے عقب مین شرقی جانب کا خوبصورت کمرہ آفتاب کیلئے مخصوص تھا، جس مین چاندنی اور قالین قرینے قرینے سے بچھے ہوئے تھے عقب مین رائٹنگ میز اور سنہری کام کی کرسی پڑی ہوئی تھی برابر دوسری جانب بنی شیشے والی ڈریسنگ الماری، اور قریب ہی واشنگ میز جس کے پاس ٹیبل پر ایک خوبصورت ڈبیہ مین صابون برش علی الترتیب کنگھا وغیرہ رکھا تھا تمام کمرہ مین خوبصورت مناظر کی تصویرین اور وسط مین انگیٹھی کے اوپر جسٹس امام علی مرحوم کی تصویر بڑے سنہرے چوکٹے مین جڑی ہوئی آویزان تھی، ۳۰ لین کا ایک عمدہ لیمپ دیوارگیری مین لگا روشن ہے، شام کا کھانا بڑے دسترخوان پر (والدہ صاحبہ کے ساتھہ) کھا کر قریب نو بجے کے آفتاب اپنے کمرے مین آیا، خلاف معمول آج خندہ پیشانی، چین بر جبین بن گئی تھی، ! نورانی، و شفاف جبین پر

چند در چند شکن پور اشاعرہ موج آب کا لطف دے رہی تھین، کسی خیال مین ڈوبا اور مغموم قالین پر آکر بیٹھ گیا، اب تکیہ پر سر رکھکر لیٹ گیا! از خود رفتہ آفتاب"! فنائی الوحشت آفتاب!! اب ضبط کا یارا بھی نہین! آہ کیا راز بستہ آشکار ہو جاوے گا! مگر ہاے۔ کب تک سہون کچھہ رنج والم کی حد بھی۔ خلش پیکان الم دمبدم کی حد بھی، رشک سوزان نفس طرز ستم کی حد بھی۔ مانا عشق مین غم ہے! پر کچھہ غم کی حد بھی۔

یان پار سینے کے میرے سنانِ الم ہے
وان نو مشقی ایجاد عنوانِ ستم ہے

اے عشق و محبت کی سرد آہون، اے جذب وتاثیر کے چلتے ہوے جادو ن! اے نالہ جگر دوز کے پیام رسان خیالی پیغام برون! اکیا تم اتنی مدد کر سکتے ہو! کہ اوس کو جسکی دلنشین آدائین، پیارے انداز، میرے دلمین جگہ پا چکے ہین! میری مضطربانہ حالت کی خبر کر دو! آہ اے شریفانہ خون کی رفتار بند ہو جا، ای ناموسِ خاندان مجھہ ایسے نہین صرف مجھے چھوڑ دے! مین دیوانہ ہو گیا ہون، مین ننگ خاندان بن گیا ہون، اُف۔

اے کشش حسن دلاویز میری بھی خبر ہے! ا نہین۔

ہان او میری سچی اور پاک محبت کے دیوتا، ہان اور حسن وعشق کے بار عب اوتار! ہان رشتہ الفت کی وابستگی کے خبر دار حال فرشتے، تو اوس کو، ہان اوس کو جو میری جان کا مفہوم بن گئی ہے! جو میرے حواس سے تعبیر ہو سکتی ہے! جو میری

رگ وپے میں جاری وساری ہے"! ہاں جو میرے اعماق روح میں نفوذ کر گئی ہے"! اتنی ہاں صرف اتنی اطلاع دیدے"! کہ اے خوبصورتی اور حُسن کی مجسم دیبی، پری تمثال، حبیبہ! آفتاب ناکردہ گناہ آفتاب تیری محبت کے جنون میں مُبتلا ہے"! میری حبیبہ! تجھ کو کیا خبر ہو گی کہ میں تیرے سوزِ عشق کو کب سے سینۂ مجروح میں رکھتا ہوں۔ حبیبہ پیاری حبیبہ! تمھیں کب معلوم ہوگا کہ میں تمھیں اب کن پیار کی نظروں سے دیکھتا ہوں! بھولی، حبیبہ تیرا بھائی کا خطاب مجھ نالایق کے لئے ، میں گناہ گار کردگار نہیں تیرا بھی گناہگار ہوں خدا البصیر وخبیر ہے مگر مجھ ظالم نے تجھے فریب دیا! تیری بلا اطلاع اک عجیب نظر سے تجھے دیکھنا شروع کردیا، میں سیہ کار ہوں -

مگر خداوندا، تجھے اپنی ستاری ورحیمی کی قسم مجھے معاف کرنا۔ تو دیکھتا ہے میں تری صنعت ومصوری کے پاک مرقع کو تیری جادوگری کو کن عظمت کیش نگاہوں سے دیکھتا ہوں"! میں بیشک حبیبہ کو اس شرعی تعلق سے قبل بہن سمجھتا ہوں، اور سمجھوں گا، مگر محبت سے دیکھونگا"! محبت! تیری اقسام وتاثیر کے کرشمے بھی عجیب ہیں"! عجیب ہیں اور لامحدود ہیں"!! ماں کی محبت، باپ کی محبت"! بہن کی محبت"! بیوی، یا بنے والی بیوی کی محبت"! سب کی کیفیتیں جُدا ہیں، - آہ کہنے کو میں نے بہن کہہ لیا مگر دل برق کی طرح تڑپ گیا، ٹوٹ گیا، حبیبہ! تیری محبت کا مرتبہ کچھ ایسا رتبہ رکھتی جس کا رنگ، اور امتیاز جُدا ہے"! بہن"! اور معشوق کی الفت کی فلاسفی! عجیب ہے"! - اک طرف خونکی اور دودھ کی مشترک ذات ہماری ایسی ہمدردی اور محبت کی حق دار اور مستحق

غزل

تمنائے عمادی پھلواری عظیم آبادی

خار از نزاکت برگ گل شکستہ ایم — واز پیچ زلف گیسوے سنبل شکستہ ایم

از نالہ نغمہ بر لب بلبل شکستہ ایم — واز خون دیدہ رنگ رخ گل شکستہ ایم

نتوان زد از احاطۂ سودان کسے دن قدم — یا اندرون حلقۂ کاکل شکستہ ایم

صد شیشہا مے یئے قطع کلام شیخ — بر وجہ منع دور و تسلسل شکستہ ایم

در ماہ پاک صوم شب قدر با بدان — آنشب کہ روزہ بر قدح مل شکستہ ایم

جز ماکس از دہان تو مضمون نیافت — این مہر را بغور و تامل شکستہ ایم

ساقی بیک نگاہ تو پیمان اتقا — در میکدہ بخشت خم مل شکستہ ایم

جز جامۂ جنون بسر ما درست نیست — زان تار جیب صبر و تحمل شکستہ ایم

خاموشیم زبان ملاحت خموش ساخت — دندانش از جواب تحمل سکستہ ایم

داریم پایمال قناعت سر طمع — پائے طلب بتیشۂ توکل شکستہ ایم

نتوان درست کرد تمنا سخن ز درد

از بسکہ دل بسنگ تغافل شکستہ ایم

قوت الخیال

پروفیسر صاحب موصوف کی دوسری کتاب جو اس مشہور انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے جسکی تھوڑے عرصہ مین تیس چالیس ہزار جلدین فروخت ہو چکی ہین کتاب کی خوبی دیکھنے سے معلوم ہو سکتی ہے قیمت ۸ر

خیر مقدم شبلی

بموقع تشریف آوری بمقام بانکی پور انجمن اسلامیہ کیطرف سے پیش کیا گیا

نغمہ زن کیوں شاخِ گل پر بلبلِ ناشاد ہے
آج کیوں اُجڑا ہوا اک گلستاں آباد ہے

ہل رہا ہے پتا پتا - ہے یہ جوشِ انبساط
کس طرح تنتا اکڑتا باغ میں شمشاد ہے

نرگسِ بیمار بھی بشاش آتی ہے نظر
بلبلِ ناشاد بھی دیکھو کہ کیسی شاد ہے

آمد آمد آج کس گل کی ہے کیسی دھوم ہے
صحنِ گلشن میں یہ کیا شورِ مبارکباد ہے

مل گئی ہے کونسی ایسی تجھے دولت ؟ بتا
کیوں دماغ آج آسمان پر اے عظیم آباد ہے ؟

کان دھرئے کیا صدا دیتی ہیں گا گا کر بلبلیں
کہتے ہیں انداز غنچوں کے کہ کچھ ارشاد ہے

آج ہے اُس کے قدم سے عزت اپنی خاک کو
اُس کے دم سے آج یہ اُجڑا دیار آباد ہے

جو ہے بانیِ ندوہ ادب کا علم و فن کا سرپرست
فارسی کی شاعری میں آج جو اُستاد ہے

جسکی تحریریں سند ہیں اک محقق کے لئے
جس کی اسٹائل مصنف کیلئے خیر اد ہے

دھاک ہے تیغ قلم کی جسکی ملکِ علم میں
فیصلوں پر جسکے دشمن دوست سب کا صاد ہے

اُسکی کن کن خوبیوں کو ہم گنیں ؟ کیا کیا کہیں
ہے بجا اُس کو اگر ہم علم کا دیوتا کہیں

لڑکیوں کی انشا - حامیانِ تعلیمِ نسواں کی عرصہ سے خواہش تھی کہ کوئی انشا لڑکیوں کے واسطے مولوی محمد عبد الراشد صاحب الخیری کی قلم سے نکلے لطف زبان کے واسطے کچھ لکھنا بے سود ہے ہر خط ایسا موثر ہے کہ ایک ایک حرف کلیجہ پر گڑتا ہے قیمت عمر ناظرین عصمت و تمدن سے ۸ر

مینیجر عصمت و تمدن دہلی

تمدن

اُمہات الامہ

گذشتہ سے پیوستہ

شمس العلماء مولوی حافظ نذیر احمد صاحب مرحوم۔ دہلوی۔ ایل ایل ڈی

عباس نے اس شرط پر چار ہزار درہم قرض دئے کہ اگر سال آیندہ تک دونون دفعہ کا کل قرضہ ادا نہ کروگے تو تمہین سقایت کے عہدے سے دست بردار ہونا پڑے گا اور تمہاری جگہ مین اس پر مسلط ہوجاؤنگا ابو طالب نے اس شرط کو منظور کر لیا مگر چونکہ دوسرے سال تک بھی ابو طالب۔ عباس کا قرضہ ادا نہ کر سکے شرط کے مطابق عہدۂ سقایت سے الگ ہوگئے اور اب سے یہ عہدہ بھی عباس کے نامزد ہوگیا عباس کے بعد ان کے فرزند عبد اللہ اس عہدے سے ممتاز ہوئے اور رفادت اور سقایت کے دونون عہدے کا انقراض

خلافت عباسیہ تک بنو عباس مین رہے۔
رہا عہدۂ حجابت تو زمانہ اسلام تک تو بنو عبد الدار مین باقی رہا فتح مکہ کے روز عباسؓ نے جناب پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ خانہ کعبہ کی کنجی مجھے ملجائے تاکہ رفادت اور سقایت وحجابت کی تینون خدمتین میرے ہی ہاتھ مین رہین پیغمبر صاحب نے اس بارے مین کوئی قطعی رائے قائم نہین کی تھی۔
پیغمبر صاحب نے عبد العزی ابن عثمان بن عبد الدار کے پوتے طلحہ کے بیٹے عثمان کو بلایا اور کعبے کی کنجی اُس کے حوالہ کر دی عثمان الحجبی کے انتقال کے بعد اس کا بھائی شیبہ اس عہدے سے ممتاز ہوا اور پھر یہ خدمت ہمیشہ بنی شیبہ سے متعلق رہی علی ہذا القیاس عہدہ علم برداری بھی ایک عرصہ تک بنو عبد الدار مین باقی رہا جنگ احد مین اسی قبیلہ کے زیادہ لوگ مسلمانون کے ہاتھ سے مقتول ہوئے کہ جب انمین کا ایک علم بردار مارا جاتا دوسرا اس جگہ جھنڈا اُٹھاتا۔
عبد مناف کے کئی فرزند تھے مگر سب مین زیادہ سیر چشم اور فیاض ہاشم تھے۔ ان کا اصلی نام تو عمرو تھا مگر علو شان کی وجہ سے لوگ ان کو عمرو العلا بھی کہتے تھے یہ اور عبد الشمس دونون حقیقی بھائی تھے اور اتفاق سے دونون جوڑوان پیدا ہوئے تھے اور اس طرح پیدا ہوئے تھے کہ ہاشم کے پانون کا پنجہ عبد شمس کی پیشانی سے چپکا ہوا تھا اور اس مضبوطی کے ساتھ چپکا ہوا تھا کہ بجز سیلان دم الگ ہونا ممکن نہ تھا چنانچہ جب ہاشم کا

پنجہ عبدشمس کی پیشانی سے چھڑایا گیا تو اس قدر خون تھا کہ عبدشمس کا پاؤن تک لہو مین نہا گیا اس مین اُس زمانے کے کاہنون اور نجومیون نے ان دونون کے متعلق یہ پیشین گوئی کی کہ عنقریب ان دونون کی اولاد مین ایسی سخت اور عام خونریزی ہوگی جو تاریخ کے صفحون سے کبھی نہین مٹے گی اور ایسا ہی ہوا کہ ہاشم اور عبدشمس کے بعد دونون کی اولاد مین خونریزی متوارث ہوگئی یہان تک کہ ۱۳۳ ہجری مین بنوالعباس جو ہاشم کی اولاد مین تھے اور بنوامیہ جو عبدشمس کی نسل مین تھے دونون مین حد سے زیادہ خونریزی ہوئی جس نے بنی امیہ کی قوت کا چراغ ہمیشہ کیلئے گل کردیا۔

ہاشم نے جو فطرۃً فیاض اور سیرچشم تھا۔ اہل موسم کی نگرانی کی خدمت شاہانہ عظمت کے ساتھہ ادا کی وہ خود بڑا دولتمند تھا اور قبائل قریش کے بہت سے عمائد اور روسا نے اس کے پاس ایک معقول رقم چندے کی جمع کردی تھی کہ حاجیون کی تواضع اور مدارات مین حسب موقع اپنے ہاتھہ سے خرچ کرے جس رات ذالحجہ کا چاند دکھائی دیتا۔ ہاشم اُس کی صبح کو تمام قبائل قریش کو جمع کرتے اور خود کعبے کی دیوار سے پیٹھہ لگا کر دروازے کے سامنے مُنہہ کرکے کھڑے ہوتے اور ایک نہایت موثر خطبہ دلکش لہجے مین پڑھتے خطبے مین عمائد قریش کو مخاطب کرکے نہایت زوردار لفظون مین کہتے معاشر قریش تم عرب کے سردار ہو تمھاری وجاہت اور شرافت نسب اور ہوشمندی کا شہرہ عرب کے کونے کونے مین پڑا گونج رہا ہے اور تمھاری فضیلت و بزرگی سارے

حجاز کو تسلیم ہے تم خدا کے مقدس معبد کے ہمسایے ہو اور اُس کے محافظ قرار دیے گئے ہو۔ خدا نے اپنی ولایت اور اپنے حق وجوار کی وجہ سے تمام بنی اسمٰعیل مین تمھین ممتاز فرمایا اور اپنے معزز گھر کی محافظ و خبر گیری کی خدمت تمھارے ہاتھون مین دیکر تمھین خصوصیت کا تمغہ عنایت کیا ہے جو لوگ خدا کے اُس مقدس و آباد گھر کی زیارت کو آتے اور اوس کی تعظیم و تکریم کرتے ہین وہ درحقیقت خدا کے مہمان ہین اور خدا کے مہمانو نکی خاطر و مدارات کرنے کے سب سے پہلے تم مستحق ہو۔ پس خدا کے مہمانون اور اوس کے گھر کے زایرون کی خوش دلی سے تعظیم و توقیر کرو اور اُن کو پیٹ بھر کھانا پانی دو مین اس مقدس معبد کے پروردگار کی قسم کھا کر کہتا ہون کہ اگر میرے پاس اسقدر دولت ہوتی جس سے یہ سارے کام کاج چل جاتے تو مین تمھین ایک درم کی بھی تکلیف نہین دیتا اور بے دریغ اپنی ساری دولت خدا کے مہمانون کی خدمت مین خرچ کر ڈالتا مین اس موقع پر اپنی حلال کمائی اور پاک مال مین سے وہ رقم نکال کر چندے مین دیتا ہون جس مین نہ تو قطع رحمی کا شائبہ ہے اور نہ ظلماً جمع کی ہے تو تم مین سے بھی جو شخص چاہے تنگ دلی سے نہین بلکہ خوش دلی کے ساتھ ایسا کرے لیکن ساتھ ہی مین تمھین بھی اس مقدس معبد حرمت و عظمت کی قسم دلاتا ہون کہ جو مال خانہ خدا کے زائرون کی مہمانی اور اُنکی خاطر و مدارات کیلیے پاک اور

ملہ مسلمانو! اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانت رکھنے والونکی امانتین (جیسا تکمین)، انکے حوالے کر دو۔

بے لوث ہو غرض کہ جب ہاشم اس طرح کا خطبہ پڑھکر فارغ ہوتے تو سامعین دولت کے جمع کرنے مین ان تھک کوشش کرتے اور بہت سا مال اکھٹا کر کے دار الندوہ مین لا ڈالتے۔

خلاصہ یہ کہ ہاشم نے دریا دلی اور فیاضی کے ساتھ حجاج کی خدمت کر کے اور اپنا ذاتی بہت سا مال خرچ کر کے مکہ مین ایک عمدہ نظیر قایم کی اور ساتھ ہی قبائل قریش نے بھی بڑی سر گرمی اور مستعدی کے ساتھ اس کو مال سے مدد دی ہر ہر قبیلے کے ایک ایک شخص نے اپنی گنجائش کے موافق چندہ دیا اور حجاج کی ایک کثیر جماعت کو کھانے اور پانی کی طرف سے مطمئن کر دیا جب تک اہل موسم کا ہجوم رہتا کھانا پانی نہایت سرگرمی کے ساتھ برابر تقسیم ہوتا رہتا۔ اسی طرح مکے کے نام آوری ہاشم کی وجہ سے بخوبی قایم رہی مگر جس وجہ سے ہاشم کا نام بہت زیادہ مشہور ہوا وہ اس کی اعلی درجے کی خیرات ہے جسکی اہل مکہ کو ہمیشہ سخت ضرورت رہتی ہے ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ عرب مین کال پڑا اور قریش بھوکون مرنے لگے ہاشم سے ان کی تکلیف دیکھی نہ گئی اپنی ذاتی بہت سی دولت لیکر ملک شام گیا اور وہان سے آٹے اور روٹیون کا ذخیرہ خرید کرا ونٹون پر لاد دیا یہان آکر بہت سے اونٹ ذبح کیے اور کعک (بسکٹ) اور روٹیون کو توڑ کر سالن مین بھگو اور ثرید بنا کر لوگون کو یہان تک کھلایا کہ وہ خوب سیر ہو گئے اس وقت سے لوگ اوس کو ہاشم کہنے لگے کیونکہ ہاشم کے لغوی معنی توڑنے کے ہین۔

ہاشم نے سالن مین روٹی توڑ کر بھگوئی اور اسے ثرید بنایا
تھا اس سے ہاشم کے نام سے مشہور ہوا۔
ہاشم کو فیاضی اور سیر چشمی کے علاوہ ذاتی وجاہت اور تمکنت
و وقار بہت کچھہ حاصل تھا اور قدرت نے اوس کے جسمانی ساخت
مین بھی ایک خاص طرح کا اعتدال وودیعت رکھا تھا یہی وجہ تھی کہ قبائل
عرب کے عمائد اور وفود اختیار اپنی لڑکیاں ان کے نکاح مین
دینے کی غرض سے پیش کرتے تھے یہان تک کہ بادشاہ روم نے ایک
مرتبہ ہاشم کے پاس باین مضمون پیغام بھیجا کہ میری ایک
لڑکی ہے نہایت حسین اور حسین ہونے کے علاوہ لطیفہ گو بذلہ سنج
اگر تم یہان آؤ تو مین تمہارے ساتھہ اوس کی شادی کر دون
کیونکہ مین نے تمہارے مکارم اخلاق اور جود وسخا کا شہرہ سنا
ہے ہاشم نے صاف لفظون مین انکار کر دیا اور روم کے بادشاہ
کے پیام کی مطلق پروانہ کی فرزجمیون مین کا ایک مشہور قبیلہ
بنی عدی بن النجار یثرب ومدینے مین رہتا تھا ہاشم نے اس
قبیلہ مین کی ایک شریف النسب اور نجیب الطرفین عورت سے شادی
کی اور اسی عورت کے بطن سے ایک باوقار لڑکا پیدا ہوا جو آگے
چلکر عبد المطلب اور شیتہ الحمد کے نام سے پکارا گیا یہ لڑکا
ابھی دودھہ ہی پیتا تھا کہ ہاشم کا پیمانہ حیات لبریز ہو کر چھلک گیا
اور اپنے ہونہار بچے کو ماں کی گود مین چھوڑ نہایت حسرت کے ساتھہ
عالم آخرت کو سفر کر گیا۔
عبد المطلب کچھہ عرصے اپنی ماں کی آغوش محبت اور پھر اپنے

چچا مطلب کے سایۂ عاطفت مین پرورش پاتے رہے اور جب ابتدائی عمر کے مرحلے طے کرکے سن شعور کو پہونچے تو رسوم مروجہ کے مطابق تمام کمالات وفضائل کو اپنے مین جمع کرلیا اور آبائی شرف وبزرگی کے علاوہ بعض اُن خصوصیتونکی وجہ سے جو انمین موجود تھین تھوڑے ہی دنون مین اپنے باپ ہاشم کی طرح نامور اور مشہور ہوگئے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مستجاب الدعوات بھی تھے انھون نے اپنے اوپر شراب کا استعمال مطلقاً حرام کرلیا تہا یہ پہلے شخص تھے جو تعبداً غار حرا مین بیٹھے۔

سیر کی کتابون مین لکھا ہے کہ رمضان کا مہینہ آتا تو عبدالمطلب حرا پہاڑ پر چڑھ جاتے اور لوگون سے علیحدہ ہوکر عالم خموشی مین خدا کے جلال وعظمت اور اس کی اسمار وصفات مین غور وفکر کرتے اور مساکین کو نہایت سیر چشمی کے ساتھ کھانا تقسیم کرتے ان کے دسترخوان سے پرندون کے لئے کھانا اوٹھایا جاتا اور پہاڑ ونکی چوٹیون پر دور تک پھیلا دیا جاتا اور اسی سے لوگ ان کو مطعم الطیر بھی کہا کرتے تھے۔

عبدالمطلب پیدا ہوئے تو ان کے سر پر سفید بال تھے اس سے لوگون نے ان کا نام شیبۃ الحمد رکھا تھا اس لئے عربی مین سفیدی سر کو شیب کہتے ہین اور الحمد اس لئے کہ خاندان کے بڑے بوڑھونکو توقع تھی کہ یہ بڑھاپے مین پہونچینگے اور لوگ ان کو حمد وثنا کے ساتھ یاد کرینگے اور ایسا ہی ہوا بھی کہ عبدالمطلب ایک سو چالیس برس کی عمر کو پہونچے اور انکی کمال شرافت وسیادت

اور قومی ہمدردی اور مصیبت زدون کی امداد اور اپاہجون کی خبرگیری
کی وجہ سے اس زمانے کے لوگ انھین ہمیشہ نیکنامی اور تعریف کے
ساتھہ یاد کرتے رہے۔ ان کے عبدالمطلب کے ساتہہ نامزد ہونے
کے متعلق کتابون مین نہایت دلچسپ روایتین مذکور ہین ازان جملہ
یہ کہ ہاشم کے انتقال کے بعد کچھہ عرصے تک شیبۃ الحمد
مان کے آغوش محبت مین رہے اور یہان تک رہے کہ چلنے پھرنے
کھیلنے کودنے کے لایق ہوگئے ایک دن کا ذکر ہے کہ مدینے کے
ایک وسیع میدان مین چند بچے تیرون سے کھیل رہے تھے
ایک شخص اُس طرف سے گذرتا ہوا ذرا کی ذرا دم لینے اور بچون
کا تماشا دیکھنے کی غرض سے یہان ٹھہر گیا جو نہایت آزادی
کے ساتہہ تیر چھوڑتے اور اُدہر سے ادھر بھاگے بھاگے پھرتے
تھے دفعتہً ایک بچے کا تیر نشانے پر جا لگا اور بے ساختہ اوسکی
زبان سے نکلا انا ابن سید البطحا جونہی یہ جملہ بچے کے مُنہ سے
نکلا گذرنے والا شخص جو یہان کھڑا بچون کا تماشہ دیکھہ رہا تھا
نہایت تیزی کے ساتہہ اس بچے کی طرف بڑھا اور لگا پوچھنے کہ صاحبزادے
تمہارا کیا نام ہے بچے نے سادگی سے جواب دیا کہ مجھے شیبۃ الحمد
کہتے ہین کہا اور تمہارے والد کا نام جواب دیا ہاشم سید بن عبد مناف
یہ سنکر وہ شخص یہان سے چل کھڑا ہوا اور مکہ مین آکر ہاشم
کے حقیقی بھائی مطلب بن عبد مناف کو تلاش کیا معلوم
ہوا کہ مطلب حطیم کعبے مین موجود ہے۔
یہ اس کے پاس گیا اور جو واقعہ آنکھون سے دیکھا تھا زبان

سے ادا کیا مطلب فوراً مکے سے نکل مدینہ پہونچا اور شیبۃ الحمد کو
اپنے باپ عبد مناف کی شباہت پاکر پہچان لیا بے ساختہ
اوس کی آنکھون سے آنسو نکل پڑے مگر اُس نے بڑے ضبط
سے اپنے دلی جوش کو روکا۔ شیبۃ الحمد کو پیار کیا اور تھوڑی
دیر تک گلے سے لگائے چپکے چپکے روتا رہا پھر تسلی اور
دلدہی کے لہجے مین بولا پیارے شیبۃ الحمد! مین تیرا چچا ہون
اور تجھے تیرے خاندان کے لوگون مین لے جانے کی غرض
سے یہان آیا ہون۔ شیبۃ الحمد کی مان کو معلوم ہوا تو اوسکی نظرون
مین ساری دنیا اندھیر ہوگئی مگر غریب کرہی کیا سکتی تھی صبر کرکے
کہا ھذا عبد المطلب یعنی یہ لڑکا مطلب کا غلام ہے مطلب
نے جواب دیا نہین میرا غلام نہین ہے میرے مرحوم بھائی
ہاشم کا پیارا فرزند اور عزیز بھتیجا ہے بس اُس وقت
سے شیبۃ الحمد کا نام عبد المطلب پڑگیا الغرض عبد المطلب
نے اپنے چچا مطلب کے کنار عاطفت مین پرورش پائی اور وہ
جو کہتے ہین کہ پوت کے پاؤن پالنے مین پہچانے جاتے ہین عبد المطلب
ابتدا ہی سے نیک سیرت نظر آتے تھے۔ یہان تک کہ جب
پورے جوان ہوئے تو تمام صفات حمیدہ اور خصائل بزرگانہ ان مین
جمع ہوگئے تھے۔ مطلب کے مرے پیچھے ان کے تمام مناصب
انکی طرف عود کر آئے اور مکے کی ریاست کی باگ انکے ہاتھ مین
آگئی۔

حلبی اپنی سیر مین عبد المطلب کے ذاتی حالات لکھتے ہوئے ابن جوزی

سے نقل کرتے ہین کہ عبدالمطلب آخر عمر مین بتون کی پرستش
ترک کر خدا کی وحدانیتہ کے قائل ہو گئے تھے اور مکہ کی چار دیواری
کے اندر بہت سے ان طریقون کی بنیاد ڈال دی تھی جنکی تعلیم بعد کو
اسلام کے ذریعے سے اول عرب مین پھر تمام روے زمین
مین دی گئی مثلاً وفاء نذر۔ محارم سے نکاح کی ممانعت قطع ید سارق
دختر کشی کی مناہی تحریم خمر و زنا اور یہ کہ کوئی شخص خانہ کعبہ کا
ننگا طواف نکرے۔

عبدالمطلب کے واقعات زندگی مین ایک بڑا واقعہ چاہ زمزم کا ہے
جسکی مختصر کیفیت یہ ہے کہ جب سے اس مقدس معبد کا
نام جو سرزمین مکہ مین واقعہ ہے کعبہ رکھا گیا ساتھہ ہی اس
چشمہ کا نام زمزم رکھا گیا بلکہ بناء کعبہ کی تاریخ سے اس
چشمہ کی تاریخ کچھہ پہلے ہی لکھی گئی ہے گویا یہی چشمہ مکے کی
آبادی اور بناء کعبہ کا سبب واقع ہوا۔ اس چشمے کی اصلیت
یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کی دو بیویان تھین۔ ہاجرہ اور سارا
دونون سوکنون مین سازگاری نہ تھی اس لئے حضرت
ابراہیم ہاجرہ کو ان کے بیٹے اسمٰعیل سمیت اس جگہ لے
آئے جہان اب خانہ کعبہ موجود ہے اور دونون مان بیٹون کو اس
غیر آباد صحرا مین چھوڑ کر ملک شام چلے گئے یہان ہاجرہ
اور انکے معصوم بچے کو پیاس لگی کیونکہ جو پانی وہ اپنے ساتھہ
لائین تھین ہو چکا۔ پیاس کی شدت اور پانی نہ ملنے کی وجہ
سے انپر مایوسی طاری ہوئی تو بیقراری کی حالت مین ہر چہار

طرف پانی کی تلاش کرتی پھرتی تھین۔ اتفاق سے کنکرون پتھرون اور کوڑے کرکٹ کے نیچے پانی کا نشان معلوم ہوا کنکرون پتھرون کو ہٹایا تو پانی نکل آیا۔ ہاجرہ اس نعمت غیر مترقبہ پر شکر خدا بجا لائین۔ خود بھی سیر ہو کر پانی پیا اور اپنے فرزند کو بھی پلایا اور چشمے کو محفوظ رکھنے کے لئے اس کے گرداگرد منڈیر بنادی۔ برسون تک یہ چشمہ جاری رہا اور اوس کی وجہ سے اردگرد کے بہت سے قبایل یہان آبسے۔ ایک مدت کے بعد جرہمیون نے جو سب سے پہلے چشمہ زمزم کے قریب آباد ہوئے جب خدا کی مقدس عبادت گاہ مین طرح طرح کے فسادات برپا کئے تو عمرو بن حارث جرہمی نے جو ان کا سردار تھا یہ خوف اس سرزمین سے بھاگ جانے کا ارادہ کیا کہ مبادا جرہمیون پر ان کے کردار ناشایستہ کی وجہ سے عذاب الٰہی ٹوٹ پڑے اور مین بھی ان کے ساتھہ مبتلائے عذاب ہوجاؤن۔ چنانچہ اس نے اپنی ساری قوم کو جمع کر کے اپنا یہ ارادہ ظاہر کیا قوم کے سربرآوردہ لوگون نے اسکی راے سے اتفاق اور سب نے سرزمین مکہ سے نکل جانے پر عزم مصمم ظاہر کیا۔ عمرو نے قوم کے نفیس و قیمتی مال مثلاً سونے کی دو ہرنیان اور تلوارین اور زرہین اور حجرالرکن یا حجرالمقام جو کچھہ بھی کعبہ کا چڑھاوا تھا اس چشمے مین جو مرور زمانے کی وجہ سے ایک خاصہ عمیق گڑھا ہوگیا تھا ڈالدیا۔ (باقی آیندہ)

خلافت فاروقی کا ایک واقعہ

(از شمس العلماء علامہ شبلی)

عام الرمادہ کہتے ہیں، جسکو عرب میں لوگ
عہد خلافت عمرؓ کا وہ سال تھا

اُس سال قحط عام تھا ایسا کہ ملک میں
لوگوں کو بھوک پیاس سے جینا محال تھا

پانی کی ایک بوند نہ ٹپکی تھی ابر سے
ہر خاص و عام سخت پراگندہ حال تھا

اعراب کی بسر حشرات زمین پہ تھی
سب اُٹھ گیا، جو فرق حرام و حلال تھا

تشویش سب سے بڑھکے جناب عمرؓ کو بھی
ہر دم اسی کی فکر، اسی کا خیال تھا

تدبیر لاکھ کی تھی، مگر رک سکا نہ قحط
گو انتظام ملک میں اُنکو کمال تھا

معمول تھا جناب عمرؓ کا کہ متصل
کرتے تھے گشت رات کو سونا محال تھا

اک دن کا واقعہ ہے کہ پہنچے جو دشت میں
کوسوں تلک زمین پہ خیموں کا جال تھا

بچے کئی تھے، ایک ضعیفہ کی گود میں
جن میں کوئی بڑا تھا کوئی خرد سال تھا

دیکھا جو اس کو یہ، کہ پکاتی ہے کوئی چیز
جاتا رہا جو طبع حزین میں ملال تھا۔

سمجھے کہ اب وہ ملک کی حالت نہیں رہی
کم ہو چلا ہے قحط کا جو استعمال تھا

پوچھا خود اس سے جاکے تو رونے لگی کہ آہ!
کیا آپ کو غذا کا بھی یاں احتمال تھا

بچے یہ تین دن سے تڑپتے ہیں خاک پر
میں کیا کہوں زبان سے ان کا جو حال تھا

مجبور ہو کے، انکے بہلنے کے واسطے
پانی چڑھا دیا ہے، یہ اسکا اُبال تھا

اُنسے یہ کہہ دیا ہے کہ اب مطمئن رہو
کھانا یہ پک رہا ہے، یہ اسکا خیال تھا

بے اختیار رونے لگے حضرت عمرؓ
بولے کہ یہ مرے ہی کئے کا وبال تھا

جو کچھ کہ ہے یہ سب ہے مری شامت عمل
ازبس گناہگار مرا بال بال تھا

بازار جاکے لائے سب اسباب آب و نان
جو زخم قحط کا سبب اندمال تھا

پیرس کا ہیرو

فابورسینیٹ جرمین کے ایک اُجڑے ہوئے ہوٹل مین مارکوئس دی شیٹیلرڈ سفری لباس پہنے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے میز پر اوس کی ٹوپی اور دستانے پڑے تھے اور وہین ایک تلوار اور ایک جوڑ پستول بھی رکھے تھے اور اوسکی کرسی کی پشت پر ایک سیاہ اور کوٹ لٹکا ہوا تھا۔ مارکوئس پیرس کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہنے کو تھا۔ کیونکہ وہ سوچ چکا تھا کہ جب بادشاہ اور ملکہ کو ہی باغیون نے سولی دیدی ہے تو پھر یہان رہنے سے کیا حاصل۔ جب تک مین لنکے کام آسکا تب تک پیرس مین رہا۔ مگر اب۔ اب یون بیکار پڑا رہنا فضول ہے اگرچہ اس شورش اور انقلاب کے زمانہ مین وہ سر کو ہتھیلی پر لئے پھرتا تھا مگر پھر بھی اب تک ہر طرح محفوظ رہا تھا۔ لیکن اس کے بچ جانے پر اتنا تعجب نہین ہوتا۔ جس قدر یہ عجیب معلوم ہوتا ہے کہ یہ نوجوان کمسن خوبصورت اور دولت مند شخص اپنی جان سے اتنا بیزار کیون تھا۔ حقیقت مین اس جان بازی کی وجہ ایک عورت تھی۔ اتفاق سے وہ اور اُس کا چھوٹا بھائی کارنٹ دونون نادانستہ ایک ہی لڑکی مس لیول کے طلبگار تھے۔ اور اگرچہ مارکوئس کو بڑے ہونے کی وجہ سے زیادہ کامیابی کی امید تھی مگر اُس نے اپنے بھائی کا میلان خاطر دیکھکر اپنے راز محبت کو چھپا لیا۔ یہان تک کہ آخر اوس کے بھائی کی اس لڑکی سے

نسبت قرار پاگئی۔ اس اثنا مین ملک مین انقلاب ہوگیا۔ دونون بھائیون نے مردانہ وار اپنے بادشاہ کی حمایت مین خوب خوب جان نثاریان کین مگر اُس سیلاب بدتمیزی کے سامنے ان چھوٹی چھوٹی رکاوٹون کی کیا ہستی تھی بادشاہ کے قتل کے زمانے نے اون کو بھی یک جا نرہنے دیا۔ اور اب مارکوئس نے اپنے بھائی کو ایک ہفتہ سے نہ دیکھا تھا۔ جو اس ہولناک زمانے مین ایک مدت مدید سے کم نہ تھا۔ اسے یہ بھی خبر نہ تھی کہ مسس لیول کہان ہے البتہ اتنا معلوم تھا کہ وہ بھی یہین کہین پیرس مین چھپی ہوئی ہے۔

مارکوئس اپنے فکرون مین ڈوبا ہوا تھا کہ یکایک اوس کے خاندان کا سب سے پرانا اور وفادار ملازم اندر آیا۔ اور اوس کی آہٹ سے مارکوئس چونک پڑا۔ اس ملازم نے اپنے نوجوان آقا کے چھپنے کے لئے دو کمرے صاف کر دئے تھے اور وہی اُسے یہان لایا تھا۔ مارکوئس کے متوجہ ہوتے ہی اوس نے بڑے ادب سے کہا "آپ کے سفر کا سارا سامان تیار ہے گاڑی دروازے پر کھڑی ہے۔ ڈاک کے گھوڑے بھی آگئے ہین اور پروانہ راہداری بھی مل گیا ہے" "لارڈ کہان ہے؟" "یہ لیجئے" مارکوئس نے پاسپورٹ کھولا تو اوس مین سے ایک اور پرچہ نکل کر گر پڑا۔ اس نے اسے پڑھکر آہستہ سے کہا "آہا ان لوگون کو میرا پتہ لگ گیا اور وہ مجھے پکڑنے کے لئے ۸ بجے آئینگے۔ مگر خیر اُنکو ہال خالی ملے گا۔ کیونکہ مین ۷ بجے ہی چلا جاونگا" اس نے گھنٹہ کی طرف دیکھا سات بجنے مین پاؤ گھنٹہ باقی تھا اُس نے تلوار کمر سے لگائی اور پھر اور کوٹ

پہنا۔ پستول جیب مین رکھے۔ اور جلاوطنی کے واسطے تیار ہو گیا کہ اتنے مین باہر سے پاؤن کی آہٹ معلوم ہوئی مارکوئس کا چہرہ کسی قدر زرد ہو گیا اور اوس نے اپنے دل مین کہا "او ہو گیا وہ ابھی سے آ گئے۔ اتنی جلدی دو گھنٹے پہلے" اور ساتھہ ہی اس کا ہاتھ تلوار کے قبضہ پر پڑا۔ مگر دروازہ کھلتے ہی اسے معلوم ہوا کہ اس کا خیال غلط تھا ایک مرد اور ایک عورت کمرے مین آئے اور مارکوئس ان دونونکو دیکھکر ششدر رہ گیا۔ اس نے کہا "ہین بھائی تم کہان ؟ مسس لیول مین آداب بجالاتی ہون۔ کیون خیریت تو ہے۔ بات کیا ہے ؟" اس نے دیکھا کہ اس کے بھائی کا رنگ اوڑا ہوا ہے اور اوس کی محبوبہ کانپ رہی ہے۔ کونٹ لوئی نے رومال سے اپنا منہ پونچھا اور بھرائی ہوئی آواز مین کہا "بھائی جان! باغی ہمارے پیچھے لگے ہوئے ہین۔ ہم آپکے پاس چھپنے کو آئے ہین میرا تو کچھہ نہین۔ مین تو خوشی خوشی موت کے منہ مین جا سکتا ہون مگر یہ حسین۔ اسے بچائیے اسے کہین چھپائیے اور کوئی ایسی تدبیر کیجیے کہ اس پر آنچ نہ آئے۔" مارکوئس کا سر جھک گیا مگر لحظہ ہی بھر مین کفر کا غبار اوسکے چہرے سے دور ہو گیا۔ اور اوسنے اپنے دلمین فیصلہ کر کے کہا "بھائی جان تم وقت پر آئے۔ مین پیرس سے جاتا ہی تھا،" "کیا آپ پیرس سے جاتے تھے ؟ کیونکر ؟ کس طرح" مارکوئس "سیبسٹین ان دونون کو لیجا کر گاڑی مین بٹھا دو۔ لوئی یہ لو پاسپورٹ مین تمہارے پیچھے گھوڑے پر بیٹھکر آتا ہون،" ساتھہ ہی اس نے اپنے

ملازم کو آنکھہ کے اشارے سے روکا کہ خبردار کوئی بات زبان سے نہ نکالے - کیونکہ یہ کہنے ہی کو تھا کہ اور کوئی گھوڑا موجود نہین ہے - نوبلی اور اوس کے رفیق کو اتنا ہوش کہان تھا کہ وہ ان اشارون کو دیکھین - اُنھون نے شکریہ ادا کرنا چاہا مگر مارکوس نے اتنی بھاگڑ مچائی کہ وہ ایک لفظ بھی زبان سے نہ کہہ سکے -

جب وہ چلے گئے اور کمرے کا دروازہ بند ہو گیا تو مارکوس نے پھر اپنا کوٹ اُتار دیا - تلوار کھول ڈالی اور کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنے دل مین کہنے لگا خیر اچھا - اگر خدا کو یہی منظور ہے کہ مین پہین اپنی جان دون تو یہی سہی - مجھے اپنی زندگی کی چندان پرواہ نہین - اب بھلا گھوڑے کہان مل سکتے ہین - اور ۹ بجتے بجتے تو فیصلہ ہی ہے - خیر پیارے وطن رخصت! زندگی اور جوانی رخصت!! دولت اور شہرت رخصت!!! تمنائے انتقام تو بھی رخصت!!!! یکایک اوس کو ہنسی آگئی اور وہ اٹھہ کھڑا ہو گیا - اور یہ کہتا ہوا اندر کے کمرے مین چلا گیا - "مگر ہان خوب یاد آیا - میرے ہان مہمان آتے ہین - اون کے استقبال کا تو سامان کر لینا چاہئیے - مین تو ابھی تک تیار ہی نہین ہوا - پاؤ گھنٹہ مین کمرے مین سے نہایت عمدہ ریشمی کپڑے پہنے - سینے پر تمغے اور خطابات کے نشان لگائے - ہاتھہ مین ایک چھوٹی سی مرصع تلوار لئے ایک پورے درباری کے لباس مین مرصع زرین بنکر برآمد ہوا - اور میز پر بیٹھکر اس نے ایک خط لکھا اور اوسے بند کر کے اپنے نوکر کو بلایا - اور اسے وہ خط

دیکر کہا "سبیسٹین - یہ خط لیجاؤ اور فلان شخص کو دے آؤ" بوڑھا ملازم اپنے آقا کی یہ حالت دیکھکر کچھہ حیران ہوگیا - اور اُس نے کہا "حضور - بہت بجا - مگر یہ کپڑے آپ نے کیون بدل دئے ہمارا جانا آج نہین ہوگا بعض مہمان آنے والے ہین - لو اب تم جاؤ" نوکر رخصت ہوگیا - مارکوئس نے کہا "اب وہ ساڑھے نو سے پہلے نہین آسکتا - اور جب تک جو کچھہ ہونا ہوگا - ہو چکے گا - اس بیچارے غریب پر میری وجہ سے کوئی آفت نہ پڑیگی - آہ بیچارہ سبیسٹین ہمارا بڑا پُرانا وفادار نوکر تھا" پھر اسے خیال آیا کہ جب سبیسٹین آنکر دیکھے گا کہ مین پکڑا گیا تو اُسے کیا سخت صدمہ ہوگا - اس خیال سے اُسکی آنکھون مین آنسو بھر آئے مگر اُس نے رنج کو ضبط کیا طبیعت کو روکا اور ان چیزونکو الگ کرنے لگا - جو اُس نے اپنے وفادار ملازم کو دینے کے لئے رکھی تھین - یکایک دروازے پر شوروغل ہوا - مارکوئس نے کمرے کی تمام شمعین روشن کردین اور کہا ابھی تو پونے نو ہی بجے ہین - یہ لوگ بڑے جلد باز ہین - اتنے مین کسی نے زور سے دروازہ پر ہاتھہ مارا اور چلاکر کہا - دروازہ کھول دو - کسی دوسرے نے جواب دیا کہ دروازہ کھلا ہوا ہے اور ساتھہ ہی کواڑ کھل گئے اور ہر طرح کے ہتھیارون سے مسلح آدمیون کی ایک بے ترتیب جماعت بھڑ بھڑا کر اندر آگئی - اور مارکوئس کو دیکھتے ہی بیسیون آوازین بلند ہوئین - امیر پادشاہ پرست غریبون کا دشمن مارو - مارو - چھوڑو مت -

اس طوفان بے تمیزی کے مقابلے مین مارکوئس نہایت اطمینان اور سکون سے ایک بے پروائی کے ساتھہ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اس کا خوبصورت چہرہ - اس کا زرق برق لباس اور اس کے جواہر نگار نشان شمعونکی روشنی مین جگمگا رہے ہین- اس کے انداز مین ایک ایسی بات تھی کہ سب لوگ مرعوب اور متحیر ہو گئے - مارکوئس نے اپنی تلوار کھینچ لی اور پستولون کے گھوڑے چڑھا لئے - اور صاف بے جھجک آواز مین کہا "خبردار اگر کسی نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا - تو اوس کی خیر نہین تم جانتے ہو کہ مین کبھی خطا نہین کرتا دس منٹ مین سپاہی مجھے گرفتار کرنے آتے ہین - مین اپنے آپ کو انکے حوالے کردون گا مگر تم جیسے کمینے پاجی مجھی ہاتھہ نہین لگا سکتے" اس دھمکی سے لوگوں کا غصہ اور بھی تیز ہو گیا اور ایک بڑا موٹا تازہ جوان بکتا جھکتا آگے بڑھا - مگر اس کے قدم اٹھاتے ہی ایک شعلہ چمکا - ایک آواز آئی - اور وہ ہمیشہ کے لیے فرش خاک پر لیٹ گیا - گولی ٹھیک اسکی پیشانی کے بیچ میں لگی تھی - اور مغز کو پاش پاش کر گئی تھی ایک اور نے ہمت کی - مگر اس کا بھی دوسرا قدم نہ اوٹھہ سکا اور اور وہ بھی اس کے ساتھہ لیٹ گیا - لوگ غیض و غضب سے نیلے پیلے ہو رہے تھے - مگر اب کسی کا پاؤں آگے نہیں اُٹھتا تھا اس مجمع میں مارکوئس نے دیکھا کہ بہت سے اسی کے نوکر چاکر - خدمتگار سائیس - باورچی - اور بہت سے فقیر بھی شامل تھے جنکا سوال اس نے کبھی بھی رد نہ کیا تھا - اس نے ایک نظر انکی طرف دیکھا - اور اسکی مغرور حقارت آمیز نگاہ کے سامنے سب کی نظریں جھک گئیں - اور عادت نے ان سب کے

سر ان کے قدیم اور مہربان آقا کے سامنے خم کر دیے یکایک اسے کچھ خیال آیا۔ اس نے اپنا کوٹ پہن لیا۔ اور پھر دروازے کی طرف چلا۔ لوگوں نے اسے روکنا چاہا۔ مگر اس نے تلوار سے دو آدمیوں کو گرا دیا۔ اور پستول نے دو اور کو مار کر اس کے سے راستہ صاف کر دیا۔ اور وہ آگے بڑھا۔

گھنٹے نے نو بجائے۔ اور ساتھ ہی باہر کی سڑک پر سے قواعد دان سپاہیوں کے چلتے ہوئے قدموں کی آواز آئی۔ اور دم بھر بعد ایک افسر ۸ سپاہیوں کو لیے اندر آیا۔ مارکوئس کی خوں چکاں تلوار اور چھ تڑپتے ہوئے لاشے دیکھ کر اس نے بندوق چلنیائی۔ مگر شیلڈ نے تلوار سے اسکی نال کا رخ پھیر دیا۔ اور حقارت آمیز لہجے میں افسر سے کہا۔ "جناب کپتان صاحب آپ اتنی عجلت نہ کریں۔ میں اپنے تئیں آپ کے حوالے کیے دیتا ہوں۔ بشرطیکہ آپ میری تلوار نہ لیں"۔ افسر "ناممکن"۔ مارکوئس نے کہا "میں آپ سے ڈرتا نہیں۔ مگر لڑائی میں آپ ہی کا نقصان ہے۔ آپ کے بھی چند سپاہی ہیں خاک و خون میں لوٹتے ہونگے"۔ افسر نے کسیقدر تامل کے بعد کہا "لیکن آپ اگر بھاگ گئے تو ضامن کون"۔ امیر نے غرور سے کہا "میرا قول"۔ افسر "قبول - اچھا تو غور سے سنو"۔ افسر "قبول ہے"۔

مارکوئس "سنو یہ تلوار تو میں اپنے پہلو میں رکھونگا مگر یہ دوسری تلوار جس سے میں نے اکثر فرانس کے دشمنوں کو زک دی ہے۔ یہ میں تمکو تحفۃً دیتا ہوں۔ تم کو یاد ہوگا۔ تم پہلے میری رجمنٹ میں لفٹنٹ تھے۔ لو اور اسے اس شخص کی یادگار کے طور پر رکھو جو کبھی تمھارا کرنل تھا"۔

افسر نے بڑے ادب سے تلوار لے لی۔ مارکوئس نے میز پر سے ایک تھیلا اوٹھا لیا۔ جو وہ وہیں بھول گیا تھا۔ اور پیر مجمع کیطرف بڑھکر کہا جو کچھ یہاں رہ گیا ہے۔ وہ ان بیچاروں کے بال بچوں کو لیجا کر دے دینا۔ جو میرے ہاتھ سے مارے گئے ہیں۔ لو صاحب اب چلو۔ میں تیار ہوں۔ چار سپاہیوں کو آگے چلنے دو۔ اور چار کو پیچھے لاؤ پیچھے "

اِس کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ راستے میں لوگ اس کے زرتار اور ریشمی لباس کو دیکھکر جو اوورکوٹ کے اندر سے بھی جھلکتا معلوم ہوتا تھا چاروں طرف سے اسکو بُرا بھلا کہتے تھے اور اگر سپاہی اسے گھیرے ہوئے نہ ہوتے لوگ اسے یقیناً مار ڈالتے۔ مگر اسے ان شور و شغب اور گالی گلوج کی ذرا بھی پرواہ نہ تھی۔ راستے میں ایک کھوسٹ بڑھیا نے اسپر اپنا مُکا اُٹھایا۔ اس نے خاموشی سے دو اشرفیاں اس کے ہاتھ میں دیدیں اور کہا " یہ لے۔ شور مت مچا " بڑھیا چپ رہ گئی اور وہ ہنستا ہوا آگے چلا گیا۔

آخر وہ قید خانے کے پاس پہنچ گئے۔ رات مشعلوں کی کثرت سے دن بن رہی تھی۔ دریا کے کنارے پر ریل کے ایک گوشے میں ایک نہایت غریب بوڑھی عورت پھٹے پُرانے چیتھڑے لگائے۔ برسات کی ٹھنڈی ہوا میں لرز رہی تھی۔ اس ہجوم میں کوئی اس کا خیال تک نہ کرتا تھا۔ مارکوئس اس کے پاس پہنچکر رُکا۔ اور مڑکر سپاہیوں سے نہایت آہستگی اور اطمینان سے کہا " آزادی۔ برابری اور برادری جب ہم اس سرزمین کے اصلی اور سچے حکمراں برسر عروج تھے تو ہم کبھی ایسے

ایسے کمزور اور نادار آدمیوں کو یوں نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ مگر اب آزادی۔ برابری اور برادری کے اس دھوم دھام کے دعوے کے زمانے میں تم ہی میں کی ایک عورت یہاں جاڑے میں ٹھٹھر رہی ہے اور فاقے سے جان دے رہی ہے اور کوئی پوچھتا تک نہیں واہ وا کیا آزادی۔ کیسی برابری اور کیسی برادری ہے" یہ کہکر اس نے اپنا کوٹ اُتارا اور بڑھیا کو اُڑھا دیا۔ اور ساتھ ہی اس کے مُرجھائے ہوئے رعشہ دار ہاتھ میں چند اشرفیاں دیدیں۔ آس پاس کے لوگ اس طعنے اور سرزنش پر منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے رہے۔ سپاہی ادب سے سر جھکائے ہوئے دور کھڑے رہے۔ آخر مارکوئس خود آگے بڑھا اور پُل سے گزر کر جیل خانے میں داخل ہو گیا۔

دوسرے دن صبح جیل خانے میں وہ اپنے بہت سے پُرانے دوستوں اور ملاقاتیوں سے مل ہی رہا تھا کہ اتنے میں اس کی نظر اپنے بھائی کا ڈانٹ لوئی پر پڑی۔ اس نے نہایت حیرت سے پوچھا "لوئی تم یہاں؟ میں تو سمجھتا تھا کہ اب تک تم جرمنی یا انگلستان پہنچ چکے ہوگے!"

لوئی نے بڑی غمگین آواز میں کہا "بدقسمتی سے راستے میں ہم کو ایک ہمارے پُرانے ہگوڑے کوچبان نے پہچان کر دھوکے سے گرفتار کرا دیا۔ ہم ابھی یہاں لائے گئے ہیں"۔ سٹیلرڈ نے تاسف سے اپنے دل میں کہا "ایک قربانی مفت ضائع ہوئی"! پھر اس نے بلند آواز سے کہا "خیر۔ خیر بھائی گھبراؤ مت۔ جو کچھ خدا کو منظور ہے پورا ہوگا۔ لوئی"۔ "بھائی جان۔ میں خود تو مرنے سے نہیں ڈرتا۔ آخر ایک نہ ایک دن مروں گا ہی مگر ہائے مجھے تو یہ غم کھائے جاتا ہے کہ اسکی

ہائے اسکی نازک گردن پر جلاد کی تلوار چلے گی۔ اُف ستم اس
خیال سے میرا جگر پھٹتا ہے"۔
مارکوئس:- "میری بات سنو اور جو کچھ میں کہوں وہ کرو۔ ابھی میں نے
سُنا ہے کہ میرا کوئی دوست میری رہائی کی کوشش کر رہا ہے
یہ میں نہیں جانتا کہ وہ کون ہے اور کیا کر رہا ہے۔ مگر پھر بھی
امید باقی ہے۔ اور دیکھو قسمت کیا دکھاتی ہے"۔
لوئی کے دل میں امید چمک اٹھی اور دونوں بھائی ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے
اپنے دوستوں سے باتیں کرنے لگے +
یکایک ایک شور ہوا۔ کمرے میں میزیں لگا دی گئیں۔ کرسی بچھ
گئی۔ اور ایک جج وہاں آکر بیٹھ گیا۔ یہ دیکھ کر ڈیوک ڈی کرائون نے
کہا "خوب انھوں نے تو عدالت کی پوری نقل کی ہے"۔ "سنیئے سنیئے
نقیب نام پکار رہا ہے۔ ان کو ہمارے سروں کو بڑی جلدی ہے۔
نقیب نے آگے بڑھکر آواز دی "سٹیلرڈ۔ باشندہ شہر"۔
کسی نے جواب نہ دیا۔ نقیب نے پھر پکارا "سٹیلرڈ باشندہ شہر"
مارکوئس پھر بھی چپ رہا۔ آخر ایک سپاہی نے اس کے کاندھے
پر ہاتھ رکھا اور کہا "صاحب تم بولتے کیوں نہیں نقیب تمکو پکار رہا ہے"
مارکوئس:- "ہاں؟ مجکو؟ مگر میں تو سٹیلرڈ باشندہ شہر نہیں ہوں۔
خدا مجھے ایسے ظالم اور خونریز ملک کا باشندہ نہ بنائے۔
میں تو شاندار سلطنت فرانس کا ایک امیر ہوں اور میرا نام
جین انٹوائن ڈی سیوائے مارکوئس آف سٹیلرڈ ہے۔
نقیب نے ڈر کر اسے اسی نام سے پکارا۔ اور اس کے ساتھ ہی دو تین

اور آدمیوں کو بھی آواز دی جنمیں سے ایک مارکوئس کا چھوٹا کمسن عزا و بھائی تھا۔ سب ملزم آگے بڑھے۔ عدالت نے سب سے پہلے مارکوئس سے سوالات شروع کیے ÷

تمھارا نام سیٹیرڈ ہے؟ میرا نام جین انٹوائن ہے "مگر تمھارا خاندانی نام کیا ہے؟" ڈی سیوائے " پھر تم سیٹیرڈ کے نام پر کیوں بولے تھے "۔ ان بیہودہ سوالات کو رہنے دو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم اتنے نادان نہیں ہو کہ ہمارے مقتول بادشاہ کے عہد کو بھول گئے ہو۔ اور تمکو یہ یاد نہ رہا ہو کہ امرا کس نام سے پکارے جاتے ہیں۔ تم خوب جانتے ہو کہ جب میں برسر حکومت تھا اور جس زمانے میں تم ادنے درجے کے سگ بازاری کی طرح میری جوتیاں چاٹنے اور میرے قدم چومنے کو بھی اپنا فخر سمجھتے تھے تب میں کس نام سے پکارا جاتا تھا۔ اب تم اس نام کو ذلیل کرنا چاہتے ہو۔ جاؤ جاؤ اپنے سوالات اُن سے کرو۔ جو اسکا جواب دیں۔ مجھے تم سے کچھ بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ میں بے پوچھے گچھے ہی مجرم ٹھہر چکا ہوں۔ اب میں ایک بات کا بھی جواب نہیں دونگا مارکوئس کو الگ لیجاکر کھڑا کر دیا۔ مگر کوئی حکم نہیں سُنایا۔ باقی سب کے لیے سزائے موت کا فتوےٰ دیا گیا۔ سب کے بعد اس کمسن لڑکے کی باری آئی۔ اور عدالت نے پوچھا " تمھارا نام کیویلر راشمانٹ ہے " اس نے سر ہلایا۔ بڈھے جج نے اپنی لمبی بدنما گردن بڑھائی اور چندہی تپلی آنکھیں مٹکا کر بڑی متانت سے کہا سُنو۔ عدالت تمھاری کمسنی پر رحم فرما کر تم کو معاف کرتی ہے " اسکی

ماں اور بہنیں جو پا بزنجیر پاس ہی کہڑی تہیں یہ سنکر خوشی سے اُچھل پڑیں بگر انکی خوشی قبل از وقت تھی۔ جج نے کہا۔ مگر اسکی عوض میں تم کو اپنے تمام خطابات۔ جاگیرات اور امیرانہ عادتیں چھوڑکر عساکر دولت میں فوجی خدمات انجام دینی ہونگی"

لڑکا" ہرگز نہیں"۔

جج" پہلے سن تو لو۔ پہر انکار کرنا۔ اگر تم نے عدالت کی بے انتہا مہربانی اور شفقت کو قبول کرنے میں تامل کیا تو تم سولی پر چڑھا دیے جاؤگے"

لڑکا" کچھ حرج نہیں"

جج" مگر یہی نہیں۔ تمھارے ساتھ تمھاری ماں اور بہنوں کا بہی یہی انجام ہوگا"

یہ سنکر لڑکا سر بگریباں ہوگیا۔ آس پاس کے سب امراہی نے نہیں بلکہ معمولی سپاہیوں نے بہی دبی زبان سے اس انصاف و عدالت کو گالیاں دیں اور بُرا بہلا کہا۔ لڑکا خاموش تہا۔ اور ایسا کونسا دل ہوگا جو ایسے ضغطے میں حیران نہ ہوجائے۔ جب تک صرف اسی کی زندگی معرض خطر میں تہی تب تک تو خیر۔ مگر اب اس کی جان۔ اسکی پیاری ماں اور اسکی چاہتی نازنین بہنیں تھیں۔

آخر جج نے کہا۔ بولو لڑکا دم بخود تہا۔ مگر اسکی ماں نے آگے بڑھکر کہا" نہیں نہیں۔ ہرگز نہیں" مارکوئس نے اس کے شانے پر ہاتہ رکھکر کہا" کیولیر۔ ڈرتے کیوں ہو۔ تم امیرزادے ہو۔ معمولی آدمی نہیں ہو۔ تمھارا نام سیولے ہے۔ بزدل مت ہو۔ اس شرمناک بات پر ہرگز راضی مت ہو۔ اس لیے تو یہی بہتر ہے کہ میری تلوار اپنے سینے میں گھونپ کر مرجاؤ۔

لڑکا:۔ بیشک مارکوئس۔ آپ سچ کہتے ہیں ۔نہیں نہیں میں ایسی شرطیں ہرگز
قبول نہیں کروں گا۔

جج:۔ دیکھو پھر سوچ لو۔"

لڑکا" میں انکار کرچکا۔

جج:۔ لو تم اپنی ماں بہنوں کو موت کے حوالے کیے دیتے ہو"

لڑکا" میں کیوں کرنے لگا تھا تم ظالم۔ بے رحم۔ ناخدا ترس۔ تم ہی انکی
جان کے دشمن ہو" اور ان کا خون ناحق ہمیشہ تمھاری گردن پر
رہے گا۔ ہم سب آمادۂ مرگ ہیں"

جج نے سب کی موت کا حکم سُنادیا۔ لڑکے نے کہا "تم ہمارے جسموں
کو مار سکتے ہو۔ مگر ہمارے اصولوں کو نہیں مٹا سکتے۔ خدا یا دشاہ کو سلامت رکھے"
مارکوئس نے آگے بڑھکر کہا" جناب جج صاحب آپ واقعی بڑے عادل
اور منصف حاکم ہیں۔ آپ کے الفاظ کا کیا کہنا آپ خود ہی الزام لگاتے
ہیں اور پھر بے ثبوت دیے موت کا فتویٰ دیتے ہیں۔ ہمارا جرم کیا ہے
صرف یہ کہ ہم شریف خاندان کے ہیں اور رئیس ہیں۔ مگر ذرا یہ تو فرمایئے
کہ کیا آزادی۔ برابری۔ اور برادری کے یہی معنے ہیں۔ میں نے تو سمجھا
تھا کہ اس دور میں سب آرام سے رہیں گے۔ مگر ایسے ظلم و ستم تو کبھی
جابر سے جابر بادشاہ نے بھی نہیں کیے"

جج نے تیوریاں چڑھالیں اور ملزم سب ہنسنے لگے۔ آخر جج اپنے
غصے کو ضبط نہ کرسکا اور جھلا کر کہنے لگا۔ دیکھو یاد رکھو۔ میں تم سے
اچھی طرح سمجھونگا"

مارکوئس نے لاپروائی سے اپنی ناس کی طلائی ڈبیا نکالی اور ایک

چٹکی ناس لی۔ اسیوقت ایک شوخ چشم بے باک سپاہی نے بھی ہاتھہ بڑھایا اور اس میں سے ایک چٹکی لی۔ مارکوئس نے ڈبیا اس کے سامنے پھینک دی اور کہا "دوست اتنی سی کیا لیتے ہو۔ ڈبیا کی ڈبیا ہی لے لو" سپاہی شرمندہ ہوکر پیچھے ہٹ گیا اور پھر یہ سب موت کے منتظر قیدی آپسمیں باتیں کرنے لگے۔ آخر کسی نے دروازے پر آکر کہا "چھکڑا قیدیوں کو مقتل میں لیجانے کے لیے تیار ہے"۔ نقیب نے پھر آگے بڑھکر نام پکارے "ڈیوک ڈی کراون۔ پرنس ڈی پواے وغیرہ وغیرہ" ڈیوک نے ہنسکر کہا "یہ لوگ اپنے استے دعووں کے باوجود بھی نظر حفظ مراتب کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ شکر ہے کہ میرا نام سب سے پہلے ہے ہاں خوب یاد آیا۔ شیٹیلرڈ۔ یہ لو ناس کی ڈبیا تم لے لو۔ اب مجھے چنداں ضرورت نہیں۔ اور تم نے اپنی ڈبیا اس سپاہی کو دیدی ہے۔ مقتل میں مجھے حاجت ہوئی تو پرنس سے لے لونگا۔ دوستو کچھ دیدے کے لیے رخصت۔ اب خدا نے چاہا تو جنت میں ملاقات ہوگی۔ الوداع"

وہ چلے گئے اور دروازہ بند ہو گیا۔ دس منٹ بعد شیٹیلرڈ ایک کونے میں مس لیول کے پاس گیا۔ اس نے بڑی بے تابی سے پوچھا "کیا لوئی آج مارا جائیگا۔ للہ بتائیے۔ صاف صاف بتا دیجئے۔ چھپائیے نہیں"۔ شیٹیلرڈ اب اسی کی باری ہے۔ مس لیول "ہائے مارکوئس۔ آپ تو بڑے عقلمند ہیں۔ خدا کے لیے اسے کسی طرح بچا لیجئے۔ کیا کوئی صورت بھی نہیں رہی" مارکوئس "ہاں ہاں۔ گھبراؤ نہیں۔ ایک صورت ہے اور وہ بچ جائیگا۔ مگر تم ایک کام کرو۔ وہ اس دوسرے کمرے میں سے باہر نہ آئے تھوڑی دیر تک وہیں رہے۔ اور مجھے ذرا اس پہ سفیدہ اور کوٹ دیدو۔

اب یہ لوگ تمیز نہیں کر سکتے"۔

وہ حیرت سے اس تبدیل لباس کو دیکھتی رہی۔ آخر اس نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا" مگر آپ یہ کیا کر رہے ہیں۔ یہ تو جان بوجھکر اپنی جان دینا ہے"۔

مارکوئس نے کچھ جواب نہ دیا صرف اس کا ہاتھ چوما اور اپنے بھائی کے انداز سے چلتا ہوا باہر نکل گیا اس کے دوستوں نے اسے پہچان لیا اور دم بھر میں سب اس کے گرد جمع ہوکر اس تبدیل ہیئت کا سبب پوچھنے لگے۔ مارکوئس نے کہا" سبب؟ بات یہ ہے کہ مجھے ذرا ز کام ہو رہا ہے"۔ مگر تم تو پہچانے نہیں پڑتے بالکل اپنے بھائی کی طرح ہو"۔

مارکوئس۔" ہاں بچپن میں بھی ہم دونوں بہت مشابہ تھے۔ اکثر دفعہ دوسرے لوگوں کو دہوکا ہو جایا کرتا تھا۔

اب" اب کیا؟ عین اسی وقت دروازہ کھلا اور نقیب نے پکارا۔ کاونٹ ڈی شٹیلرڈ"۔

مارکوئس:" اور اب وہ پھر دھوکا کھا جائیں گے ہش ہش۔ صاحبو۔ اسے خبر نہیں۔ میرے لیے آسان ہے کیونکہ میرے لیے دنیا میں کوئی دلچسپی نہیں۔ اسکی ایک محبوبہ ہے جس سے اسکی شادی ہونے والی ہے مگر آپ اسے اس معافی لینے سے انکار نہ کرنے دیں۔ جو مارکوئس آف شٹیلرڈ کے لیے آئے گی۔ کیونکہ اسوقت وہی مارکوئس ہو گا اور اسکا معافی نامے کو قبول کر لینا کچھ جھوٹ نہ ہو گا۔ اور میں۔ میرے دوست میری غلط بیانیوں کو معاف کر دیں گے۔ رخصت۔ رخصت۔ الوداع"۔

سب نے حیرت اور گرمجوشی سے اس سے ہاتھ ملائے اور وہ روانہ ہوا

نقیب سے کہ پیر کیار"کیو ملیر ڈی راشمانٹ۔ میڈم ڈی راشمانٹ۔ میڈ سوال ڈی راشمانٹ۔ وغیرہ وغیرہ"

غرض ایک لمحے بعد مارکوئس اپنے بھائی کاونٹ لوئی کی جگہ مقتل کو جارہا تھا۔ اور جلادوں کو برابر جلدی چلنے کی تاکید کرتا جاتا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر لوئی کو خبر ہوئی تو وہ ہرگز اسے قبول نہ کرے گا۔ اور بنا بنایا کھیل بگڑ جائیگا۔ آخر وہ سولی کے نیچے پہنچا اور اطمینان سے زینہ پر چڑھا گیا۔ کیو میر اشمانٹ اس کے ساتھ ساتھ تھا اور باقی سب پیچھے آرہے تھے۔ اس کا سر غیر مردانہ انداز سے اٹھا ہوا تھا۔ آنکھیں چمک رہی تھیں اور اس کے سینے پر زرکار لباس کے اوپر جواہر نگار تمغے۔ اور شاہی نشان جگمگا رہے تھے۔

یہاں پر ایک آدمی نے آگے بڑھکر راشمانٹ کو معافی کی امید دلائی موت کے منہ میں سولی کے اوپر ماں بہنوں کو دیکھ کر لڑکا پیر جھجکا اور اسکا پاؤں رکا۔ مگر مارکوئس نے ایک قدم آگے بڑھا کر کہا "دیکھو بیر میں تم کو دکھاؤں ہم لوگ کس طرح جان دیتے ہیں" یہ کہکر اس نے جلاد سے کہا دوست۔ تم کو میرا سر کاٹنا ہے۔ اس تکلیف کے عوض میں یہہ بدرہ لو۔ لیکن اگر ہوسکے تو تم میری لاش سر سمیت دفن کردینا اور یہہ میری تلوار اور میرے تمغے جو عمر بھر میرے ساتھ رہے۔ ان کو بھی میرے ساتھ ہی دفنا دینا۔ میں ان سے جدا ہونا نہیں چاہتا۔ تمہاری بڑی مہربانی ہوگی"

جلاد نے نرمی سے جواب دیا "آپ کے فرمانے کی تعمیل ہوگی"
مارکوئس نے اپنے گلے کا کالر کھول دیا اور اپنے اردگرد دیکھا پر آخری

نظر ڈالی۔ اور خاموشی سے تلوار کے نیچے گردن رکھہ کر کر دل میں کہا
شکر ہے کہ یہ قربانی تو قبول ہو ہی گئی۔ تلوار کا پہل سورج کی شعاعوں
میں چمکا۔ اور مارکوئس کا سر بدن سے جدا ہو کر زمین پر آپڑا۔ اس کے
بعد یکے بعد دیگرے اور سر بھی گرنے لگے۔ جیسے گلچیں کی مقراض
سے پہول شاخوں سے گرتے ہیں +

تین دن بعد قید خانے میں مارکوئس ڈی سیٹیلرڈ کے لیے
معافی نامہ آگیا جسمیں اسکو اور اس کے ساتہہ کے ایک اور آدمی کو
معافی اور آزادی دیے جانے کا حکم تہا۔ اس حکم سے لوئی کاونٹ
ڈی شیٹیلرڈ جو اپنے بھائی کے مرنے سے مارکوئس ہو گیا تہا
آزاد ہو گیا۔ اور اس کے ساتہہ میڈموائل لیول نے بھی رہائی پائی
وہ دونوں وہاں سے انگلستان چلے گئے۔ جہاں انکا کچہہ سرمایہ جمع تہا

ترجمہ
مفتی انوار الحق

مسلمانو خبر لو!

دیکھا کیے تماشا بیٹھے ہوئے فدائی افسانہ دل کا سن کے اور انکو نیند آئی

اللہ ری بیوفائی اللہ ری کج ادائی

یہ بھی خبر ہے تم کو مہمان ایک شب ہیں ڈوبی ہوئی ہیں نبضیں بیمار جاں بلب ہیں

اسلامیوں بتاؤ کب تک یہ بے وفائی

کہنا بھی تم کسی کا دنیا میں مانتے ہو یہ کیسے مشغلے ہیں کیوں خاک چھانتے ہو

حل کر رہے ہو یہ کیوں اسرار کیمیائی

کیا کر رہی ہے دنیا اسکی بھی کچھ خبر ہے نو مسلموں کی حالت ابتر نظر آئی

وہ بھی تو ہیں بتاؤ آخر تمھارے بھائی

ہیں بعض ان میں ایسے لچھمن ہے نام جنکا شام و سحر وظیفہ ہے رام رام جنکا

سنتا نہ اونپہ وہ ہیں محتاج رہنمائی

جاری ہیں ہندوؤں کے اُنمیں رسوم سارے کھاتے نہیں ہیں کھانا وہ ہاتھ کا ہمارے

محتاط کس قدر ہیں اللہ ری پارسائی

اے ہادیان مذہب اے واعظان ملت گر فرض ہے تمھارا اسلام کی اشاعت

اٹھو کہ آگیا ہے اب وقت رہنمائی

میرزا محمد ہادی۔ عزیز لکھنوی

ناظرین خط و کتابت کے وقت نمبر خریداری ضرور تحریر فرمائیں

دل کی حفاظت

سکاٹ لینڈ کی پہاڑیاں جن کا سلسلہ میلوں تک چلا گیا ہے۔ ہرے بھرے درختوں سے ڈھکی ہوئی ہیں جس طرف نگاہ اوٹھا کر دیکھو سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے۔ راہ سرسبز پہاڑیوں کے دامن اور بھی دلفریب ہیں۔ جابجا پانی کے چشمے، جھیلیں اور آبشار ہیں۔ دریا اپنی سفید لہروں سے اِس قدرتی منظر کو اور بھی چار چاند لگا رہے ہیں۔ اگر کسی بلندی سے دیکھا جائے تو سبزہ کے درمیان یہ بہتے ہوئے دریا چاندی کے سانپ معلوم ہوتے ہیں

بعض پہاڑیوں کی چوٹیوں پر دو و تین تین میل مربع میدان ہیں۔ ان میدانوں میں عالی شان سربفلک عمارتیں بنی ہوئی ہیں۔ جن کی شان و شوکت اُن کے مالکوں کی ثروت و دولت کا اظہار کر رہی ہے۔

ان ہی بلند پہاڑیوں میں سے ایک پر "شاہ بروس" والیے سکاٹ لینڈ کا عظیم الشان قصر واقع ہے۔ جس پر شاہی جھنڈا نہایت آب و تاب سے لہرا رہا ہے۔ ہوا کے تیز تھپیڑوں سے اکثر اوقات یہ جھنڈا بالکل کھل جاتا ہے اور سکاٹ لینڈ کا شاہی نشان اُس پر صاف نظر آتا ہے۔

۱۳۲۸ء میں "نارتھمپٹن" کے قیام پر انگلستان و سکاٹ لینڈ کے مشہور عہد نامہ پر دستخط ہو چکے ہیں۔ جس کی رُو سے سکاٹ لینڈ کا بادشاہ آیندہ ایک خود مختار حکمران تسلیم کیا جائے گا۔ اس طرح شاہ بروس ملک سکاٹ لینڈ کا پہلا خود مختار حکمران ہُوا۔

(۲)

قصر شاہی کا وہ حصّہ جہاں خاص بادشاہ کی خوابگاہ ہے نہایت مستعد سپاہیوں کے مسلح گارد سے گھرا ہوا ہے۔ اندر ایک کمرے میں "شاہ بروس" نیم جان اور چند گھنٹوں کا مہمان بستر مرگ پر پڑا ہے جملہ اراکین سلطنت، رفقا، مصاحب، طبیب، اور بڑے بڑے جرنیل جو اُسکے ساتھ اپنا ملک آزاد کرانے کے لیے گھسان کی لڑائیوں میں جوہر شجاعت دکھا چکے تھے، اسوقت قضا و قدر کے زبردست اور قوی ہاتوں سے آگے بالکل عاجز و لاچار بیٹھے تھے تمام کوششیں جو ایک بادشاہ کی جان بچانے کے لیے کیجا سکتی تھیں، کی گئیں، لیکن شاہ کی حالت ہر لمحہ خراب ہوتی جا رہی تھی یہاں تک کہ خود بادشاہ کو بھی یقین ہوگیا کہ میں صرف چند منٹ کے لیے اس دنیاوی تاج و تخت کا مالک ہوں اور بہت جلد اُس خداوند حقیقی کے روبرو ایک ادنے غلام کی طرح محکوم دست بستہ حاضر ہوتا ہے +

شاہ نے اپنے خاص رفقا اور معتمدین کو اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ جبپر وہ سب نہایت سہولیت سے اُس کے پلنگ کے قریب جمع ہوگئے بادشاہ زار زار رو دیا اور ایک دردناک لہجہ میں کہا "میں اپنی تمام بدافعالیوں پر پشیمان ہوں اور اپنے گناہوں سے توبہ کرتا ہوں، خاصکر اُس گناہِ کبیرہ سے جو سلطنت کے دوسرے دعویدار "کامین" کے بیگناہ قتل کرنے میں مجھ سے سرزد ہوا۔ افسوس کہ ہم نے خدا کے گھر میں عین محراب و منبر کے قریب بجائے "کامین" کی ناحق جان لی۔!! میری عمر وفا کرتی، تو میں "یروشلم" جاکر ضرور ہنگامۂ جنگ برپا کرتا، بیت المقدس کو

ناپاک ظالموں سے چھین لیتا اور یہ کار ثواب میری اس بد اعمالی کا ایک نہایت مناسب کفارہ ہو جاتا۔ افسوس! مجکو زیست کی امید نہیں"۔ یہ کہکر افسردہ دل بادشاہ اپنے تمام عمائد میں سے ایک کی طرف مخاطب ہوا "میرے پیارے جان نثار "دل" ایک نہ ایک دن ضرور شجاعت سے مجکو توقع ہے کہ تو میرا "دل" ایک نہ ایک دن ضرور بیت المقدس لے جائے گا اور یہی میری آخری وصیت ہے"۔ لارڈ ڈگلس اس دردناک اپیل کو سنکر زار و قطار رونے لگا اور کہا "جہاں پناہ!! یہ آپ کی قدر افزائی اور بندہ پروری ہے جو آپ اپنے خادم ڈگلس کو یہ خدمت سپرد کرتے ہیں"۔ بادشاہ کی پیشانی سے کسی قدر اطمینان و مسرت کے آثار نمایاں ہوے۔ اور فوراً اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔

- ۳ -

ماتمی توپیں دہائیں کرکے داغی جانے لگیں۔ اراکین سلطنت نے فوراً سیاہ ماتمی لباس پہن لیے، تمام ملک میں کوئی فرد بشر ایسا نہ تھا جس کے دل پر ایسے فدائے ملک و قوم بادشاہ کی وفات کا اثر نہ ہوا ہو کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو اپنے ہر دلعزیز تاجدار کے لیے خون باری نہ کر رہی ہو۔ شاہ بلوط اور صندل کی لکڑی شاہ متوفی کے نعش کے ارد گرد جلائی گئی، مختلف قسم کی خوشبوئیں روشن کی گئیں شاہی رسوم کے مطابق پلنگ کے چاروں کونوں پر باڈی گارڈ ماتمی لباس میں ایک ایک گھنٹہ باری باری پہرہ دینے لگا مقدس پادری نے جو آج جنازہ کی رسوم ادا کرنے خاص جبہ پہن کر آیا تھا، انجیل ہاتھ میں لیکر کچھ دعا پڑھی دو ربادشاہ کے لیے معبود حقیقی کی درگاہ میں خلوص دل سے دعا مانگنے لگا۔

لارڈ ڈگلس نے جس کو بادشاہ کی آخری وصیت کی تعمیل کرنے کا فخر حاصل ہوا تھا، فوراً ایک تجربہ کار سرجن طلب کیا اور حکم دیا کہ شاہی نعش کی پسلیاں کاٹ کر اندر سے دل نکال لیا جائے۔ چنانچہ دل نکالا گیا اور ڈگلس نے اُسے ایک قیمتی مرصع ڈبیا میں بند کر کے سونے کی زنجیر اُس میں ڈال اور اپنے گلے میں تعویذ کی طرح پہن لیا۔

۔ ۴ ۔

دوسرے دن جبکہ آفتاب نے سیاہ ماتمی رات کی نقاب سے اپنا چہرہ نکالا، ڈگلس نے تمام افواج کا معائنہ کیا، اور تجربہ کار جانباز سپاہ کا ایک لشکر جرار تیار کر کے یروشلم پر حملہ کرنے کے ارادے سے چل کھڑا ہوا عام باشندگان میں سے بھی ہزاروں آدمی جو اپنے بادشاہ کی موت سے غمزدہ تھے اس مہم میں شرکت کی غرض سے ساتھ ہوئے۔

بیت المقدس پہنچنے سے قبل ڈگلس نے ہسپانیہ میں کچھ قیام کرنا چاہا۔ جہاں سلطان عثمان الفارہ سو والئے ہسپانیہ سے جنگ کر رہا تھا۔ الفارہ سو، کے لیے اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا تھا کہ وہ سکاٹ لینڈ کے سپہ سالار ڈگلس کو اپنے ساتھ ملالے چنانچہ الفارسو نے ڈگلس سے کہا:۔

"الفارسو"۔ آپ جس غرض سے بیت المقدس پر چڑھائی کرتے جاتے ہیں وہ ثواب وہ مطلب نہیں حاصل ہو سکتا ہے!!

لارڈ ڈگلس۔ لیکن میرے مالک نے مجکو وصیت کی تھی کہ تو بیت المقدس کو ظالموں (مسلمانوں) سے چھین لینے کے لیے یروشلم پر چڑھائی کیجو!

"الفارسو"۔ جی ہاں!! تو میرا مدعا بھی یہی ہے کہ آپ سلطان عثمان سے جس کی قلمرو میں بیت المقدس بھی شامل ہے بیں کے ہیں جنگ

کروائے۔ دودل یک شود بشکنند کوہ را۔ میری اور آپ کی فوجیں مل کر سلطان عثمان کے دھوئیں بکھیر دیں گے۔ صرف عثمان کو شکست دینا ہی مذہب عیسوی کی بہت بڑی خدمت ہو گی!

ڈگلس بے شک آپ درست فرماتے ہیں۔ میں دل و جان سے حاضر ہوں۔

-۵-

ملک الموت کو ضد ہے کہ میں جان لیکے ٹلوں
سر بسجدہ ہے مسیحا کہ مری بات رہے

ایک طرف الفارسو والئی ہسپانیہ کا مستعد و بہادر لشکر اور سکاٹ لینڈ کے جاں نثار مذہبی جوش میں سرشار مجاہدین، دوسری طرف یکہ و تنہا سلطان عثمان، دوسرا ملک دوسری آبادی، غیر علاقہ، مردانہ وار دشمن کے ملک میں دو دو طاقتوں کے مقابلہ میں صف آرا ہے۔ سلطان نے اپنی فوج کو مخاطب کر کے کہا:-

میرے جان نثار اسلامی بھائیو! جاسوسوں نے خبر دی ہے کہ سکاٹ لینڈ کا نامور جرنیل ڈگلس بھی اب شاہ ہسپانیہ کے ساتھ مل گیا ہے۔ کیوں؟ محض اس لیے کہ ہم مسلمان ہیں گویا ہمارا مسلمان ہونا ہی ہمارا سب سے بڑا گناہ ہے۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ مخالفین کا لشکر مذہب اسلام سے جنگ کر رہا ہے۔ بہادر سپاہیو! ہم اپنے ملک سے بہت دور حملہ آور کی حیثیت سے یہاں آئے ہیں اس سے زیادہ اور کوئی ذلت نہیں ہو سکتی کہ ہم دو طاقتوں سے ہراساں ہو کر شکست کھائیں اور اپنا سا منہ لیکر سمندر کی خوفناک موجوں میں کھیلوں

کا طعمہ نہیں! اگر ہمکو مرنا ہے تو مار کر مریں تاکہ دنیا کے بہادروں کی زریں فہرست میں ابد الآباد تک ہمارا نام چمکتا رہے۔ یہی وقت ہے کہ ہم اسلامی حمیت غیرت، اور اخوت کو حرکت دیں، اور دشمن کی نہایت بے جگری سے مدافعت کریں، اور غازی بنکر اپنے پاک اسلام کا بول بالا کہیں!!!

سلطان عثمان کی اس دل سوز اور جوشیلی تقریر نے تمام لشکر اسلام میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ ایک ہی حملہ میں مخالفین کو تین طرف سے گھیر لیا اور سخت گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ ڈگلس نے جب دیکھا کہ تین طرف سے گھر گیا اور بھاگنے کی صورت نہ رہی، تو سخت مایوس ہوگیا، پھر آگے بڑھنا چاہا مگر ہمت نہ ہوئی

انجام کار آگے بڑھنے کی یہ آخری تدبیر کام میں لایا کہ "شاہ بروس" کا "دل"، جو تعویذ کی طرح سینہ پر لٹک رہا تھا، اتار کر میدان میں پھینک دیا اور اس سے مخاطب یوں ہوا:۔

"پہلے تو جا!! تیرے بعد ڈگلس میدان میں اپنی جان دینے کے لیے آگے بڑھے گا!!"

جس جگہ "بروس کا دل" گرا۔ ایک آخری جد وجہد کرکے اسی جگہ ڈگلس بھی پہنچا۔ اور وہیں ڈھیر ہوگیا۔

-۶-

ڈگلس اور اسکے ہزاروں رفقاء کی لاشیں بے گور و کفن، خاک و خون میں پڑی ہیں جو کچھ زندہ بچے وہ یروشلم تو کیا جاتے؟ صحیح سلامت سکاٹ لینڈ پہنچنا ہی دشوار نظر آتا تھا۔ ہاں اس ہزیمت خوردہ فوج کے بچے کچھے افسروں نے اتنا ضرور کیا کہ ان کشتگان کے ڈھیر میں "شاہ

بروس کا دل" اور ڈگلس کی لاش ضرور تلاش کی۔ جرنیل کی لاش اس تعویز نما ڈبیہ کے اوپر پڑی ملی۔ اس طرح گویا ڈگلس نے " بروس کے دل" کی حفاظت میں اپنی انتہائی کوشش کا ثبوت دیا۔

"شاہ بروس کا دل" سکاٹ لینڈ کی ایک عظیم الشان خانقاہ میں منبر کے قریب دفن کیا گیا اس کی نعش تو پہلے ہی دفن کی جا چکی تھی۔ لیکن زمانہ ہوا صدیاں گذر گئیں دنیا بدل گئی وہ عالیشان خانقاہیں اب ٹوٹے پھوٹے کھنڈر رہ گئیں اور یہ جاننے والا بھی کوئی نہ رہا کہ شاہ بروس اور اس کا "دل" کو نسی خانقاہ میں کس جگہ دفن کیے گئے تھے۔

- ۷ -

پوری پانچ صدیاں گزر گئیں کہ ۱۸۱۸ء میں زمانہ نے کروٹ بدلی کھنڈرات کی مرمت و تعمیر شروع ہوئی، شاہ بروس کی قبر کا سنگ مرمر کا کتبہ مٹی کے انبار سے برآمد ہوا بہت کچھ محنت و تلاش کے بعد شاہ متوفی کی لاش بھی نکلی جو اس وجہ سے شناخت کر لی گئی کہ پسلی کی ہڈیاں تراشی ہوئی تھیں کیونکہ ان میں سے کسی زمانہ میں "دل" نکال لیا گیا تھا۔

گورنمنٹ نے فوراً حکم دیا کہ شاہ بروس کی لاش کی نہایت احتیاط سے حفاظت کی جائے تاکہ نیا مقبرہ تیار ہو جائے تو لاش کی تجہیز و تکفین کی رسوم از سر نو ادا کی جائیں۔

ہزاروں لاکھوں مرد عورت شاہ کی لاش دیکھنے دور دور سے آنے لگے۔ لیکن چونکہ یہ تمام خلقت ایک ہی خانقاہ میں نہ سما سکتی تھی اس لیے قرار پایا کہ ایک ایک کر کے ہر شخص لاش کے پاس سے گزر جائے، اور اس طرح ہر امیر و غریب کو اس نامور اور فدائے

ملک و قوم کو بادشاہ کی لاش دیکھنے کا موقع ملے۔

لاش جب ملگئی اور تحقیق ہوچکا کہ یہ بادشاہ بروس ہی کی ہے تو قدرتی امر تھا کہ ہر کس وناکس کا خیال اُس مربع ڈبیا کی تلاش کی طرف متوجہ ہو جس میں وہ "دل" محفوظ تھا جو قومی محبت، آزادی واخوت سے معمور تھا۔ پتھر کی چند بھاری سلوں کے نیچے یہ طلائی زنجیر والی ڈبیا بھی ملگئی۔ اور نہایت عزت و احترام کے ساتھ وہ "دل" جس کی خاطر ہزاروں آدمی موت کے گھاٹ اُتر گئے۔ جس کی حفاظت کے لیے ڈگلس نے اپنی جان دی، ایک معزز مجمع کے روبرو سپردخاک کیا گیا۔

محمد مجید الحسن دہلوی

دنیا کی ایک مثال

سقراط کا حکیمانہ خیال

کیا ہے یہ دنیائے دوں اک آتش افروختہ
لے مدد حسب ضرورت اس سے لے دلسوختہ

شعلۂ جانسوز روشن ہیں میانِ شاہراہ
غیر ممکن ہے کہ قربت میں ملے تجکو پناہ

جانتا ہو نہیں کہ اس دنیا سے تجکو لاگ ہے
ہوشیار اے جانیوالے یہ دہکتی آگ ہے

ہر شرارے میں ملیگی تجھکو تاثیر فنا
اس کے ہر شعلہ میں تو پائیگا تصویر فنا

اس کی قربت سے بڑھیگا رات دن تجھپر فشار
بعد وصلت تو بھی ہوگا شعلہ پیچ و تاب

نقش برآب اس دنیا کے ہیں نقش و نگار
جلتی پھرتی چھاؤں ہے یہ ہستی بے اعتبار

گرمی بازار اس دنیا کی بس کچھ روز ہے
دوزخ آشام اس کا ہر اک شعلہ جانسوز ہے

جل رہے ہیں جلنے والے زندگی بیکار ہے
عشق میں دنیا کے دلپر داغ آتشبار ہے

راستہ چلنے کو جتنی روشنی درکار ہے
فائدہ حاصل کر اتنا ورنہ تو فی النار ہے

محمد یحییٰ تنہا

غزل

نزع میں آئے کوئی کام بھی کرنے ندیا
میں تو مرتا تھا مگر آپ نے مرنے ندیا

آئینہ چھوڑ کے دیکھا کیے صورت میری
دل مضطر نے میرے انکو سنورنے ندیا

اٹھ گیا انجمن ناز سے گھبرا کے کوئی
قصہ دل کو ابھی ختم بھی کرنے ندیا

رشتہ عمر کو کوتاہ محبت نے کیا
ہمکو جو کام کہ کرنا تھا وہ کرنے نہ دیا

کونسی چیز تھی دریائے محبت میں عزیز
جو کوئی ڈوب گیا اسکو ابھرنے ندیا

عزیز

مسلمان اور سنسکرت یا بھاشا

رقمزدہ مولوی سیّد احمد صاحب مولف فرہنگ آصفیہ

مولانا حالی کی تقریظ متعلقہ تحفہ جاوید اور اس پر مولوی ظفر علی خانصاحب بی۔ اے اوڈیٹر اخبار زمیندار کا ایک محققانہ پرزور مدلل اور معلومات سے بھرا ہوا ریمارک ہماری نظر سے گزرا۔ خواجہ صاحب کا رجحان عنوان بالا کے موافق ہے اور مولوی ظفر علی خانصاحب کا زور دار بیان اس کے مخالف

یہی تقریظ ہمیں لالہ سریرام صاحب۔ ایم اے مدون تذکرہ تحفہ جاوید نے بھی سنائی تھی۔ درحقیقت تقریظ نہایت عمدہ۔ ہمدردانہ اور مصلحانہ ہے مگر اس میں خواجہ صاحب کی یہ رائے کہ "(۱) ہندو صاحبوں پر جو اردو زبان کے متعلق تعصب اور ناگواری کا الزام لگایا جاتا ہے اسی قسم کا بلکہ اس سے زیادہ سخت الزام مسلمانوں پر بھی لگایا جاسکتا ہے" ذرا کنکتی اور تامل طلب معلوم ہوتی ہے بلکہ نظرثانی کی محتاج ہے۔ کیونکہ اس امر کی موجودہ مروجہ۔ مقبولہ اور واجب التسلیم صورتوں کی طرف خواجہ صاحب نے عجلت میں پوری پوری نظر نہیں ڈالی جسے ہم اپنے ذاتی خیالات کے موافق نہایت اختصار کے ساتھ مودبانہ اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اگرچہ مولوی ظفر علی خاں صاحب نے مورخانہ نظر سے دیکھا اور محققانہ جواب میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا کیونکہ اٹھ سو برس کے اسلامی حکومت کے ہر دو فریق سنسکرت اور بھاشا پر خاص کر مسلمان بادشاہوں اور مسلمانوں کا دلی رجحان ثابت کردیا۔ لیکن جن ادنی باتوں کو انھوں نے فضول سمجھ کر قلم انداز فرمایا ہے

اس کا اظہار بھی خالی از مفاد نہیں۔

اگرچہ اس معاملہ میں ہماری مبادرت بظاہر اپنے قدیمی و قومی محسن کی عین گستاخی ہے بلکہ وہی مثل صادق آتی ہے کہ چھوٹا منہ اور بڑی بات مگر چونکہ یہ کچھ بڑی بات نہیں ہے اس وجہ سے چھوٹا منہ سے ادبی بچ سکتا ہے۔ کیونکہ ہم جو کچھ لکھتے ہیں یہ نہ تو معترضانہ ہے نہ متعصبانہ۔ نہ معاندانہ بلکہ صرف اپنے فدائے قوم۔ وسعت وہ لسان۔ ترقی خواہ اردو زبان اور ایک مسلم النبوت اُستاد سے رفع شکوک یا اطمینان کرنا ہے جس پر ہمیں خواجہ صاحب کی منصف مزاجی۔ ہر دل عزیزی اور صفائی قلب سے کامل امید ہے کہ وہ اپنے بچوں سے ناراض نہوں گے اور اُستادانہ نکتہ بتا کر چپ کر دیں گے۔ اگرچہ جس مصلحت سے خواجہ صاحب نے یہ فقرہ لکھا وہ عین مناسب وقت اور حسب حال ہے لیکن تحقیق پسند طبیعتیں زمانۂ موجودہ کی رفتار کے برخلاف سمجھ کر ایک اڈھیڑبن میں پڑجائیں گی بلکہ بہت سے نوخیز طلبا۔ اردو کے ہوا خواہ اس کے برخلاف اور مخالف اصحاب اس کے موافق ہو کر بغلیں بجائیں گے۔ کیونکہ وہ دراصل اس رمز کو سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے پس انہیں سمجھانے کے لیے اگر اس امر کی تشریح کر دی جائے تو کچھ بیجا نہیں ہے۔

اس سے آگے خواجہ صاحب فقرۂ مذکور کی اس طرح تشریح فرماتے ہیں"

(۲) کون نہیں جانتا کہ مسلمان باوجودیکہ تقریباً ایک ہزار برس سے ہندوستان میں آباد ہیں مگر اس طول طویل مدت میں انہوں نے چند مستثنیات کو چھوڑ کر کبھی سنسکرت یا برج بھاشا کی طرف باوجود سخت ضرورت آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا (۳) جس سنسکرت کو یورپ کے محقق لاطینی اور یونانی سے زیادہ فصیح زیادہ وسیع اور زیادہ باقاعدہ بتاتے ہیں اور جس کی تحقیقات میں عمریں بسر کر دیتے ہیں (۴) مسلمانوں نے عام طور پر کبھی اُسے قابل التفات

نہیں سمجھا (۵) اگر یہ کہا جائے کہ سنسکرت کا سیکھنا کوئی آسان کام نہیں تو برج بھاشا جو بمقابلہ سنسکرت نہایت سہل و آسان ہے جس کی شاعری نہایت لطیف و شگفتہ اور فصاحت و بلاغت سے لبریز ہے اُسے بھی عموماً بنگاہ نفرت دیکھتے رہے ہیں (۶) حالانکہ اردو زبان کی گریمر کا بالکل برج بھاشا یا سنسکرت کی گریمر پر دارو مدار ہے۔ عربی و فارسی سے اُس کو صرف اس قدر تعلق ہے کہ دونوں زبان کے اسمار اس میں کثرت سے شامل ہیں

باقی تمام اجزائے کلام جن کے بغیر کسی زبان کی نظم و نثر مفید معنی نہیں ہوسکتی آج برج بھاشا یا سنسکرت کی گریمر سے ماخوذ ہیں (۷) سچ یہ ہے کہ مسلمانوں کا ہندوستان میں رہنا اور سنسکرت یا کم سے کم برج بھاشا سے بے پروا یا متنفر ہونا اس مثل کا مصداق ہے کہ دریا میں رہنا اور مگرمچھ سے بیر"

(۱) اگرچہ زبان اور تعصب میں کوئی کلی اور بیّن مناسبت نہیں ہے کیونکہ تعصب زیادہ تر مذہبی امور سے تعلق رکھتا ہے اور زبان ملکی رواج و تمدن اور طریق معاشرت سے

تعصب ایک بلائے بے درماں ہے جو آدمی کو مذہبی دہن میں ہند کا آزار لگا کر اندھا کر دیتا ہے۔ انصاف اور حق کو پاس نہیں آنے دیتا عقل پر پردہ ڈال دیتا ہے۔ امن و امان سے بیٹھے ہوؤں کو اُکھاڑ پچھاڑ سے بے چین اور ڈانواڈول کر دیتا ہے دینی و دنیوی ترقی کا مانع یہی ہے۔ فساد کی جڑ یہ بے امنی اور بغاوت کی بنیاد یہ دونوں جہاں کے فائدوں سے محروم رکھنے والا یہ غرض تفرقہ انداز۔ تفرقہ پرداز۔ اتفاق کا دشمن۔ منافقت کا بیج اگر ہے تو یہی تعصب ہے

مگر آج کل کے جدید آپہ فرقوں نو تعلیم یافتہ ہندوؤں نے ایک وسیع

زبان کو بھی داخل تعصب کر لیا ہے۔ ورنہ زبان کو مذہب یا قومی تعصب سے کیا واسطہ۔ یہ تو ایک آلہ کاربرآری اور تفہیم و تفہم کا ذریعہ ہے مطلب نکالنے سے کام ہے نہ کہ تخصیص و تشخص اور خاص تعین کر لینے سے اپنے دلو نکا بخار نکالنے اور عنا دپھیلانے سے کوئی سی زبان کیوں نہ ہو جو عام فہم سلیس مہذب مقبول عام وخاص ہو گی وہی زبان ملکی۔ درباری اور شایستہ مانی جائے گی۔

یہ تعصب نہیں تو اور کیا ہے کہ سب کے سب ایک سرے سے پنجے جھاڑ کر غریب اردو کے سر ہو گئے اور اس کی خوبیوں کی طرف سے آنکھوں پر پٹی باندھ لی ہے آٹھ نوسو برس بعد اسے ملکشوں کی زبان سمجھ کر چھوڑنے کے درپے ہونے لگے۔ گورمنٹ کی صلح کل و جمہور پسند طبیعت کو دیکھکر کثرت رائے کا بہانہ نکال ایک عام زبان کے ہوتے ہوئے دوسری جاہلانہ وعامیانہ زبان کو ترجیح دینے لگے علی وشتنہ۔ مہذب و شایستہ خلیق و شیریں زبان سے نفرت اور ناتراشیدہ خودرو زبان سے رغبت ہونے لگی۔ اردو خاص مسلمانوں کی زبان۔ ہندی عام زبان بلکہ خاص ہندوں کی زبان قرار پانے لگی۔ حالانکہ تصانیف کا سلسلہ اردو اخبارات کا سلسلہ اردو خط اردو زبان میں مخالفان زبان پارٹی میں برابر جاری ہے لیکن اس وجہ سے کہ اردو زبان ایک عام زبان ہو گئی ہے اور اس کے بولے بغیر چارہ نہیں ہے اور نہ ایسے جامع الفاظ ہی نظر آتے ہیں۔ گو متعصبانہ زبان یہی کہہ رہی ہے کہ اسے چھوڑ دو اور جلد چھوڑ دو لیکن یہ وہ کمل نہیں جو اسے چھوڑ دے ہاں مسلمان اگر اس رویہ کو دیکھکر تعصب اور ناگواری کا الزام صاحبان ہنود پر لگائیں تو حق بجانب ہیں مگر مسلمانوں پر یہ الزام کسی طرح نہیں لگایا جا سکتا انھوں نے کبھی سلف سے لیکر اب تک کسی زبان کو بھی تعصب کی

نظر سے نہیں دیکھا ایک ہند کیا عرب میں بھی جہاں سے اسلام کی بنیاد پڑی اور جس جگہ کو مذہبی تعصب لازم تھا اسلامی بادشاہوں اور علماء نے غیر ملکوں کی زبان حاصل کی اور وہاں کی علمی کتابوں کا ترجمہ کر کے اپنے ملک و اپنی قوم میں پھیلایا بلکہ بعض موقعوں پر اصلاحیں دیں حاشیئے چڑھائے اور نئے نئے علوم و فنون ایجاد کیے بھلا جن کی قوم نے کبھی حصول علم میں کسی قوم یا کسی ملک کو کفرستان سمجھ کر بھی اس کی زبان اور علوم سے پہلو تہی نہ کی۔ وہ کیونکر سنسکرت اور بھاشا سے انکار کر سکتے ہیں۔ خلفائے عباسیہ کے زمانہ میں انہیں مسلمانوں نے غیر قوموں غیر زبانوں سے علم حاصل کئے اور انہیں اپنی زبان میں لاکر قوم و ملک کو فائدہ پہنچایا بقراط کی یونانی طب منقراط کا علم تہذیب افلاطون کا فلسفہ الٰہی ارسطو کی منطق اور طبیعیات مصر کا علم ہیئت ہند کا علم ہندسہ و نجوم جالی نوس شامی کی تشریح و معالجات ہند کی شطرنج ہت اپدیس یعنی کلیلہ و دمنہ کا عربی فارسی ترجمہ جسے نلارودکی نے نظم کے لباس سے بھی عاری نہ رکھا بعض علوم اسکے علاوہ خود ایجاد کیے چنانچہ علم کیمیا کا موجد عرب ہے گو بعض لوگ کالی کو لا شہنشاہ روم کی طرف بھی اس کو منسوب کردیں مگر شامی کیمیائی رسالے اور ملک شام کا دستور اس پر عملدرآمد صاف ظاہر کر رہا ہے کہ یہ علم ملک شام سے ایجاد ہوا۔

اس بیان سے تو ہم نے یہ ثابت کردیا کہ مسلمانوں کے مذہب اور اور مسلمانوں کی قوم نے تعصب کو ایک زبان کے متعلق کیا کسی کام میں بھی رستہ نہیں دیا۔ اب ہم اس بات کو دکھاتے ہیں کہ ہندوستان میں آکر انھوں نے زبان کے متعلق کونسا تعصب برتا جس کا ہمارے خواجہ صاحب کو افسوس ہے۔

(۲) خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ باوجود سخت ضرورت تقریباً ہزار* برس ہندوستان میں رہنے پر بھی چند مستثنیات کو چھوڑ کر کبھی سنسکرت یا برج بھاشا کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھا اول تو وہ سنسکرت سیکھ کیونکر سکتے تھے جس کی تعلیم خاص برہمنوں سے مخصوص تھی یہاں تک کہ ہند کی اور ہندو قومیں اس علم سے محروم رکھی جاتی تھیں۔ بلکہ اس روشنی کے زمانہ میں بھی وہی تعصب برتا جاتا ہے حال ہی کے ایک واقعہ کا ملاحظہ فرمائیے کلکتہ کے گورنمنٹ کالج میں کسی مسلمان نے سنسکرت زبان لی مگر سرکاری ملازم سنسکرت نے اُسے پڑہانا تھا نہ پڑہایا جس کا ذکر اخباری دنیا تک پہنچا مگر اس کے کان پر جوں تک نہ چلی۔ حالانکہ وہ سرکاری کالج اور سرکاری قواعد کا پابند تھا دوسرے سنسکرت سے انہیں کام ہی کیا پڑتا تھا۔ کیونکہ سنسکرت ملک کی عام زبان نہ جب تھی نہ اب ہے اگر وہ عام زبان ہوتی تو مہاتما بدھ کو پراکرت میں مذہبی احکام اور تلقین کی کیوں ضرورت پڑتی تیسرے یہ کہ جن علموں سے مسلمانوں کو رغبت تھی اول تو وہ اس میں تھے ہی نہیں اور اگر بعض تھے تو انھیں کوئی پڑہانا نہیں چاہتا تھا مسلمان زیادہ تر علم تاریخ کے دلدادہ تھے۔ اس علم میں صرف مہابھارت ایک ایسی کتاب تھی جو اس معرکہ عظیم کے عرصہ دراز گزر جانے پر بید بیاس جی کے اہتمام سے لکھی گئی تھی لیکن اس کی رمزیں اور اس کا اشلوکوں میں بیان انکے قلب کو تسلی نہیں بخشتا تھا بلکہ وہ اس کی اکثر حکایتوں کو خلاف عقل سمجھ کر تاریخی صحت میں شبہ کیا کرتے تھے مگر اس پر بھی بھیس بدلکر ہندو بنکر برہمن کہلا کر انھوں نے کچھ نہ کچھ سنسکرت کا علم بھی حاصل کر ہی لیا اور ایسا کیا کہ بعض تو دیوتا کے درجہ پر مانے جانے لگے مثلاً عبدالرحیم خان

خانخاناں کہ اس کے اشلوک اس زمانہ میں الہامی و مقدس سمجھے جاتے تھے اور اب تک وقعت کی نظر سے دیکھے اور نظیراً ویدانتیوں میں پیش کیے جاتے تھے۔ مسلمان اُسے مسلمان اور ہندو مہاپنڈت مانتے تھے وید کا ترجمہ ویدانت کا ترجمہ۔ بنہ کی جوتش کا ترجمہ علم قیافہ کا ترجمہ۔ گیتا کا ترجمہ۔ نل دمن کا ترجمہ۔ اکثر بعض کتب کا فارسی و عربی زبانوں میں کیا گو ہندو کے واہموں سے بھرا ہوا جوتش بالکل اُنکے عقاید اور مذہبی احکام کے سرتاسر خلاف تھا۔

یہ ثابت ہوگیا ہے کہ آٹھ نو سو برس سے مسلمانوں نے علم سنسکرت اور برج بھاشا سے دلی تعلق پیدا کرلیا تھا بلکہ ہندی بھاشا سے اب تک ویسا ہی تعلق چلا جاتا ہے جس کا ہم آگے چلکر خود شرح بیان کرینگے پہلے سنسکرت اور پرانی بھاکا کی بحث کو اقتباساً لکھکر دکھاتے ہیں جس کا ثبوت ہجری چوتھی صدی کے اخیر سے برابر ملتا چلا آتا ہے۔ سب سے اول امیر سعد اللہ مسعود غزنوی قابل ذکر ہے جو محمود غزنوی کے زمانہ میں موجود تھا اس نے ہندوستان میں رہکر سنسکرت اور یہاں کی پراکت پر اس قدر عبور حاصل کیا کہ ایک ضخیم دیوان اس زمانہ کی ہندی زبان میں لکھ ڈالا جس کی نسبت محمد عوفی اپنے سنہ ھ کے مرتبہ تذکرہ شعرا میں لکھتا ہے کہ اس فاضل اجل کے تین دیوان ہیں ایک عربی۔ ایک فارسی ایک ہندی یہ نہایت خوشگوار اور خوش بیان شاعر تھا امیر خسرو دہلوی اپنی کتاب غرۃ الکمال میں اسی امر کی تصدیق فرماتے اور لکھتے ہیں کہ اس کے یہ تینوں دیوان بڑے ضخیم باحجم اور از حد قابل تعریف ہیں تقی کاشی کا بیان ہے کہ امیر مسعود غزنہ میں پیدا ہوا یہ شخص امراؤ عماید غزنی

میں شمار کیا جاتا تھا۔ بخشی اور میر منشی کے عہدے پر ممتاز تھے۔ بسنائی اس کے واپس آنے کی خوشی اپنے اس ایک شعر میں ختم کرتا ہے ؎

لے عمیدے کہ باز غزلی را ۔۔۔ صورت و سیرت گلستاں کرد

امیر خسرو کے زمانہ میں امیر مسعود کے ہندی بھاکا کے اشعار لوگوں کی زبان پر بہت چڑھے ہوئے تھے ابوریحان بیرونی نے سنسکرت کے جس قدر علوم میں مہارت حاصل کی کوئی دوسرا اس کا ثانی ایسے نازک زمانہ میں میسر نہیں آتا۔ سنسکرت کی جوتش سنسکرت کا فلسفہ کتاب الہند کی تصنیف وغیرہ اس کی لیاقت کی شاہد ہے یہاں تک کہ علمائے یورپ نے بھی اُسے سراہا اور بہت کچھ بڑھایا ہے اس عالم سنسکرت نے ۴۳۰ھ میں اس دنیا سے منہ موڑا۔ اور اپنی بہت بڑی یادگار کو چھوڑا اکبر کے مواحدانہ بھجن گو پوربی بھاکا میں سہی مگر کس قدر متاثر اور رقت انگیز ہیں یہ مسلمانوں میں مسلمان ہندوں میں ہندو کہلاتا تھا۔ محمد جائسی کی پدماوت بھاکا گو اس زمانہ میں عام فہم نہ سہی مگر کیسی لاجواب ہے کہ اس پر ہند کے نامی شعرا اور کبیشرون نے اپنی تصنیف کی عمارت اُٹھائی بلکہ چربہ اُتار کر نام پیدا کیا۔

امیر خسرو کی چوچلے بھری ہندی تصانیف کیسی دل لبھا رہی ہے عبد الرحیم خانخاناں کی متانت بھری سنسکرت پر از الہیات اشلوک کیسا رنگ جما رہے ہیں فیضی فیاضی عبد الجلیل بلگرامی کی سنسکرت دانی جعفر کی ہندی زٹل عبد الرحمان دہلوی کی جمک۔ سنک یعنی کتاب ضلع وجگت۔ دارا شکوہ کی ہندی و سنسکرت کی واقفیت کتاب اکبر اعظم یعنی ترجمہ وید پر ہندی مذہبی معلومات۔ شمس العلما مولوی سید علی بلگرامی

۱؎ افسوس کہ دوسری مئی کو قبل از اشاعت ہماری نظر اُنہیں لگ گئی اور قوم کا ایک ذرہ انتاج باد حوادث سے تاراج ہو گیا

سلمہ اللہ تعالے کا زمانہ حال میں خاص کر علم سنسکرت کا قابل رشک تبحر دیگر چہار دہ زبانوں کا ملکہ۔ کس قدر سنسکرت کی طرف توجہ ہے باوجودیکہ سنسکرت ڈیڈ لینگوایج یعنی مردہ زبان تسلیم کی جاتی ہے اور ہندوستان کے کسی شہر میں بھی بولی نہیں جاتی صرف کتابوں ہی کتابوں میں موجود ہے بلکہ وہ کتابیں بھی کیپ بھر بھر کر جرمنی یا انگلستان چلی گئی ہیں۔ مگر پھر بھی مسلمانوں میں ایک نہ ایک سنسکرت داں نکل ہی آتا ہے۔ اگر جرمنی کو جہاں سنسکرت کی بول چال تک نے بھی عملی صورت اختیار کر رکھی ہے اصل آریا ورت مانا جائے تو کچھ بیجا نہیں۔ سنسکرت کی ضرورت کا تو یہ جواب ہے کہ جن لوگوں کی یہ زبان ہے جب اُن کو ضرورت نہیں تو ہمیں کیا ضرورت ہے بلکہ جو کچھ ہم نے اس زبان میں درک حاصل کیا وہ ہمارے لیے قابل فخر ہے اور ہماری خاص توجہ کے اظہار میں تمغہ معلومات۔ پھر ہم کیونکر نہ مان لیں کہ ہمیں اس کی خاص ضرورت تھی ہندو ہم نہیں بن سکتے۔ پنڈت اور برہمن ہم نہیں کہلائے جا سکتے تھے حکومت اور ریاست یا ملازمت پر اس کا دار مدار نہ تھا۔ اُس زمانہ کے امتحان میں یہ داخل نہ تھی تو بہ مذہبی فائدہ اس میں نہ تھا۔ پھر جو ہم اُسے حاصل کرتے۔ اور اس کی سخت ضرورت سمجھتے تو کس دلیل اور کس اہم غرض سے ہمارے مذہبی عقاید کو اس سے تعلق نہ تھا اور ہمارے ہم رسا نیندہ علوم سے اسے مناسبت تھی۔

ناظرین تمدن براہ کرم خط و کتابت مین
نمبر خریداری ضرور تحریر کرین

دہلی کے پنجابی

گذشتہ سے پیوستہ

اور انکو اپنی ہم پیشہ مولویون کو جو اعتقاد دین انسے اختلاف رکھتے ہین - وہ شوالے
مین لپیٹ کر جوتیان لگانیکا اگر آتا ہی تو بس انکے وارے نیارے ہین - محبوب
الٰہی بیچارا جو اپنے کام مین خوب ہوشیار ہے لیکن ان دینی مسئلون مین بچے سے زیادہ فہم نہین
رکھتا انکے پھندے مین آنکر ایسا پھنس جاتا ہے کہ طرار زبان نیم ملا کو عالم
متبحر تصور کرنے لگتا ہے اور انکے اُکسانے پر اپنے ہی برادری کے لوگون
ٹھیک لکھہ سکین ریش مبارک پر ہاتھہ پھیر کر قال اللہ وقال الرسول
تو کہنا سیکھہ لیتے ہین مگر ما قال ولما قال سمجھنے کی خاک تمیز
نہین ہوتی - یہان اسکی تخصیص کردینی ضرور معلوم ہوتی ہے
کہ یہ تعریف صرف ان مولوی پر صادق آتی ہے جنھون نے علم کی ادھر
کچہری تحصیل کی ہے اور اسکی وجہ سے دماغ مین بدہضمی ہوگئی
ہے جو انکے وعظ ونصیحت مین ظہور لاتی ہے اور ایک خدا اور رسول ماننے
والون کے درمیان سر پھٹول کراتی ہے - شکر کا مقام ہے کہ دہلی مین
ایسے بھی اچھے عالم ہو گذرے ہین اور اب موجود ہین جنکی لیاقت مین کسی
کو کلام نہین ہوسکتا اور جنکی راست بازی - اخلاق احمدی اور صلح
کل مواعظ کی راقم ہذا کے دل مین اتنی ہی قدر ومنزلت ہے جتنی کہ فتنہ
پردازونکی طرف سے نفرت - قاعدہ ہے کہ تھوڑا پانی چھلکتا ہے اور کم
ظرف زیادہ شور مچاتے ہین لہذا محبوب کی توجہ قدرتاً ادھر ہی مبذول

ہوتی ہے اور اسی بلند آہنگ فرقے مین سے کسی ایک کا معتقد ہو جاتا ہے۔ جمعہ کے جمعہ نماز سے فارغ ہو کر کسی مولوی لیسین یا مولوی لاریب فیہ کے وعظ مین جاتا ہے مگر یہ شکر ہے کہ اونکے سامنے اعمال حسنہ کی تقلید نہین کرتا ورنہ بچاری بیوی کی جان پر آفت ٹوٹے کیونکہ ان مولویصاحب کا قرآن و حدیث پر اسقدر عمل ہے کہ ایک بیوی پر اکتفا نہین کی بلکہ پوری ایک تھائی ورجن عورتون کے ساتھ عقد شرعی باندھکر خدا کے کلام کی فرمانبرداری کی ہے اور اگرچہ خدا نے جو ہماری کمزوریون سے بخوبی واقف ہے۔ اگر تم سے انصاف نہو سکے تو فقط ایک کرو لیکن آنجناب مولویصاحب کو اپنی ذات پر کامل اعتماد ہے کہ اچھی طرح چارون کے درمیان عدل کر سکتے ہین چنانچہ جب بیویون کے کپڑے بنوانے ہوتے ہین تو ایک چھینٹ کا تھان آجاتا ہے جس کے چارون کے پایجامے بنجاتے ہین اسی طرح ایک ہی وضع کے ڈوپٹے وغیرہ لادئے جاتے ہین تاکہ چارون ایک وردی مین نظر آئین اور اگر اسلامی حکومت ہوتی اور محتسب آنکر دیکھتا تو ایک نظر مین مولوی صاحب کے انصاف کی حقیقت معلوم ہو جاتی۔ مگر مولوی صاحب کو خبر نہین کہ انسان ضعیف البنیان کے لئے دو عورتون مین برابر کا سلوک کرنا محال ہے کیا کہ اکٹھی چار اور یکسان کپڑا پہنانا یا کھانا کھلانا ہی فقط انصاف نہین بلکہ انسان کا طبعی رجحان بھی جو صرف ایک کی طرف ہو سکتا ہے دنیا مین کوئی معنی رکھتا ہے اور شرع کے احاطہ سے باہر نہین بہرحال خیر النسا کی خوش قسمتی ہے کہ شیخ محبوب الٰہی مولوی

سو بیبیاصاحب کے قدم بر قدم نہین چلتے ورنہ اُس بچاری بے گناہ کی زندگی خاک مین ملجائے اور محبوب چونکہ ہر لحاظ سے اپنی برادری کا قایم مقام ہے اسلئے یہ کہنے کی ضرورت نہین کہ پنجابیون مین بہت کم سننے کا اتفاق ہوتا ہے کہ فلان کی دو یا تین بیویان ہین - یہ لوگ عموماً اپنی تنگی وبحالی کی صرف ایک شریک پر قناعت کرتے ہین اور اپنی زندگی امن و آسایش کے ساتھہ گذار دیتے ہین - محبوب اگرچہ سیدھا سادہ لیکن سچا اور پکا مسلمان ہوتا ہے اور اپنے فرایض مذہبی کی ادائیگی کے لئے ہمیشہ مستعد رہتا ہے علاوہ صاحب صوم والصلواۃ ہونے کے اپنی حیثیت کے موافق ذکواۃ دینے مین تنگدلی مطلق نہین برتتا بلکہ دہلی کے مسلمانون مین جو خیرات دیجاتی ہے اُس کا بیشتر حصہ پنجابیون کے ہان سے آتا ہے اور اگرچہ تمدنی پہلو سے خیرات و ذکواۃ کے معاملے مین محبوب کی دریا دلی از حد قابل اعتراض ہے لیکن قصور اُسکی ذات کا نہین بلکہ تمدنی اصولون سے جہالت کا سبب ہے - وہ فقط یہ جانتا ہے کہ طریقت اسلام مین سائل کا سوال رد کرنا بُری بات ہے اسلئے اپنے ضمیر کے اطمینان کی خاطر وہ تقریباً ہر ایک سائل کو بلا استحقاق دریافت کئے اپنی توفیق کے مطابق کچھہ نہ کچھہ دیدیتا ہے - چنانچہ جمعرات کے جمعرات کئی آنوںکی کوڑیان منگوا کر دکان پر رکھ لیتا ہے اور جو فقیر یا فقیرنی آتی ہے اُس کو مٹھی بھر کر دیتا جاتا ہے لیکن اگر اُس کو یہ یقین ہوجاے کہ جن پر ترس کھا کر وہ یہ چاہتا ہے کہ اُن کو فیض

پونہچے اپنی بیجا خیرات سے اُنہی کے حق مین کانٹے بو رہا ہے تو وثوق کے ساتھہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہرگز ایسی حماقت نکرے گا محبوب کے دلمین فیض رسانی کی حس کا موجود ہونا بذات خود ایک نیک فال ہے اور جس قدر اُسکے مزاج مین کرم اور خدا ترسی ہے اگر اسی نسبت سے جا و بیجا خیرات مین فرق معلوم کرنے کی تمیز اور بیجا خیرات کرنے کا سلیقہ بھی ہو تو ہندی مسلمان کی تعلیم کے لئے ہر قصبہ اور شہر مین نہ فقط صنعت و حرفت کے صدہا مدارس دیکھنے مین آئینگے بلکہ علیگڈھ جیسے چار اور کولج قلیل مدت مین کھڑے ہو سکتے ہین۔ محبوب الٰہی کی برادری کو یہ سنکر شائد تعجب ہوگا کہ خیرات کے موجودہ رواج کے موافق جتنا زیادہ اپنی کمائی مین سے نکالکر وہ فقیرون اور مسکینون کو بانٹتی ہین تاکہ اُنکی حالت بہتر ہو اتنا ہی زیادہ اُنمین افلاس اور گداگری بڑھتی جاتی ہے اور جہان مسلمانون کے تمام افلاس کے اور بہت سے اسباب ہین وہان یہ بیجا خیرات بھی ایک بڑا سبب ہے کاش کہ محبوب الٰہی کے لوح قلب پر ملکی کفایت نہین بلکہ عام فہمی کا یہ چھوٹا سا اصول منقش ہو جائے کہ ایک تندرست اور صحیح و سالم سائل کا ایک یا دو وقت پیٹ بھرنے سے یہ کہین زیادہ ثواب کا کام اور بدرجہا بہتر خیرات ہے کہ اُسکے لئے ایسے سامان مہیا کئے جائین جن سے وہ خود محنت کرکے اپنا پیٹ آپ بھر سکے اور جہانتک ممکن ہو اُس مین بھیک مانگنے کی عادت اور دوسرون کی کمائی مین للّٰہ ساجھا کرنے کی بد خصلت نکال

دیجاے۔ سوسائیٹی کے حق مین یہ بے جا خیرات اسقدر مضر ہے کہ جتنی دولت اہل ہند کی اس سیغے مین خرچ ہوتی ہے اگر وہ سب کی سب سمندر کی تہ مین ڈالدیجائے اور پھر نکالنے کا نام نہ لیا جائے تو سوسائٹی پر اُس کا اثر زیادہ مفید ہوگا بہ نسبت اس کے کہ اُس کسی ذریعہ سے کٹے اور تندرست حصہ آبادی کو بھیک منگا بنایا جائے جتنی دولت سمندر کی تہ مین جائیگی وہ ضایع جائیگی لیکن اوس سے کم ازکم یہ تو فائدہ ہوگا کہ اپنے ہموطنون اور ہمجنسون کے اخلاق پر بُرا اثر نہ پڑے گا۔ لیکن اگر اسی کو آنکھین بند کر کے بانٹا جائے گا تو اُس سے کاہلون کو بھیک مانگنے اور اس طرح ان کا اخلاق خراب کرنے کی طرف زبردستی تحریک دیجائیگی جس کا بُرا نتیجہ کوئی سلیم الطبع آدمی محسوس کرنے مین قاصر نہین رہسکتا۔ موجودہ زمانے مین ہر ایک ترقی یافتہ اور مہذب ملک مین خیرات کے طریقے یہ ہین کہ یتیم خانے۔ صنعت و حرفت کے مدارس غریب ہوگان کے رہنے کے گھر۔ بڈھون اپاہجون اور مسکینون کیلئے مکانات تعمیر کئے جاتے ہین جن کا انتظام ایک کمیٹی کے سپرد ہوتا ہے اور جہان صرف مستحقین کو رہنے کی اجازت ملتی ہے یہ قاعدہ ہرگز نہین کہ جس نے ہاتھ پھیلایا اوس کی ہتیلی پر پیسہ رکھ دیا۔ انگلستان مین اس طرح خیرات مانگنی جرم ہے اسیطرح اور خیرات دینی نہایت بُری بات سمجھی جاتی ہے اور معلوم ہونے پر دینے والے کو فہمائش کی جاتی ہے

اور لینے والے کو سخت سزا ملتی ہے۔ لہذا محبوب الٰہی کو بھی مناسب ہے کہ اپنی برادری کی خیرات کا انھی اصولون پر انتظام کرے اور جس طرح اپنے بنج بیوپار مین عقلمندی اور سلیقے سے کام لیتا ہے اسی طرح اپنی ذکواۃ و خیرات مین بھی یہ کوشش نہ کرے کہ خیرات کا مقصد باحسن وجوہ حاصل ہو بلکہ اس معاملے مین ہم کو غیر ملکونکی تقلید کی بھی کچھ ضرورت نہین اگر ہم اپنے اسلامی صیغہ بیت المال کے اصولون پر کاربند ہین اور اوس کے مقاصد کو مدنظر رکھین تو خیرات و زکواۃ کا اصل مدعا حاصل ہو جائیگا علاوہ ممیز ہونے کے محبوب کی تمنائے دلی یہ ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح کاروبار سے تھوڑی مدت کے لئے پیچھا چھوڑا کر مکہ جائے اور حج کرکے مدینہ شریف کی زیارت سے مستفیض ہو چنانچہ جب اس کی عمر چالیس اور پچاس کے پیٹے مین ہوتی ہے تو رخت سفر باندھ اور خدا کی ذات پر بھروسہ کر حج کے لئے روانہ ہو جاتا ہے اور وہان سے واپس آنکر حاجی محبوب الٰہی کے نام سے پکارا جاتا ہے حج کے سفر مین راستے کی جو ناگفتہ بہ تکالیف اس کو سہنی پڑتی ہین مذہبی فرض کی ادائیگی کا جوش ان سب کا خیال دل سے بھلا دیتا ہے۔ نام سے پہلے لفظ حاجی کا استعمال ہونا عموماً حاجی صاحب کی دیانت راست گوئی اور ایمان پر دلالت کرتا ہے اور لوگ اُن کی عزت کرتے ہین اس زمانے مین حاجی محبوب الٰہی دو تین بیٹون اور دو ایک بیٹیون کے باپ ہوتے ہین۔ بڑا

بٹیا باپ کی دکان پر کام سیکھتا ہے یا اگر باپ کی مرضی ہوئی تو کام سکھانے کی غرض سے اوس کو کسی اور رشتہ دار کی دکان پر بٹھا دیا جاتا ہے اور جب کام سیکھ جاتا ہے تو باپ کی دکان پر آن کر کاروبار اپنے ہاتھوں مین لیتا ہے مگر حاجی محبوب الٰہی دکان سے اپنا تعلق بالکل علیحدہ نہین کر لیتے بلکہ جب تک دم مین دم باقی رہتا ہے دکان پر آئے چلے جاتے ہین اور ضعیفی کے زمانے مین جیسا کہ اہل فرنگ کا قاعدہ ہے کہ خوب کما دہما کر تجارتی معاملات سے بالکل قطع تعلق کر لیتے ہین حاجی صاحب کے دل مین کبھی ایسا کرنے کا خیال بھی نہین آتا۔ شاید ہی کوئی پنجابی سوداگر بڑھاپے مین گوشہ نشینی اختیار کرتا ہو ورنہ بالعموم سفید ریش حاجی محبوب الٰہی شام کو اپنی دکان پر حساب کتاب لکھتے ہوئے یا منشی کو ہدایتین کرتے ہوئے نظر آتے ہین البتہ اس عہد مین اُنکی توجہ زیادہ تر نماز روزے اور وظیفے وظایف پڑھنے کی طرف مبذول رہتی ہے اور وعظ و نصیحت سننے جانا ایک معمول قرار پا جاتا ہے نیز خدا رسیدہ بزرگون اور کامل درویشون کی صحبت کی متلاشی رہتے ہین اور اسلامی تلقین اور قناعت کے ساتھہ حکم ربی کا انتظار کرتے رہتے ہین۔ اسی زمانے مین اِن کی اولاد مین لڑکا لڑکی اس قابل ہو جاتے ہین کہ اُن کی شادی کر دیجائے چنانچہ بڑی لڑکی کی شادی نہایت شان و شوکت کے ساتھہ رچائی جاتی ہے اور بڑے لڑکے کے نکاح کے موقع پر نہ صرف برادری کے لوگ جمع ہوتے ہین بلکہ دہلی کے اکثر امرا اور رؤسا بھی شریک ہو کر اس بات کی شہادت دیتے ہین

کہ حاجی شہر کے باحثیت اور سربرآوردہ شخص ہین اور نہایت وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہین علی ہذا اپنی برادری کی پنچایت مین حاجی صاحب کی بڑی عزت ہوتی ہے اور اونکی رائے صائب اور قابل قدر سمجھی جاتی ہے۔ علاوہ ازین موجودہ زمانے مین بہت سی ایسی ذمہ داریون کا بوجہ امیر آدمی کے سر پر رکھ دیا جاتا ہے جن سے اُسکو نیفسہ کوئی علاقہ نہین ہوتا لیکن صرف اس وجہ سے کہ وہ صاحب جائداد اور دولتمند ہے اکثر ملکی اور قومی معاملات کی نگہداشت اُسکے سپرد کر دیجاتی ہے مثلاً حاجی محبوب الٰہی کو اپنے شہر کے مسلمانونکی پبلک ضروریات اور خیالات کے اظہار کے لئے بار بار ڈپٹی کمشنر سے ملنا پڑتا ہے یا جب کبھی سرکار کو اہل اسلام کے متعلق کسی ملکی مرحلہ مین مشورہ طلب کرنا ہوتا ہے تو حاجی صاحب کی رائے بھی طلب کی جاتی ہے اسلئے اونکو رائے دینے سے قبل اُسکے متعلق کچھہ نہ کچھ واقفیت پیدا کرنی ضرور ہے اور خواہ نخواہ ایسے پبلک معاملات مین دلچسپی لینی پڑتی ہے۔ علی ہذا مینوسپل کمیٹی کی ممبری یا اسی قسم کے اور کسی قائم مقامی عہدہ کے لئے کوشش کرنا اُنکے لئے ایک پبلک فرض قرار پاجاتا ہے اپنے علم اور اپنی سمجھہ و تجربے کے موافق حاجی صاحب کی بھی کوشش ہوتی ہے کہ سرکار کی نگاہ مین مسلمانونکی وفاداری ثابت ہو اور اُنکی عزت بڑھے اور ضمناً اپنا ذاتی رتبہ بھی زیادہ ہو ایسے امور مین بھی جو سرکار سے تعلق نہین رکھتے بلکہ نرے قومی ہوتے ہین مثلاً اسلامی مدارس کے لئے چندہ اور رفاہ عام کے کامون کو

لئے مالی امداد وغیرہ وہ اپنے حتے المقدور اعانت فرماتے رہتے ہین۔حق یہ ہے کہ دہلی مین جو ذرا ظہور مسلمانون کی شان باقی رہگئی ہے وہ حاجی محبوب الٰہی جیسے لوگون اور اُنکی برادری کے بدولت ہے اور نہ غدر کے بعد دہلی کے قدیم مسلمان خاندانون پر جو آفتین نازل ہوئین اُنہون نے اتنا سکت انہین چھوڑا کہ پس ماندگان اپنا پہلا سا کروفر برقرار رکھ سکتے۔اُن کو زمانے نے اتنی بھی مہلت ندی کہ وہ اپنے ہوش و حواس بجا کرکے یہ تو دیکھنے کے قابل ہوتے کہ غدر کے طوفان بے تمیزی نے زوال کے تھپیڑے دیکران کو کس لق و دق اور ویران ساحل پر پھینکدیا تھا اور اُس نا داری اور مصیبت کی حالت مین اُنکو کیا کرنا چاہئے تھا اُنکے رہنے کو مکان اور سر رکھنے کو تکیہ نہ تھا لیکن تاہنوز اُنکی آنکھون سے محلون اور چھپر کھٹون کے خواب بالکل غائب نہوتے تھے۔اچانک اور ناقابل برداشت تکالیف نے اُنکی کمر توڑ دی تھی لیکن ابھی تک صدیون کا پروردہ افتخار مزاجون سے معدوم نہ ہوا تھا۔حالت کیسی ہی ابتر تھی۔مگر پدرم سلطاں بود میں محو تھے.....

.....رسی جل چکی تھی مگر بل نہ گیا تھا۔شاہی عظمت کے جلوے یکایک نظرون سے پنہان ہوگئے تھے مگر آنکھوںمین ابھی اُن کا خمار باقی تھا شاہی زمانے کی فارغ البالی نے فراخ دستی کی ایسی عادت ڈالی تھی کہ نہوت پر بھی اُن کو کفایت کا سلیقہ نہ سوجھا اور اپنے تئین فقیر بنا بیٹھے۔ایسے وقت ضرورت تھی کہ علم رہبر بنے لیکن بدقسمتی سے جہالت نے اُنگلی پکڑی۔چاہئے تھا کہ ہوشیاری

کو لونڈی بنائین مگر خود غفلت کے حلقہ بگوش غلام ہوئے غرض
یہہ کہ فلک کجرفتار کے ستمون اور کچھہ اپنے ہاتھون کے کرتوتون
سے اپنی رہی سہی پونجی کو ملیامیٹ کرکے آنکو غیرون کا دست نگر
ہونا پڑا۔ مگر خدا کو کچھہ بہتری منظور تھی جو اُس نے دہلی مین مسلمانون کی
ڈوبتی ہوئی ناؤ کو پار لگانے کے واسطے پنجابی ملاحون کے ہاتھہ مین
تجارت کے چپّو دیکر عین وقت پر بھیجدیا اور اُنھون نے آنکر بیڑا پار
لگایا۔ حاجی محبوب الٰہی بھی انھی ملاحون مین سے ایک ہین اور باوجود
کثرت اشغال کے خاموشی کے ساتھہ قوم کی جو خدمت بن پڑتی ہے
اپنی تحصیل وفہم کے مطابق کرتے رہتے ہین۔ جو جو زمانہ گذرتا جاتا
ہے حاجی جی ضعیف اور کمزور ہوتے جاتے ہین لیکن قوائے
جسمانی کا ضعف اُنکی قلبی سکون اور اطمینان مین ذرا خلل نہین
ڈالتا۔ اُنکا دل ہمیشہ اس تسکین وہ خیال سے باغ باغ رہتا ہے
کہ مین نے خدا کے فضل سے تجارت مین نام پیدا کیا ضرورت
سے زیادہ کمایا۔ حتے المقدور خدا کی فرمانبرداری اور فرض کی
ادائگی مین پہلوتہی نہین۔ دولت وحشمت کے ساتھہ اولاد کی
تمنا بھی پوری ہوئی۔ اولاد کی اولاد بھی دیکھنی نصیب ہوئی۔ اپنے
ہم مجلسون کی خدمت اور حج کی توفیق بھی اُس نے اپنی رحمت
سے مجھہ ناچیز کو عطا فرمائی۔ غرض دنیا مین آن کر اپنے
مولا کے پاس کسی طرح ناخوش واپس نہ جاون گا۔
ان ان متسکن خیالات نے اون کے دلمین ایسی تقویت دی تھی کہ وہ
ہمیشہ لبشاش اور خوش خوش نظر آتے اور نماز پنجگانہ کبھی

تضانہ کرتے بلکہ ہمت ہوتی تو تہجد اور اشراق بھی پڑھ لیا کرتے ایک روز عشا کی نماز پڑھکر بستر پر لیٹے کہ کچھ بدن مین حرارت سی معلوم ہوئی۔ ہاتھہ پاؤن ٹوٹنے لگے۔ تھوڑی دیر مین سردی سے بخار چڑھ آیا اور ساری رات ہاے ہاے کرتے آنکھون مین کٹی صبح ہوتے حکیم جی کو بلایا گیا اُنھون نے نبض دیکھکر نسخہ لکھدیا۔ تین روز تک اُن کا معالجہ ہوتا رہا لیکن جب کچھ افاقہ ہوتا نہ معلوم ہوا تو دہلی کے مشہور ڈاکٹرون مین سے ایک کو بلا کر دکھایا۔ اُس نے کہا کہ پہلے سے مجھکو دکھانا تھا اب اُمید کیا باقی رہا ہے مگر تشفی کے طور پر شیشی مین دوائی دے دی جمعرات کی شب کو دس بجے کے قریب حاجی صاحب کی حالت بہت خراب ہوگئی اشارے سے سب بیٹے بیٹیونکو بلانے کے لئے کہا جب سب جمع ہوگئے تو لڑکھڑاتی ہوئی زبان مین یہ الفاظ کہے "تم سب کو خدا کو سونپا اور پھر شہادت کی اُنگلی اُٹھا کر کلمہ پڑھا جس کے بعد تین ہچکیان آئین اور ۶۵ برس کی عمر مین شیخ محبوب الٰہی کا مرغ روح جسم خاکی سے پرواز کرگیا۔ اِنا للّٰہ واِنا الیہ راجعون۔

ع

خدا بخشے بہت سی خوبیان تھین مرنیوالے

گذارش

خریداران تمدن خط و کتابت مین نمبر خریداری کا ضرور درج کرین

دارِ فنا

اے دنرات گنوانے والے — وقت کو مفت اڑانے والے

ہوتے آئے ہین اس دنیا مین — اکثر مال خزانے والے

دارا جم اسکندر کیا تھے — آنے والے جانے والے

کھو بیٹھے اب نام و نشان تک — شوکت شان دکھانے والے

خاک ہوے خود خاک مین مل کر — خاک سے بچکر جانے والے

ہوگئے اب روباہ سے کمتر — شیر سے آنکھ ملانے والے

کٹ گئے اکثر موسم گل مین — نخل جو تھے پھل لانے والے

اکثر چہرے نازک نازک — گل کی طرح کمھلانے والے

ہر دم زلف بنانے والے — آئینے والے شانے والے

رشک پری کہلانے والے — حور سے ناز اٹھوانے والے

عطر پہ عطر لگانے والے — جوبن پر اترانے والے

چل کے قیامت ڈھانے والے — حشر کے چال دکھانے والے

دیدۂ تر مین سمانے والے — پانی مین آگ لگانے والے

کوئی نہ ٹھہرا وقت جب آیا — چل دئے آخر جانے والے

جو نہ گئے وہ جا کے رہینگے — سب ہین مسافر خانے والے

دولت ثروت عزت حشمت — چھوڑ گئے سب جانے والے

ساتھ بہت کچھ لے گئے لیکن — کام مین وقت لگانے والے

تج بیٹھے جو عمر کی دولت — اب نہین ہرگز پانے والے

سوسائیٹی کی اندرونی حالت

جو ماں کے پیٹ مین عناصر کی کیمیاوی ترکیب پا چکنے کی دلیل، اور جس کا مرکز سفل دائرۂ خواہشات باطلہ سے بہت دور ہو، ! خون کا ارتباط جہاں روح کیلئے متاثر کن ہے وہان جسمی حیات کی مربوطی سے الگ بھی ہے، محبت پیارے بہن بھائی کی محبت کو فرشتے ! حور ونکی عصمت سے تعبیر کرتے ہین، ۔

دوسری طرف اُس وجود کی محبت جسکو دل پیار کرے مگر سمجھ اور آفت برپا کن محبت کے پاک جذبے جو سنت اللہ، ورسول سے متاثر ہین اُس محبت سے بالکل علیحدہ ہین جو بہن سے ہوتی ہی تجھے خدانے وہ کشش عطا کی ہے جو عقل وہوش برہم کن ہے، دل کا غریب ہے، اگر عقل سمجھاتی ہے، اک دن رس بیاہی صورت کو تیری زندگی کی عشرت مین شرکت کا موقع ملے گا، !! ہنگامۂ اشتیاق قربت ! ہجوم خیالات شوق ! فیصلہ دیتے ہین، کہ بس آفتاب کی زندگی کا "خود" جلیبہ ہے، ! ۔

جلیبہ .... جلیبہ .... رونے کی آواز ....

.... اچھا ضبط تا کجا ؟ جب یارا ہی نہین، لاؤ آج اپنے درد دل، اپنے حال زبون کی اطلاع جلیبہ کو کر دون، ....

.... مگر جلیبہ شریف لڑکی مجھے کیا کہیگی ؟ .... کیا سمجھیگی ؟

بندۂ ہوس، خواہشات مذمومہ کا غلام!،
آہ...... مرجاؤن......
مگر نہین لکھون گا، اور ضرور لکھون...... گا
دوات قلم اور کاغذ اوٹھا کر رائٹنگ میز پر کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا،

آفتاب منزل۔

رجب ۲۳ سنہ ۱۳ھ

بہتے ہین اشک دیکھو آج ہمارے سوز الفت سے
بجھے غافل چراغ گرمی رخسار دامن سے

جبیبہ!، امیری اچھی!،......... جبیبہ!!

آفتاب افق مغرب سے طلوع ہوگا، مہتاب گوشۂ مشرق مین ساکن گزین ہے، فلک پر انجم متحیر ہوکر فرط اضطراب سے گر پڑینگے!، زمین پھٹ جائیگی!!

بے ستون آسمان کا شامیانہ گر پڑے گا!!......

جبیبہ!، جس آفتاب کو تم پیارا، عقلمند بھائی سمجھتی تھین، وہ بیوقوت اور جنونی ہوگیا! جس آفتاب کو تم اپنا کہتی تھین وہ دشمنون مین گھر گیا!!......

جبیبہ کو کیا لکھون، اور کیونکر لکھون!......

...... جبیبہ تمھین بتاؤن مین دبلا کیون ہوتا جاتا ہون، زرد کیون ہوگیا؟ ایف۔ اے کا امتحان دے کر تعلیم کیون چھوڑ دی، ؟

سنو ایک پیاری صورت، اور ایک خوبصورت لڑکی نے دل چھین لیا!! اوس کی نشیلی، اور مست آنکھون نے خون کے آنسو رولا دیے!! اوس کے لنبے لنبے سیاہ بالون نے دلمین زنجیرین ڈال دین ہین

آہ اوس کے سراپا نے دل و جان پر قبضہ کر لیا !!

...... حبیبہ تم میری حالت پر رو دو اور زاری کرو، تمہارے اچھے ...... پر مصیبت پڑ گئی، کیا تم ایسے کا پتہ پوچھو گی، اور اُس سے میرا بدلہ لو گی، .... ضرور لو گی، ....

حبیبہ میری پریشانیوں کی بانی !! میری دیوانی حالت بنا دینے والی کون ہے ...... آہ حبیبہ وہ تم ہو ! ....

آہ ! خفا نہ ہونا، ناراض نہ ہونا ! مین لاجرم ہون، ان سب آفتون کا سبب تمہارا حسن بے مثل، اور تمہاری موہنی صورت ہے !

مینے ضبط کیا، دل کو سمجھایا، مگر حبیبہ میری محبوبہ ! مین آہ مجبور ہو گیا، مین بے بس ہو گیا۔ آہ سات برس تک تمہاری پرستش کی مگر تم کو خبر نہ ہونے دی !! اب چاہا دم گھونٹ لون مگر قابو نہ رہا ! حبیبہ ہم تم جب کمسن تھے اوسی وقت سے مجھے صورت اور ادا مین دل کو بھاتی تہین ! لیکن تمہین اب دو برس کا واقعہ یاد ہے ؟ کہ بدھ کی ایک روز شام کو مین اتفاقیہ تمہارے ہان گیا تہا، اور تم غالباً غسل کر کے فارغ ہوئین تھین اور اپنی سنگار میز کے شیشے کے محاذ مین کرسی پر بیٹھی بالون کی نمی تولیے سے خشک کر رہی تھین " !!

بجلیان گر جاتین اُس نامبارک گھڑی پر کہ مین کیون جاتا، تمہاری والدہ خدا جانے کہان مہمان گئی ہوئین تھین اور تمہاری ہمشیرہ بڑے دالان مین تھین، اونکو سلام کر کے مین چپکے چپکے عقب سے ہو کر تمہارے پیچھے پہونچ گیا، اور ڈرا دیا ...... تم ڈر گئین، ہائے اور سہم کے جھٹ مجھے چمٹ گئین ،، دفعتاً تم بے خودی دور ہوئی اور

فغانِ شوق

اس سلسلہ کا پہلا حصہ زیرِ عنوان "داستانِ شوق" ادیب بابت ستمبر ۱۹۱۱ء میں شایع ہو چکا ہے

(حسن علی شوق)

نالہ جز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں
ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں (غالب علیہ الرحمۃ)

تسخیرِ حسنِ گل سے قفس ہے مکانِ شوق — پہلو میں میرے کیسے نہ ہو آشیانِ شوق

یارب یہ کیا فریب نظر آہ کہ ہائے ہائے — بلبل کا نالہ سمجھا ہے طرزِ فغانِ شوق

غنچہ سے شاد کام ہو منقارِ عندلیب — مجھ سے مگر جدا رہے تو جسم و جانِ شوق

حیرت فزائے دہر میں محوِ جمالِ یار — لب بستہ مثل غنچہ کے یوں زبانِ شوق

وارفتگیِ شوق کا رکھا ہے عشق نام — بیتابیِ فراق کو سمجھو نشانِ شوق

بڑھتا ہے شوق دل کو تو کہتا ہے دل فلک ہے شوخ! — مژگانِ یار تیر ہیں ابرو کمانِ شوق

موجِ محیط آب ہے مرآۃ جذبِ دل — اے کاش ساز آہ سے سنتے بیانِ شوق

کیسا حجاب ناز ہی جب پرکھیاں ہو تم — پردہ نہ دل کو سمجھو یہ ہے رازدانِ شوق

بدقسمتی سے در خورِ محفل ہیں تیرے غیر — افسوس کس کو سمجھا ہے نہ سب مکانِ شوق

جب کی ہی وہ ادا تو کہتے زہے نصیب — پھر کیوں ممانعت ہی رہے سست زبانِ شوق

ہو ابتدا جو عشق کی اُن سے یقیں نہیں — ورنہ جفائے یار میں کیوں دشمنانِ شوق

یہ ابتدائے جور ہے آگے کو دیکھنا — قسمت میں ہے ہمارے غم و جاودانِ شوق

بیتاب میر نالوں سے ہوتے نہیں ہیں وہ — ظاہر کریں اثر ہیں یہ آہ و فغانِ شوق

ہجراں نصیب کی شبِ لیلائے زلفِ یار — ہاں خندہ زیرِ لب ہی ہے برقِ تپانِ شوق

محشر جو اٹھ گئی ہے پلیلا ہے دل جگر — ایمان ہے کہ آنکھ لگی تیری جانِ شوق

موجِ سراب یعنی ہیں باطل تخیلات — خواب و وصال جو ہے نظارگیانِ شوق

"یہ مضمون صفحہ ۴۸ کے بعد سے ہے۔

نہ فارسی۔ البتہ سکندر لودہی کے زمانہ میں ملازمت کے خیال سے کایستھوں نے دیگر اقوام ہند کے برخلاف ٹوٹی پھوٹی فارسی اختیار کرنے پر کمر باندھی۔ گو وہ لہجہ وہ طرز تحریر آنی مشکل تھی مگر پھر بھی ہندی لہجہ آمیز فارسی لکھنے پڑھنے لگے انکی دیکھا دیکھی دیگر اقوام نے بھی کسی قدر فارسی کی طرف توجہ کی جس کی وجہ شاہی دفاتر کا فارسی زبان میں ہونا اور شاہان وقت۔ امرائے دربار۔ بلکہ سپاہ فاتح کا فارسی زبان میں متکلم ہونا مانا جا سکتا ہے ان لوگوں نے بعض کتابیں بھی اخیر زمانہ میں آکر لکھیں۔ مثلاً ٹیک چند کھتری نے بہار عجم۔ منشی ہرگوپال تفتہ نے فارسی دیوان مادہو رام نے فارسی انشائے مادہو رام۔ نوتند رائے نے فارسی دستور الصبیان وغیرہ وغیرہ لیکن مسلمانوں کی ہندی و سنسکرت تصنیف اس سے بدرجہا زیادہ ہیں اور وہ اس امر پر ناز کر سکتے ہیں کہ ہم نے اور ہمارے بادشاہوں نے سنسکرت تو سنسکرت ہندی بھاشا کو اپنی زبان کا ایک بڑا جزو قرار دیکر اسی کی گریمر کے موافق اپنی زبان کو کر لیا۔ صرف ضروری اسمار عربی یا فارسی خواہ ترکی قائم رکھے۔ رسمیں ہم نے انکی اختیار کیں باوجود شرک و بدعت ان سے ہم باز نہ آئے۔ علمار دین کی مخالفت کو ہم نے پرے بٹھایا مگر ہنود کے تہواروں تک کو اپنا تہوار سمجھ کر شرکت سے باز نہ آئے۔ بیوہ کا نکاح ثانی ہم نے ممنوع سمجھا۔ سفر کے مہورت پر ہم عامل ہوئے۔ ایام حمل کی رسمیں جیسے۔ ستوانسا۔ نوماسا۔ چھٹی۔ تارے دیکھنا چلے وغیرہ ہماری عورتوں نے اختیار کر لیں۔ چاگیریاں ہمارے ہاں گائی گئیں۔ جچا رانی ہمارے یہاں کی زچہ کہلائی جنم پترے ہم نے بنوائے شادی کی رسمیں ہماری قوم نے مساوی رکھیں۔ مائیوں سے لیکر وداع اور چوتھی تک کی ہندی رسمیں۔ ٹوٹے سیٹھنیں ہمارے ہاں جاری ہوئیں۔ ابٹنا

ہمارے ہاں ملا گیا۔ سہاگ گھوڑیاں گائی گئیں۔ سہرا ہمارے یہاں باندھا
گیا۔ میت کی رسموں میں تیجے کا رواج ہمارے ہاں دیا گیا۔ سوگ ہمارے
دل تا یز رکھ گیا۔ اور جہاں تک کہ ان تقریبوں کے گیت اور پستک
گیت ہندی بھاکا میں ادا ہوتا ہوا دیکھا جس وقت ہم نے اپنی کتاب سوم
دہلی رائے بہادر ماسٹر ساگر چند صاحب کی خدمت میں پیش کی تو انھوں
نے فرمایا کہ یہ تو تمام ہندوؤں کی رسمیں ہیں ہمارا خیال کیا بلکہ یقین تھا کہ ہماری
اور مسلمانوں کی رسمیں بالکل مخالف ہوں گی۔ آج سے ہمارا شبہ بھی رفع
ہوگیا۔

قلعۂ معلی کی رسموں کو دیکھیں تو آپ اور بھی زیادہ تعجب کریں۔ ہاں تو کنگنا تک
باندھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ بادشاہ خود باندھتے تھے۔ ہندی تہوار ان پر
انعام واکرام دیا جاتا تھا۔ آپ صرف بزم آخر کو ملاحظہ فرما کر دہلی کے دو اخیر
بادشاہوں کی رسموں سے تطابق فرما سکتے ہیں کہ ہندی زبان اور ہندی
رسوم کا کہاں تک برتاؤ تھا۔ رکھنگہ۔ سلونو۔ دسہرہ۔ دیوالی ہولی ایسا کونسا
تہوار تھا جو نہیں منایا جاتا تھا۔

خاص بھاکا۔ ادق بھاکا سنسکرت سے بھری ہوئی بھاکا۔ ادق
بھاکا سنسکرت سے بھری ہوئی بھاکا ہمارے مسلمان بادشاہوں نے بولی
یہ سب جانتے ہیں کہ اکبر نے سنسکرت سے قابل قدر کتابوں کے ترجمے
کرائے۔ مثلاً جوگ بششٹ کا ترجمہ جس میں مواعظ حسنہ ملا نجم وغیرہ کا
فرملی امینی سے کرایا۔ مہابھارت ونل دمن کا فیضی سے سنگھاسن بتیسی
جاتک۔ اتھرون وید جیوتہ جیون امائن۔ لیلاوتی ہرنبس۔ جوتش
وغیرہ وغیرہ کا دیگر علماء سے ہوا ہے۔ مگر بھاکا زبان جو وہ بولی اور ۔ ۔ ے کا

شعب خیلہ گرد گرد بت نیز اشوک بنائے کہ ہندوں کو انگی رکھنے کی جگہ نہ ملی
جب بادشاہوں کا یہ حال ہے تو خاص لخاص اور عوام ان سب مسلمانوں کا
تو ذکر ہی کیا جنھوں نے لئے ایک مادری زبان بنالیا تھا۔ کب گنگ۔ کب
سنت۔ تمت۔ پرمیت وغیرہ۔ اکبری کیشروں میں اور اکبر میں جو سوال و
جواب ہوئے ہیں نہیں پہنچے سکتے ہیں دیکھنے کے قابل ہیں اکبر ایک فقرہ یا
مصرعہ کسی موقع کے متعلق کہہ دیتا اور ان کیشروں سے اس کا موقع دریافت
کرتا مگر یہ بھی اسی کا ٹھیک حال باندہ کر دکھا دیتے تھے جس کی وجہ یہ ہے
کہ ان کی قوت متخیلہ انکشاف کے درجہ کو پہنچ گئی تھی اور یہ کوئی خلاف قیاس
امر نہیں ہے مسٹر ٹنیسن جو انگلستان کا ایک مشہور شاعر تھا اس کے تخیلات
کا بھی یہی حال ہو گیا تھا جسے کشف سے تعبیر کرنے لگے تھے ان لوگوں نے اس
کشف کا نام سرستی رکھ چھوڑا تھا مثلاً اکبر نے کہا "ٹن ٹن ٹن ٹنن نیکو یعنی ٹن
ٹن بجتا ہوا اخیر میں ٹنن کر کے ٹھیر گیا کب گنگ کیشر نے اس پر مصرعہ لگائے
اور ہو بہو اصل واقعہ بیان کر دیا۔ اسی طرح اکبر نے فرمایا کہ کارن ڈول میں ہلت
پانی" یعنی ڈول میں کس سبب سے پانی جھکولے کھا رہا ہے کیشر نے چوپائی
بنا کر اندروے کشف اس کی وجہ ثابت کر دی علی ہذا ؎
کہہ کارن سندر ہاتھ جرے یعنی حسینہ کے کس سبب سے ہاتھ جل گئے ؎
نکسو رب پھوڑ پہاڑ کے تا میں۔ یعنی سورج پہاڑ پھوڑ کر نکل آیا ؎
نیورے سیس لیت ہے تارن۔ یعنی سر جھکا کرتا ہے بھگتی ہے ؎
مانو چندر کو چیر کسم چوا یو۔ گویا چاند کو چیر کر کسم کا رنگ ٹپکایا ؎
ناگ امی نکسو ہے پونچھ کے اورن۔ یعنی ناگ کا امرت دوم کی طرف سے
پیکر نکلا ؎

پاتی کے ہاتھ لیت پاتی سے جراُٹھی۔ یعنی نامہ بر سے خط لیتے ہی خط
کے ہاتھوں جل اُٹھی ۔

پھوٹو انار بیار کے مارے یعنی ہنسی کی ہوا سے انار پھٹ نکلا غرض کبھی
کبھی سنت نے کبھی کب گنگ نے کبھی میاں حکمت نے کبھی پرہت کیشو
نے اصلی واقعہ کی تصویر کھینچ دی اور یہ ثابت کر دیا گویا یہ لوگ اس وقت
موجود تھے آپ نے اس ہندی بھاشا کو ملاحظہ فرمالیا کہ کن کن پراکرت
اور ٹھیٹ ہندی الفاظ سے معمور اور سرورافزا ہے۔

ہم بہتیرا اپنے دل کو سمجھاتے ہیں کہ مسلمانوں نے باوجود ضرورت
برج بھاشا کو آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھا مگر وہ نہیں مانتا اور ایسی نظیریں پیش
کرتا ہے جن سے مجبوراً ہمیں خاموشی اختیار کرنی پڑتی ہے بیاہ شادی
میں جس قدر گھریلو گیت عورتوں میں گائے جاتے ہیں سب کے سب
برج بھاشا میں ہوتے ہیں جتنی رسمیں ایسی تقریروں میں ادا ہوتی ہیں
سب برج بھاشا کے الفاظ میں ہوتی ہیں یہانتک کہ اکثر عورتوں
کے ناموں میں بھی برج بھاشا کی شرکت پائی جاتی ہے۔ مثلاً موتی بیگم
گنا بیگم۔ پیاری خانم۔ بستی خانم۔ بستی بیگم۔ لادو بیگم۔ لاڈلی خانم۔ دلھن جان
وغیرہ وغیرہ مردوں کے نام کی تو گنتی ہی نہیں۔ پیر خاں۔ نانک بخش۔
شیخ منگا۔ لال خاں۔ میر بھکاری۔ اللہ جوایا۔ مرزا کالے۔ تارن خان
مرزا کوڑے۔ میرزا ننھے۔ ننھے خاں۔ مرزا پیارے۔ مینڈھو خاں۔ میر
کلن۔ شیخ نتھن۔ شیخ نتھو۔ لال خاں۔ منو خاں۔ لال میاں۔
جیون بیگ۔ مچھو خاں۔ مچھو بیگ۔ سید بھورے وغیرہ وغیرہ
بندی گیتوں ہندی ٹھمریوں۔ ٹپوں۔ دھرپدوں۔ خیالوں

ہولیوں یہانتک کہ مسلمان دھوبیوں سقوں کے کھنڈ۔ مرہٹیاں لاونیاں وغیرہ بھی برج بھاشا سے بھری پڑی ہیں سنندپیا کے گیت قدرپیا کی ٹھمریاں۔ احمد پیا ممتاز پیا شمس پیا۔ عاجز پیا۔ خوشرنگ بھونگ سدا رنگ۔ شوق رنگ یہانتک کہ بادشاہ خاتم سلطنت تیموریہ جن کی پیچا بی ٹھیٹ ہندی کی ہولیاں گیت وغیرہ ان کے دیوانوں میں لب تک موجود ہیں۔ یہ سب مسلمان ہیں۔ چونکہ ان کی طبیعتیں راگوں پر مائل اور موسیقی پسند تھیں انھوں نے اپنی زبان چھوڑ کر خاص ہندی بھاکا میں وہ لطف پیدا کیا کہ خواجہ صاحب کو بھی اس کا لطف آگیا اور انھوں نے اسے لطیف و شگفتہ پر فصاحت و بلاغت شاعری کا خطاب دیا لیکن مسلمانوں نے مخصوص نہیں فرمایا۔

جس قدر ہندی کہاوتیں ہمارے ہاں زبان زد خاص و عام ہیں اور جتنی پہیلیاں۔ کہہ مکریاں وغیرہ جدید و قدیم مقبول اہل زبان ہیں دوسری نہیں ہیں۔

ایک زمانہ میں ہمیں بھی ٹھیٹ ہندی زبان سے نفرت تھی جس کی وجہ ہماری نافہمی اور عدم واقفیت تھی ہم کبھی ہندی گیتوں کو دل دیکر نہ سنتے تھے کیونکہ ہماری سمجھ میں نہ آتے تھے۔ ہاں غزلوں پر فریفتہ تھے مگر جب سے ہم ہندی آشنا ہوئے اور ہم نے اس زبان میں مہارت حاصل کی تو یہانتک اس زبان کے دلدادہ ہوئے کہ قصداً اپنی تصانیف میں ان الفاظ کو زیادہ لانے لگے اور ہمیں ثابت ہوگیا کہ اردو جاجان درحقیقت ہندی زبان ہے اور اب بھی ہم یہی کہتے ہیں کہ دہلی کی اردو اس لطف سے خالی نہیں ہے۔ وہ برج بھاشا کا صرف

اپنے میں اثر ہی نہیں رکھتی بلکہ سب سے زیادہ اس میں برج بھاشا کا عنصر ملا ہوا ہے اس پر صرف اس نظر سے اعتراض کرنا کہ اسے اردو کیوں کہتے ہیں گویا درحقیقت برج بھاشا پر اعتراض ہے کہ اس نے اس قدر وسعت اور ہر دلعزیزی کیوں پیدا کی۔ جو آج کو یہ تمام تصانیف موجودہ اردو کی بجائے ہندی کہلائی جاتیں۔ انشاء اللہ خاں نے جو ٹھیٹ ہندی زبان میں تصنیفات کی ہیں اور ان میں اس امر کا التزام کیا ہے کہ فارسی عربی کا حتی الوسع کوئی لفظ نہیں آنے دیا ہے اس بات کا اثر ثبوت دے رہا ہے کہ مسلمانوں کو بالطبع ہندی زبان سے لگاؤ اور اس کا کامل ملکہ حاصل ہے۔ اردو کی کسی کتاب ورنہ صغرا اہل دہلی کی تصانیف میں سے کوئی سی کتاب لیکر اس کے چاہے جس صفحہ کے ہندی عربی فارسی ترکی الفاظ گن ڈالو۔ چار چند ہندی ثلث یا ربع بلکہ اس سے بھی بہت کم دیگر زبانوں کے الفاظ پاؤ گے۔

اہل یورپ نے بیشک سنسکرت کی قدر کی اور یہ قدر خاص اس وجہ سے ہے کہ اُن کو پرانے زمانے کی ہر ایک بات کا تحقیق کرنا اور اُس میں سے کچھ نہ کچھ مطلب نکالنا مقصود ہے اُن کی فراغ بالی نے اس طرف توجہ دلا رکھی ہے۔ وہاں علم کا چرچا ہے تجربہ کا شوق ہے یہاں کے مسلمان ابتدا میں عموماً سپہ گری کے دلدادہ اور خاص خاص بیشکر بڑے جلیل القدر علما و فضلا غیر زبانوں کے شایق تھے لیکن ملکی عہدوں کی ذمہ واریاں ان کی جانوں کو لاگو ہو رہی تھیں اس پر بھی انھوں نے وہ کیا جو کرنے کا حق ہے۔ ابو الفضل قتل ہوا مگر اس تھوڑی سی عمر میں شاہی خدمات کا وہ جوہر دکھا گیا کہ آج تک اس سے

دوسری قومیں بدلے ہی ہیں۔ فاتحانِ نے کیسی کیسی آفتیں وحشت کیں مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ کر گیا۔ اگر زمانہ حال کے موافق امن و امان کا ڈنکا بجا ہوتا اور دنیوی ضروریات سے بیفکری ہوتی تو مسلمان بھی اسی طرح کرکے دکھا دیتے جس طرح اہل یورپ علمی ترقی دکھا رہے ہیں خلفائے عباسیہ کے زمانہ میں کیا کچھ نہ کیا اندلس میں کونسی علمی ترقی اٹھا رکھی کہ ہند میں نہ کرتے ہر زمانہ کا اثر جداگانہ ہوتا ہے۔ اب سنسکرت کی وہ قدر کیوں نہیں ہے جو ہندی سلطنت کے عہد میں تھی یہی حال ہر ایک قوم کا سمجھ لینا چاہیئے۔ سنسکرت لاطینی اور یونانی سے زیادہ فصیح و وسیع بھی مگر عربی پر مسلمان اسے ترجیح نہیں دے سکتے وہ بھی ایک مکمل وسیع زبان ہے۔ سنسکرت کی وسعت ختم ہوگئی اس کی وسعت ابھی تک باقی ہے۔ سنسکرت کی بول چال معلوم معدوم ہوگئی اس کی بول چال ابھی تک برقرار اور بہت ترقی ہے بیروت اور مصر کی تصانیف سے مقابلہ کرکے دیکھو اگر سنسکرت باقاعدہ ہے تو عربی بھی بے قاعدہ نہیں ہے۔ مسلمانوں نے اس پر بھی سنسکرت کی قدر کی جس کا ذکر اوپر آچکا ہے اور اچھی قدر کی جس سے وہ زبان گو زبانوں سے اُتر گئی مگر کتب بول میں قایم رہی۔ اگر قابل التفات نہ سمجھتے تو اس زبان کی گم شدہ تصانیف ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہم نہ پہنچاتے بلکہ اس کو جہاں پاتے آگ دکھاتے سنسکرت کا سیکھنا مسلمانوں کو کیا کسی کو بھی آسان نہیں کیونکہ اس کا تلفظ اور اس کے مخارج سہل و آسان نہیں کیونکہ راگ کو اس سے بہت کچھ مناسبت ہے اور یہی وجہ ہے اس زبان کی جس قدر تصانیف ہیں وہ اشلوکوں یعنی نظم میں ہیں۔ جو راگ راگنیوں میں

جو راگ راگنیوں میں گا کر پڑھی جاتی ہے اگرچہ زبان امان اور ترنم سے تعلق رکھتی تو ابتدا میں ہی سے کوئی نہ پڑھتا بلکہ مشکل مخارج کی وقت اُس کی شیوع کی مانع ہوجاتی مگر اس پر بھی بقدر ضرورت خاص خاص مسلمانوں نے باوجود قیود سخت و دشوار سیکھکر چھوڑا۔

برج بھاشا بیشک آسان ہے اور اسی وجہ سے ہماری زبان کا عنصر غالب یہی ہے۔ جس نے ہماری اصلی زبان کو چھڑا کر اپنا دخل کرلیا اس کی گریمر اس امر کی کافی دلیل ہے کہ ہم نے اپنی گریمر کو چھوڑا اور اس کی گریمر پر مروجہ زبان کو ڈھالا۔

برج بھاشا کے متعلق ایک اور بات بھی قابل توجہ ہے وہ یہی ہے کہ خواجہ صاحب شاید برج بھاشا کو ہندکی عام زبان سمجھتے ہیں۔ حالانکہ وہ یک محدود خطہ کی زبان ہے جو برج۔ نبدرابن گوکل متھرا آگرہ بلب گڈہ اور کسی قدر فرید آباد تک بولی جاتی ہے۔ دہلی کی قدیمی زبانیں اور موجودہ تمہان میں اس کا بیشک بہت کچھ میل ہے۔ مگر پوربی بھاکا ماگھدی بھاکا بھوجپوری ہندی۔ بنارسی ہندی کشمیری ہندی اور سندھی زبانوں میں اس کا کچھ دخل نہیں ہے۔ اس صورت میں مسلمان جو ہندوستان کے چاروں کھونٹ میں پھیلے ہوئے ہیں سب کے سب برج بھاشا بولکر کیونکر یہ حق ادا کرسکتے کہ ہم برج بھاشا کے بولنے والوں میں شامل ہیں گو یہ زبان نہایت سہل اور آسان ہے مگر تمام ملک کی زبان تو برج بھاشا نہیں ہے۔ غالباً برج بھاشا سے مراد ہندی بھاکا یا عام ہندی زبان ہوگی

تمدن

رضیہ سلطانہ

ہندوستان کے مسلمان فرمانرواؤں میں سے شاید ہی ایسا کوئی خوش نصیب ہو جس کا دور حکومت بے داغ نظر آئے مگر جن بیگناہوں پر تاریخ مروجہ نے دل کھولکر حملے کئے ہیں ان میں سے ایک سلطانہ رضیہ بھی ہے اور ایسے لوگ بہت کم ہوں گے جو اس بیگم کے نام سے آشنا تو ہوں مگر نہ جانتے ہوں کہ ایک حبشی غلام بغل میں ہاتھ دیکر اُس کو گھوڑے پر بٹھاتا تھا لیکن سلطانہ رضیہ جیسی مدبر انصاف پسند اور بیدار مغز ملکہ پر ایسا الزام لگانا نہ صرف مورخ کی بددیانتی سمجھی جا سکتی ہے بلکہ ایک ایسا راز ہے جس کی تہ میں تعصب صاف طور پر جھلک رہا ہے زیادہ تر افسوس اس امر کا ہے کہ رضیہ پر اس قسم کا الزام قایم کرنیوالے لوگ وہ ہیں

جن کا طرز تمدن ایسی باتوںکو مذموم یا معیوب نہیں بلکہ جزو حیات سمجھ رہا ہے اور جہاں علی الاعلان اس سے بدرجہا بڑھے چڑھے تماشے دن رات دکھائی دے رہے ہیں مگر ہم اس سے پہلے کہ سلطانہ رضیہ کے دامن عصمت کو اس گناہ سے پاک ثابت کرنے کی کوشش کریں اس کی زندگی کی ابتدائی حالات پر نظر ڈالتے ہیں۔

رضیہ بیگم کی ہر دلعزیزی کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ سلطان شمس الدین کے بعد جس نے گیارہ بیٹے چھوڑے باوجود رکن الدین کے ولیعہد ہونے کے رعیت نے بالاتفاق سلطانہ کو اپنا حکمران بنانا چاہا اور اپنی جانیں قربان کرکے ایک خونریز معرکہ کے بعد رکن الدین کو قید کیا اور رضیہ بیگم کو سنہ ۳۹ء میں تخت پر بٹھا دیا

رضیہ درحقیقت تخت حکومت کی مستحق تھی ایک مسلمان بادشاہ میں جو صفات ہونی چاہئیں اس کی ذات میں وہ سب موجود تھیں وہ باپ کے زمانہ حیات ہی میں کاروبار سلطنت میں متوجہ رہتی اور بہت سے مراحل اس خوبصورتی اور دانشمندی سے طے کردیتی کہ خود شمس الدین متعجب ہو جاتا۔ اسی ہی قابلیت اور محنت کا نتیجہ تھا کہ جب شمس الدین نے گوالیار پر حملہ کیا تو باوجود اکھٹے گیارہ لڑکوں کی موجودگی کے انسے اپنی عدم موجودگی میں رضیہ کو قائم مقام بنایا اور رضیہ سلطانہ نے اس فرض کو ایسی خوش اسلوبی سے انجام دیا کہ واپسی پر شمس نے سلطانہ رضیہ کی ولیعہدی کے احکام جاری کردیئے۔

سلطانہ رضیہ نے سب سے پہلا کام جو حکمران ہونے کے بعد کیا وہ قوانین قطبی و شمسی اور احکام شرعی کی ترویج تھی جسکو عیاشس

رکن الدین نظرانداز کرچکا تھا۔ مردانہ لباس پہنکر وہ باہر نکلنے لگی تاکہ تمام نظم ونسق سے باخبر رہے۔ اس کے محل کا دروازہ فریادی کے واسطے ہر وقت کھلا ہوا تھا اور وہ دن ہو یا رات فریاد سننے کے واسطے ہر لمحہ تیار تھی۔ رکن الدین کی گرفتاری اور باقی تمام بھائیوں کی شرارت سے آپس کی خانہ جنگیوں نے رضیہ کو چین نہ لینے دیا یہانتک کہ لاہور اور ملتان وغیرہ کے حاکم اور وزیر اعظم نظام الملک جنیدی پر بغاوت کا جادو چلگیا اور یہ لوگ اس کی مخالفت پر آمادہ ہوگئے سلطانہ کے واسطے یہ وقت نہایت نازک تھا مگر وہ مطلق نہ گھبرائی اور ایک جرار فوج لیکر مقابلہ پر آئی۔ باغیوں کو قتل کیا حاکمونکو شکست دی اور جس وقت بھائی عفو تقصیر کے طالب ہوئے تو آنکھوں میں آنسو بھر لائی اور اُن کے قصور معاف کردیئے۔

اب وہ وقت آیا جسکو مورخ سلطانہ کی شان کے خلاف سمجھکر اس پر بزدلانہ حملے کررہے ہیں یعنی ایک شخص یاقوت حبشی میراخور رضیہ کے مزاج میں اسقدر دخیل ہوا اور اس کا تقرب اتنا بڑھ گیا کہ جب سلطانہ گھوڑے پر سوار ہوتی تو وہ ہاتھوں سے سہارا دیکر سلطانہ کو سوار کراتا۔

اس موقع پر انصاف کو ہاتھ سے نہ دینے والے غور کرسکتے ہیں کہ ایک معمولی آدمی کے تھوڑے سے صاحب اختیار ہوجانے پر خوشامدیوں کا کسقدر نرغہ ہوجاتا ہے دانت کریدنے کے واسطے تنکا اُٹھانے کی بھی ضرورت ہوتی ہے تو خدام لپک کر اس خدمت کو انجام دیتے ہیں چہ جائیکہ ایک عظیم الشان ملکہ کے دربار میں ایک شخص کو اسقدر رسوخ

حاصل ہوئے کہ امور سلطنت میں بھی اُس سے مشورہ لیا جائے تو وہ اس موقعہ پرخوشامد میں اپنی جان تک نثار کر دیتا تو اُسکے واسطے فخر تھا نہ یہ کہ گھوڑے کی سواری میں رضیہ کو سہارا دینا اسکے تعلق ناجائز کی ایک شہادت ہوگئی۔

سلطانہ رضیہ باعتبار تدبیر اپنے زمانہ کی بہترین حکمران تھی اگر حقیقت نفس الامر یہ ہوتی تو وہ ضرور رعیت کے مشتبہ ہوجانیکی احتیاط کرتی مگر وہ بالکل آزادمنش عورت تھی پرواہ مطلق نہ کرتی کھلم کھلا پھرتی اور میدان کارزار میں وردی پہنکر شریک ہوتی

افسوس یہ ہے کہ الفنسٹن جیسا شخص جس نے یورپ کی سرزمین میں پرورش پائی اور جس کی گھٹی میں آزادی نسواں پڑی ہو حبشی غلام کے ہاتھ پر سلطانہ کے چال چلن کو مشکوک سمجھے۔ اگر اس کی ذرہ بھر بھی اصلیت ہوتی تو وہ مورخین جنہوں نے ایمان کو کسی موقع پر ہاتھ سے نہ دیا بالاجماع یہ نہ لکھتے کہ سلطانہ بیرا تور پر مہربانی کرتی تھی باغیوں کی سازش کا شکار اکثر حکمران ہوئے ہیں اور آپس کی خانہ جنگیوں نے بڑے بڑے فساد برپا کیے ہیں رضیہ کا معزول ہونا ان ہی وجوہ سے تھا جسکو تاریخ مروجہ نے اس کے چال چلن کی خرابی سے تعبیر کیا وہ اصل میں [illegible] کی ترک تھی اور چہل کانی غلام ترک شروع سے اس کی مخالفت پر کمربستہ تھے اور باوجود سخت کوشش کے انکا خوش رہنا سلطانہ کے اختیار سے باہر تھا۔ نوبت یہانتک پہنچی کہ التونیہ بھنڈے کا حاکم باغی ہوگیا امرا اس کے ساتھ تھے اور سلطانہ کی طاقت کمزور ہوچکی تھی اسوقت سوا اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ سلطانہ نے

التونیہ سے نکاح کیا اور اسطرح اپنی پاکدامنی کو اچھی طرح ثابت کر دیا۔ مگر اصلیت کچھہ اور ہی تھی جسکا کانی غلام ترک اُس فعل پر اور بھی برافروختہ ہوئے اور کیتھل پر ۶۳۷ھ میں ایک خونریز جنگ ہوئی جس میں سلطانہ کو شکست ہوئی

ترک اس کے خون کے پیاسے تھے رضیہ کے پاؤں اُکھڑنے کی دیر تھی چارونطرف سے ٹوٹ پڑے اور بدنصیب رضیہ نے ایک گاؤں میں جاکر پناہ لی۔ ابن بطوطہ سلطانہ رضیہ کے قتل کی واردات ان الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ شکست کہانے کے بعد رضیہ نے اپنا لباس تبدیل کیا دن بھر گاؤں میں پھرتی رہی شام کے وقت جب بھوک سے بہت تنگ ہوئی تو زمینداروں سے سوال کیا ایک کسان نے اس کی حالت پر رحم کہاکر آدہی روٹی اس کے حوالے کی۔ دن بھر کی تھکی ہاری ملکہ کو وہ سوکھی روٹی پلاؤ کی رکابی سے بہتر تھی سیر ہو کر کھائی اور تھوڑا سا پانی پیکر وہیں ایک کونے میں ڈھیر ہوگئی لباس مردانہ تھا کسان کی نظر پڑی تو کیا دیکھتا ہے کہ فقیرنی کے لباس کے نیچے قبائے مرصع کا تکمہ جگمگا رہا ہے قریب آکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ عورت ہے اور بیش قیمت لباس وزیور سے مزین ہے کمبخت نے لالچ میں آکر مصیبت ماری ملکہ کو جو اس کے ہاں میمان اور پناہ گزیں تھی قتل کر دیا۔ لباس اور زیور اُتار کر لاش ایک کھیت میں دفن کی اور زیور لیکر جوہریوں کے پاس گیا۔ ایک گراں بہا انگشتری جس میں ہیرا جڑا ہوا تھا منحوس کسان کے پاس دیکھکر سب دنگ رہ گئے۔ پولس کو خبر ہوئی اور کوتوال نے اسکو گرفتار کر کے تحقیقات شروع کی اور لاش کو کفن دیکر قطب

صاحب کے کھنڈروں میں دفن کیا اور ایک گنبد بنا دیا۔

ابن بطوطہ کا یہ واقعہ بھی بجائے خود زیادہ صحیح نہیں معلوم ہوتا اس لیے نہیں کہ قطب صاحب کے کھنڈروں میں رضیہ بیگم کے مقبرہ کا صحیح پتہ نہیں چلتا بلکہ اس لیے کہ دہلی میں اس واقعہ کا علم بادشاہ وقت کو مطلق نہوا قیاس یہ کہتا ہے کہ سلطانہ گرفتار ہو کر معز الدین شاہ کے حکم سے مع اپنے شوہر کے قتل کی گئی۔

ان تمام واقعات سے جو بیان کئے گئے یہ اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ تفریق مذہب کیسی مذموم شے ہے۔ ایک ایسی ملکہ جس نے تمام عمر اپنی پاکدامنی سے بسر کر دی اور تا دم واپسیں عصمت کو ملحوظ رکھا۔ متعصب مورخوں کی نگاہ میں بدچلن سمجھی گئی حالانکہ تاریخ اس سے بہت زیادہ آزاد حکمران عورتیں ہمارے سامنے پیش کر رہی ہے اور مورخ اُن کی عفت و عصمت کے گیت گا رہے ہیں۔

بُلبُل

اے گل کی عاشق شیریں نوا بُلبل! تیری نغمہ سنجیوں میں خدا نے وہ کونسا اثر اور درد کوٹ کوٹ کے بھرا ہے کہ جہاں اُس کی بھنک کسی چوٹ کھائے ہوئے دل کے کان میں پڑ بھی گئی کہ وہ بیتاب ہو گیا اور بلیوں اوچھلنے لگا۔ تیرے دردناک نغمہ میں شاید معشوق کی بے اعتنائی اور صدمہ ہائے فراق کے شکوے گائے جاتے ہوں گے جو وہ اس قدر عاشق دلوں کے دل پر اثر کرتا ہے۔ یا تو اپنے ترانہ سنجی میں اپنے معشوق کی خوبصورتی اور نزاکت کی تعریف کرتی ہے جسکو سنکر زخمی دلوں کو اپنے معشوق کی بھی ہر ہر دلکش ادا یاد آجاتی ہوگی جو وہ اس قدر بے اختیار اور متاثر ہو جاتے ہیں +

بلبل! تیرا نام اس قدر کیوں دلفریب ہے؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی تمام موسیقی اور تمام جذبات محبت تیرے ہی نام میں لاکر بھر دیئے گئے ہیں خوبصورت چھوٹی سی چڑیا! مرحبا تیری ہمت پر اور آفریں تیرے استقلال پر کہ تو تمام دنیا میں عاشق گل کے نام سے بدنام ہوئی۔ بدنام کیا ہوئی ضرب المثل ہو گئی۔ شاعروں نے ہر ہر قسم کی باتیں کہہ کر تیرا دل جلایا۔ کبھی تجھپر پھبتیاں کسیں کبھی تجھکو دیوانہ بنایا۔ کبھی تجھے تضحیک کیا کہ کیوں گل کے شباب دو روزہ پر مٹی جاتی ہے کیوں اُس کے عشق سے باز نہیں آتی۔ لیکن ان باتوں کی تو نے کچھ پروا نہ کی اور اپنا کام کیئے گئی آہ! گل کے پردے میں تجھے کسی اور کی عاشقی دکھانی تھی۔ گل کی مہک میں تو کسی اور کی بو پاتی ہے اور اسلیا

شک نہیں کہ صفتِ گل کو دیکھ کر صانع گل کی محبت تیرے ننھے سے دل میں جاگزیں ہوگئی ہے۔

ہزارا ہونہو-گل کی پتیوں پر کوئی ایسا ہی نتر لکھا ہے جو تجھکو اپنی جانب کھینچتا ہے اور تو اسکی دیوانی ہوگئی ہے دیوانے ہیں وہ جو سمجھتے ہیں کہ تو گل سی فانی چیز پر جان دیتی ہے بلکہ تو اوراق گل کو بقول سعدی شیرازی علیہ الرحمۃ صحیفۂ قدرت سمجھکر اُس کی تلاوت کرتی ہے۔ شعرا نے تجھکو اپنے اشعار میں تختۂ مشق بنایا اچھا نہ کیا وہ تیری محبت کیا جانیں تو جس پیا کی اپنے کو سہاگن بنائے ہوئے ہے وہ اُس کو کیا سمجھیں۔ وہ بھی سمجھتے ہیں کہ تو گل کی پتیوں اور اُسکی خوشبو کی عاشق ہے لیکن یہ نہیں خیال کرتے کہ تو ان نازک نازک اوراق پر اپنے قایم و دائم پیا کا نام دیکھتی ہے۔

سید اللہ بخش-ادیب-مہدوی

راحتِ زمانی

ہملٹ

یہ چند صفحے شکسپیر کے مشہور ڈراما ہملٹ کے بہترین حصے کا منظوم ترجمہ ہے جس میں دوسروں کو ایک رستہ دکھانیکی کوشش کی ہے اور چاہا ہے کہ اس نمونے کی اشاعت اردو میں ایک جدید پیرایہ بیان کی نیو ہو جائے۔ یقین ہے کہ اور اچھا کہنے والے بھی اس سے بہت کچھ کام لیں گے +

چونکہ ترجمہ بیچ کے ایک حصے کا ہے اس لیے اصل قصہ کو اشارۃً بیان کر دینا ضروری ہے :-

ہملٹ ڈنمارک کا شہزادہ ہے اس کے باپ بادشاہ سابق کو اسکی ماں اور چچا نے ملکر خفیہ زہر دے دیا تھا۔ پھر آپس میں بیاہ کر کے تخت سلطنت پر قابض ہو گئے تھے۔ ہملٹ کو اپنی ماں کی اس حرکت پر رنج تھا ہی کہ بعض یاروں نے اسکو یہ خبر دی کہ اس کے باپ کی روح قبرستان میں آتی ہے ہملٹ وہاں رات کو گیا اور اس روح سے باتیں کیں جس سے ماں کی بدعشقی اور چچا کی سفاکی کا حال کھل گیا اور وہ انتقام پر آمادہ ہو گیا پھر اس نے ظاہرا دیوانگی اختیار کر لی اور سب سے ملنا جلنا چھوڑ دیا یہاں تک کہ اپنی پرانی محبوبہ اور وزیر پولونس کی بیٹی اوفلیہ سے بھی متنفر ہو گیا۔ اب بادشاہ اسکی شوریدگی سے نہایت

پریشان ہے کہ یہ کوئی سازش نہ ہو۔ اور وہ ہملٹ کے دو قدیم رفیقوں کو دریافت حال کے لیے بہیجتا ہے پہر خود ہملٹ کو طلب کرتا ہے کہ چہپ کر اسکی اور اوفیلیہ کی باتیں سنے۔

یہی وہ سین جس کا ترجمہ اس وقت ہدیۂ ناظرین ہے اُردو میں بہی اس کا تماشہ ہوتا ہے اور بعض بے مغزوں نے اس کا نام خونِ ناحق رکہا ہے۔

ہملٹ

حصۂ اول۔ تیسرا پردہ

(حاضرین: بادشاہ، ملکہ، پولونس وزیر، اوفیلیہ وزیرزادی، روڈن اور گلڈن)

بادشاہ۔ طوفانِ جنوں کی موجوں میں۔ شوریدہ سری کے جہونکوں سے
کیوں چین کی ناؤ ڈبوتا ہے۔ کیوں عیش کی گہڑیاں کہوتا ہے
کچہہ تم نے بہی معلوم کیا۔ وہ اتنا سراسیمہ کیوں ہے؟

روڈن۔ وہ اتنا تو بے شک کہتے ہیں۔ کہ مجہکو دہڑکن ہوتی ہے
اور دلمیں ہوکیں اُٹہتی ہیں۔ لیکن جو سبب اس کا پوچہا
تو بات کو بالکل ٹال گئے۔

گلڈن۔ حضور!
دیوانہ بکارِ خود ہشیار! وہ بیخود ہیں نادان نہیں
دیوانے ہیں انجان نہیں! بہلا کر اور پہسلا کر ہم

جب پوچھتے اُن سے وجہ جنوں۔ تو کرتے گریز جواب سے وہ
دیوانگیٔ عیارانہ سے مطلب صاف اُڑا دیتے

ملکہ۔ وہ تم سے پیش آئے کیسے ؟

گلڈن۔ بہت خوش خلقی سے ـــــ

روڈن۔ خود کرتے نہ تھے وہ کوئی سوال، لیکن نہ برتتے تحمل کبھی
جب پوچھتا ہم میں سے کوئی،

ملکہ۔ کچھ کھیل تماشے پر بھی کیا تم نے انہیں راغب . . . .

روڈن۔ ہاں! جی ہاں
یاں ناٹک والے آئے ہیں۔ اور ہم نے جو اون کا ذکر کیا
تو وہ بے حد مسرور ہوئے۔ اور شاید آج ہی فرمایش
بھیجی ہے کھیل دکھانے کی۔

پولونس۔ بلکہ شہزادہ صاحب نے درخواست حضور سے بھی کی ہے
کہ شب کو قدم رنجہ فرمائیں اس کھیل میں ملکہ اور حضور!

بادشاہ بخوشی ـــــ
اور ہم کو اطمینان ہوا۔ یہ سُن کے کہ ہملٹ شایق ہے
ناٹک کے کھیل تماشوں کا۔ یہ کام ہے اب تم لوگوں کا
کہ اس کا جی انہیں بہلاؤ۔

روڈن۔ بچشم ـــــ (رخصت ہوتے ہیں)

بادشاہ۔ بیگم! تم بھی آرام کرو
ہم نے ہملٹ کو بلایا ہے۔ تا اس کا اور اوفیلیہ کا
ہو ایکا ایکی سامنا یاں۔ اور اس کے باپ کو اور مجھکو

(قانون کی رو سے جو ہیں مجاز) یہ دیکھنے کا موقعہ مل جائے
کہ آیا یہ شوریدہ سری - ہے حضرت عشق کی جلوہ گری
یا اس کا سبب کچھ اور ہی ہے -
خود اسکی نظروں سے چھپ کر یہ بات مشاہدہ کرنی ہے

ملکہ - بہتر ہے -
اللہ کرے اے اوفلیہ ہملٹ کی وحشت کی تہ میں -
ہو حُسن قیامت خیز ترا - ! گر دیدہ تیری خوبی کا
وہ ہو تو امید یہ بندھتی ہے - کہ تیرے لطف سلوک سے پھر
آپے میں وہ آجائیگا - (چلی گئی)

پولونس - اوفلیہ تو تم یاں ٹہلو - اور حضرت اقدس ایک طرف
سرکار بھی تھوڑی سی ہٹ آئیں!
(اوفلیہ کو ایک کتاب دیکر) یہ کتاب لو، اسکو پڑھتی رہو،
محویت گو یہ نمود کی ہے - لوگوں کی نظر میں لیکن یہہ
دلچسپی کی افزایش ہے - اور زیور ہے تنہائی کا
—— یہ جرم ریاکاری کا ہے - اللہ ہم اقبالی مجرم ہیں! ——
یہ بات بھی لیکن ثابت ہے کہ چہرے پہ غازۂ تقوے اور
افعال میں شانِ دینداری ہے ایسا طلسم تصنع کا -
شیطان بھی جس سے چکرائے !!!

بادشاہ (دلمیں) واللہ کہ بالکل راست کہا!
اور کیسے نشتر پنہاں ہیں اس چھوٹی سی تقریر میں بھی؟
ہر لفظ سزا کا ہنٹر کا ہے گویا میرے دل کے لیے! ——

وہ غازہ کہ ایک بدکارہ کو۔ مصنوعی رونق دیتا ہے۔
معصوموں کو پُھسلاتا ہے، اور دامِ نگاہِ تماشا ہے۔
جتنا ناپاک ہے اُس کا اثر۔ خود وہ اِتنا ناپاک نہیں
میرے الفاظِ نفاق آمیز۔ دیباچہ تھے جس حرکت کا
وہ اُن سے کئی درجے زیادہ۔ مذموم اور قابلِ نفرت تھی!
او بارِ ملامت بس——

پولونس: جہاں پناہ ا——
آہٹ ہے اُن کے آنے کی۔ حضرت ایک طرف ہو جائیں
(ایک جانب چھپ جاتے ہیں)
ہملٹ داخل ہوتا ہے:۔

ہملٹ: رہنا کہ نہ رہنا دنیا میں، یہ مسلہ ہے امعان طلب
ناکامیٔ بخت کے صدموں کو، اور سخت الم کے دھکوں کو،
سہ لینا ولیں صبر کے ساتھ۔ یا دست بقبضہ ہو جانا
اور لڑنا سیلِ مصائب سے، سنگین چٹانوں کی طرح
امواجِ نوائب کو دھوکا، دیدینا ایسا کہ منہ پھر جائے!
—— ہے اس میں شجاعت یا اُس میں؟
مرجانا یعنی سو جانا؛ جاں کندنی کے سے تشنج کا،
روحانی کرب و اذیت کا، اور لاکھوں ہی تکلیفوں کا
(اس گوشت و خون کے جھگڑے کی جو قسمت اور فطرت میں ہیں)
آخر اور خاتمہ ہو جانا۔ اک دائمی نیند کے دامن میں——
ایسے انجام کے کیا کہنے—— واللہ نہ چھوڑے یہ گویا

انسان کی دلی امیدوں کا۔
مرجانا! یعنی سوجانا ، اور ممکن ہے اُس عالم میں
دو چار پریشاں خوابوں کا، آنا ——؟
(سر ہلاکر)، ہاں! یہ پیچ رہتی ہے!!!
جب یہ بہاری ، تکلیف بھرا، جسمانی جامہ پھینکدیا
اور آکے لحد میں لیٹ رہے ——
اُسوقت ——
اُس نیند میں، کیا معلوم کیا کیا خواب نظر آئیں ہم کو؟
—— یاں فکر و تامل لازم ہے:
اک لمبی مدت تک جینا ، یک بند ہزار تلطف ہے
کیونکہ وہ کونسا انساں ہے۔ جو اپنی خوشی سے سہ لیگا
ہر وقت کی کوفت، ہر وقت کا رنج ؟ :—
جابر کی بے ایمانی کو ، مغرور کی کبر و رعونت کو ،
یا عشق و محبت کے کارن۔ دل اور جگر خوں ہونیکو،
قانون عدل میں سستی کو، قابو جی عہدے داروں کے
پاجی پن اور تہتک کو——
کیوں کوئی سہے ؟ جب کہ ممکن
ہے یہ کہ ذرا سی قینچی سے یا چھوٹے سے اِک چاقو سے
وہ چھوٹ جائے سب جھگڑوں سے ؟
کیوں اتنی سخت مشقت ہو، کیوں دُکھ بھرنے پر رغبت ہو
دو دن کا جینا جبکہ صلہ ہو سارے رنج اور محنت کا؟

—— لیکن ہیہات! اس دھڑکے نے
کہ جانے واں کیا پیش آئے، اور کیا گزرے اس عالم میں
سرحد سے جسکی آجتلک، سیاح کوئی لوٹا ہی نہیں —
دگدے میں لاکر ڈال دیا، اور دل کو بالکل مار دیا
اور ساری یاں کی تکلیفیں سر لینے پر مجبور کیا۔
—— اتنے سے وہم سے منٹوں میں۔
وہ ساری اُمنگیں خاک ہوئیں، وہ
جوش اولوالعزمی بہی گیا، اور منصوبے بہی اوندھ گئی
—— یہ حالت ہے!
(اوفلیہ کو دیکھکر) آہاہ، اوفلیہ یہ تو ہے ——
تسلیم ——
او دیوی! جب کہ دستِ دعا تیرے اُٹھیں تو کاش تجھے
ہملٹ کے گناہ بہی یاد رہیں!

(باقی آیندہ)

سید ہاشمی
از فرید آباد

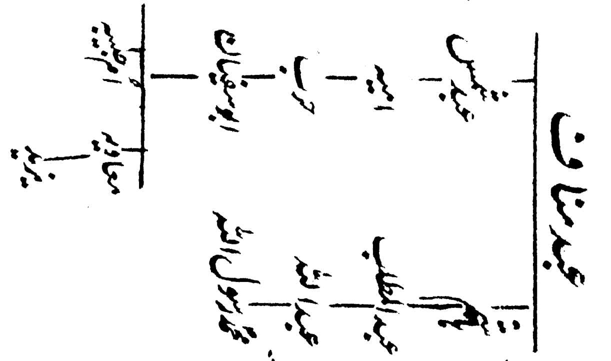
لڑکیوں کا انشا حامیان تعلیم نسواں کی عرصہ سے خواہش تہی کہ کوئی انشا لڑکیوں کے واسطے مولوی محمد عبد الرشید صاحب الخیری کی قلم سے نکلے۔ لطیف زبان کے واسطے کچھ لکھنا بے سود ہی ہر خط ایسا مؤثر ہے کہ ایک ایک حرف کلیجہ پر گڑتا ہے قیمت ایک روپیہ دو آنہ

ام المومنین حبیبہ رضی اللہ عنہا

نام تو رملہ تھا مگر انہوں نے اپنی بیٹی حبیبہ کے نام پر جو ان کے پہلے شوہر عبید اللہ بن جحش سے پیدا ہوئی تہیں اپنی کینت ام حبیبہ رکھ دی تھی اور اسی کینت کے ساتھ یہ نام سے زیادہ مشہور ہی تہیں انکا باپ ابو سفیان بن حرب عرب کے اس نامور اور مشہور قبیلے نبو امیہ کا معزز و ممتاز اور نہایت جری و دلیر سردار تہا جسکی شجاعت و بہادری سارے عرب کو تسلیم تھی اور جسکی متکبرانہ عزت و جاہ کا ڈنکا ممالک مشرقیہ میں بڑا بج رہا تہا خود ابو سفیان بڑے جاہ و جلال کا آدمی تھا اور اسکی اولوالعزمیاں اور معرکہ آرائیاں اقوام روزگار میں ضرب المثل تہیں شاہان روم و فارس اسکی قدر و منزلت کرتے تہے اور ان کے پُرشوکت اور جاہ و جلال سے بہرے درباروں میں انتہا سے زیادہ اسکی عظمت و وقعت کیجاتی تھی جس زمانے میں جناب پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے بادشاہ روم ہرقل کو تبلیغ اسلام کی غرض سے اپنا خط روانہ فرمایا ابوسفیان بیت المقدس میں موجود تہا اور ہرقل نے پیغمبر صاحب کے حالات و واقعات اس سے دریافت کیے تہے مسلمان ہونے سے پہلے اس نے اسلام کے اشاعت اور پیغمبر اسلام کی کامیابیوں میں چند در چند رکاوٹیں پیدا کر دی تہیں مگر مسلمان ہونے کے بعد ویسی ہی اسلام کی خدمت اور اس کے رواج دینے میں کوشش بہی کی جیسی اس کے چلتی گاڑی میں روڑے اٹکائے تہے ابو سفیان کے

بیٹے معاویہ جو بی بی ام حبیبہ کے حقیقی بھائی تھے اور جن کی نسل میں تراسی برس چار مہینے تک اسلامی خلافت رہی اپنے باپ سے بڑھکر اسلام کے فدائی اور جانباز ثابت ہوئے اُنھوں نے نہ صرف مشرقی ملکوں میں بلکہ یورپ اور افریقہ کی پہاڑیوں تک میں اسلام کا شاندار جھنڈا گاڑ دیا اور اسپین اور قرطبہ کے تاریک جنگلوں تک کو اسلام کی روشنی سے چمکیلا بنا دیا۔ ابوسفیان اسلام لانے سے پیشتر پیغمبر صاحب کا سخت مخالف تھا اور یہ مخالفت گو بظاہر اختلاف مذہب کی وجہ سے تھی مگر تاریخی واقعات بتا رہے ہیں کہ یہ اثر تھا اس خاندانی نزاع کا جو عبد مناف کے بیٹوں عبد شمس اور ہاشم کی اولاد میں صدیوں سے چلی آتی تھی اس کا مفصل بیان اس کتاب کے ۵ و ۶ و ۳ صفحوں میں مذکور ہوا خلاصہ یہ کہ معلوم ہے قبیلہ قریش جس میں کہ پیغمبر صاحب تھے جیسا دستور ہے درزمانہ کے ساتھ کئی شاخوں میں منقسم ہو گیا تھا مگر تھے سب خانہ کعبہ کے متولی یا مجاور اور اسی قومیت پر اُنکی وجاہت اور معاشں کا انحصار تھا تو آئے دن ان لوگوں میں خدمات کعبہ اور آمدنی متعلقہ خدمات کے بانٹ چونٹ پر جھگڑے اور خرخشے رہا کرتے تھے یہانتک کہ کبھی کبھی خونریزی تک کی نوبت پہنچ جاتی تھی ہم زیادہ دور جانا نہیں چاہتے پیغمبر صاحب کی چوتھی پشت میں عبد مناف ہو گزرے ہیں کہتے ہیں کہ ان کے دو بیٹے ہاشم اور عبد شمس جوڑواں پیدا ہوے اس طرح پر کہ عبد شمس کے پانوں کا تلوا ہاشم کے ماتھے سے چپیاں تھا جو آخر کو کاٹ کر الگ کیا گیا یہ دیکھکر اُسوقت کے نجومیوں نے پیشین گوئی کی کہ ان کی نسلوں میں تلوار چلا کرے گی چنانچہ ایسا ہی ہوا ہم اگر اس زمانے میں ہوتے اور کہانت بھی کرتے ہوتے تو اس پیشین گوئی کو ادا کرتے کہ ہاشم کی نسل عبد شمس کی نسل کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہو گی اس لیے کہ عبد شمس پانوں سے ہاشم کے ماتھے

کو ٹھکرا رہا ہی اس تفریق کو پیش نظر رکھنے کے لیے ہم عبد شمس اور ہاشم دونوں کے نسل کے مختصر نسب نامے بھی ذیل میں بنا دیتے ہیں۔



عبدمناف کے دو شاخوں میں جانی دشمن تو بڑوں سے متوارث چلے آتے تھے پیغمبر صاحب کے سے دعوی نبوت ملے وہ کیا جو آگ کے ساتھ تیل کیا کرتا ہے بھلا جو لوگ بنی ہاشم کی برتری کو ایک آنکھ نہ دیکھہ سکیں وہ کب گوارا کر سکتے تھے ان میں کا ایک اور وہ بھی تنہا بے پناہ خستہ حال ہمارے دین آبائی کو لغو و باطل قرار دیکر آپ تمام جزیرہ عرب کا ہادی اور پیشوا اور متبوع بنے تو ہم اُسکے مقابلے میں کچھ بھی نہ ٹھہرے توحید باری کی رو سے تو تمام قبائل قریش تمام جزیرہ عرب درشمول یہود و نصاری تمام اہل مذاہب سے مقابلہ تھا اور ہے اور رہیگا مگر پیغمبر صاحب کو زیادہ تر ایذائیں پہنچیں اہل مکہ سے جن میں رہتے تھے۔ سہ

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب ؎ تم کو بیرحمی یاران وطن یاد نہیں ؎

اور اہل مکہ میں بھی سب سے بڑھکر رشتہ داروں سے الاقارب کالعقارب ان میں ایک موذی ابوسفیان بھی تھا کہ پیغمبر صاحب جب نبوت کے تیرہ برس بعد اہل مکہ کی ایذا دہی سے عاجز آکر مکہ چھوڑ مدینہ جا رہے تھے اس پر بھی موذیوں نے چین سے بیٹھنے نہ دیا یہانتک کہ ہجرت کے بعد بدر کی مشہور لڑائی ہوئی اُس میں قریش کے بڑے بڑے سردار مارے گئے۔

ابوسفیان قبیلہ قریش کا سردار ہوا تو ہجرت کے تیسرے برس جنگ احد میں اور پانچویں برس جنگ احزاب میں لشکر لیکر مدینے پر حملہ آور ہوا غرض برابر پیغمبر صاحب اور اسلام کی بیخ کنی میں لگا رہا مگر کسی کا بال بھی بیکا نہ کر سکا یہاں تک کہ پیغمبر صاحب نے ہجرت کے اٹھویں برس خود مکے پر چڑہائی کی اسکو خبر لگی تو وہ ٹوہ لینے مدینے آیا لشکر اسلام کی کثرت دیکھکر مکے والوں کو جا خبر دی کہ مسلمانوں سے لڑنے کا نام بھی نہ لینا چنانچہ مکہ بے لڑے فتح ہوگیا اور اب ابوسفیان اور اس کا بیٹا معاویہ اور ہندہ گھر کا گھر مسلمان ہوگیا۔

ابوسفیان حقیقت میں فرعون امت تھا اور اس کا اسلام بھی فرعون کا سا اسلام تھا حتی اذا ادرکہ الغرق قال امنت انہ لا الہ الا الذی امنت بہ بنو اسرائل وانا من المسلمین الن وقد عصیت قبل وکنت من المفسدین (سورہ یونس ۶) ترجمہ سورہ یونس یہانتک کہ جب فرعون کے سر پر ڈبا ؤ پانی آپہنچا تو لگا کہنے کہ اب مجکو یقین آیا کہ جس خدا پر بنی اسرائل ایمان لائے ہیں اسکے سوا (اور) کوئی معبود نہیں اور (اب) میں (بھی) اسی کے فرمانبرداروں میں ہوں (تو خدا نے اس کو ملامت کی اور فرمایا) کیا اب (ایسے وقت میں ایمان لایا) اور (تیرا حال تو یہ تھا کہ اس سے) پہلے برابر نافرمانی کرتا رہا اور تو مفسدوں میں کا (ایک ہی مفسد تھا ترجمہ سورہ یونس ختم شد پیغمبر صاحب کے ساتھ جو اس خاندان کو عداوت تھی اس کا کسی قدر اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جنگ احد میں پیغمبر صاحب کے چچا حمزہ بن عبدالمطلب شہید ہوئے تو ھندہ نے پیٹ پھاڑ کر انکا جگر نکالا اور اسی کو چبا گئے نگلا نہ گیا تو تھوک دیا انسی خاندان کی بیٹی تہیں ام حبیبہ ان کے حالات پڑھکر خدا کی قدرت یاد آتی ہے کہ الھدایۃ امن من لدیہ

گر آری عمیلے ز تبخشا نہ کنی آشنائے ز بیگانہ

حسن ز بصرہ بلال از حبش صہیب از روم ز خاک مکہ ابوجہل ایں چہ بوالعجبی ست

اہل مکہ نے برابر ۱۳ برس بھیسی جیسی ایذائیں پیغمبر اور انکے مویدان کو دی تھیں

اُن کا وہ سلوک تو جزاء سیئۃ سیئۃ مثلہا[1] کی رو سے حق تھا کہ پیغمبر صاحب

فتح مکہ کے بعد خانہ کعبہ کو محفوظ چھوڑ کر لاتذر علی الارض من الکفرین دیارا[2] پر عمل

کریں مگر یہیں سے تو ہمکو پیغمبر صاحب کی صداقت کا بڑا قوی ثبوت ملتا ہے[3]

بدی را بدی سہل باشد جزا اگر مردی احسن الی من اسا

کہ انہوں نے مکہ میں داخل ہونے سے پہلے امن عام کی منادی کرادی اور

شہر میں داخل ہوئے تو اونٹنی پر سر جھکائے سجدہ شکر بجالاتے ہوئے داخل

ہوئے جس سے سب پر ظاہر ہوگیا کہ ان کو کسی سے ذاتی پرخاش تھی ہی

نہیں الحب للہ والبغض فی اللہ[4] اور ابوسفیان کے ساتھ تو وہ کیا کہ

گر تا سے جو مرے تو زہر کیوں دو آدمی تھا غیور اور مغرور تھا اُس کی یاست

کا لحاظ کیا کہ امن عام کی منادی میں اس کا نام بھی خصوصیت کے ساتھ داخل

تھا۔ من دخل دار ابی سفیان فھو امن[5]۔ پھر فتح مکہ کے ایک مہینے حنین کی لڑائی

ہوئی تو اس میں مسلمانوں کو بہت لوٹ ملی تھی اس اثنا میں ابوسفیان بھی

مسلمانوں میں آملا تھا پیغمبر صاحب نے مال غنیمت مسلمانوں میں تقسیم کیا

تو ابوسفیان کے جو بتی کو سو اونٹ اور چالیس اوقیہ چاندی اسکو اور

[1] برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی [2] اے میرے پروردگار ان کافروں میں سے کسی متنفس کو بھی زندہ نہ چھوڑ کہ روئے زمین پر رستا بستا رہ جائے ۱۲ [3] جو برائی کرے اسکے ساتھ بھلائی کرے ۱۲ [4] خدا ہی کے لیے محبت کیجاتی اور خدا ہی کے بارے میں دشمنی ۱۲ [5] جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوگا اُسے امن ملے گا۔

اور اس کے بیٹوں معاویہ اور یزید کو مرحمت فرمائے کہ آخر تھا تو آدمی الانسان عبید الاحسان مارے شرم کے آنکھیں سامنے نہیں کر سکتا تھا اور پھر تو وہ غزوہ طائف میں شریک بھا دہو اور ایک آنکھ کھو آیا پھر حضرت عمرؓ کے خلافت میں یرموک کی لڑائی ہوئی اس میں بھی ابوسفیان شرمندگی مٹانے کو شریک تھے اور دوسری آنکھ کھوئے ہم کو ابوسفیان کی پچھلی مخالفتوں کا خیال آتا ہے ادب و تعظیم تو درکنار انکا نام لینے کو بھی جی نہیں چاہتا مگر پھر سوچتے ہیں تو ہمارا غیظ و غضب جو کچھ بھی سمجھو متفرع ہی پیغمبر صاحب اور اسلام کی ہوا خواہی پر لیکن پیغمبر صاحب سے بڑھکر تو ہم کو اسلام کا درد ہونے سے رہا انہوں نے تو ابوسفیان کے اسلام کو لالچ سے تھا تو اور دب کر تھا تو بطوع خاطر مانکر اس کے پچھلے قصور سب معاف کر دیئے تھے اور یہانتک اس کی طرف سے مطمئن ہو گئے تھے کہ اسکو نجران کا عامل مقرر کر دیا تھا پس خدا رسول جس کا قصور معاف کریں ہمکو کیا حق ہی کہ ہم اسکو بدستور خطاوار سمجھیں معاویہ کا معاملہ ابوسفیان کے معاملے سے کہیں زیادہ مشکل ہی یہ بھی باپ کی طرح فتح مکہ کے بعد ایمان لائے اور مولفت القلوب میں تھے۔ ام حبیبہ کے رشتے سے پیغمبر صاحب کے اصہار میں بھی تھے مگر اس قرابت میں انکو یا ابوسفیان کو کچھ دخل نہ تھا معاویہ سے پیغمبر صاحب نے پیغمبر صاحب نے کبھی کبھی وحی بھی لکھوائی ہے غرض صحابی ہونے کی فضیلت جو بجائے خود بڑی فضیلت ہی معاویہ کو حاصل ہی اس سے کسی کو انکار نہیں مگر پیغمبر صاحب کے خاندان یعنی اہل بیت کے ساتھ وہ سلوک کیا کہ نسل پیغمبر صاحب کو آخر کار برباد کر چھوڑا آدمی تھے چلتے ہوئے عمرؓ نے انکو شام اور عراق کا عامل مقرر کر دیا تھا قتل عثمانؓ کے بعد مدینے میں علیؓ کی خلافت پر بیعت ہوئی انہوں نے اس حیلے سے تخلف کیا کہ پہلے قاتل عثمانؓ سے

سلہ انسان احسان کا بندہ ہی

قصاص لیا جائے اور انکو گمان یہ تھا کہ علیؓ نے عثمانؓ کو قتل کرایا۔
غرض علیؓ کی بیعت معاویہ اور ان کے علاقہ والوں کے تخلف کی وجہ سے ناتمام رہی علیؓ اور معاویہ کے نزاع کا انجام یہ ہوا کہ مقام صفین میں دونوں کے لشکر صف آرا ہوئے اور طرفین کے تیس ہزار آدمی مارے گئے اور آخرکار ابوموسیٰ اشعری علیؓ کی طرف سے اور عمرو بن العاص معاویہ کی طرف سے حکم قرار پائے کہ جس کو خلیفہ قرار دیں وہی خلیفہ۔ چنانچہ اسنے ابوموسیٰ کو دہوکا دیکر اپنے تئیں حکم مستقل بنایا اور علیؓ کو خلافت سے معزول کر دیا علیؓ اور کوفیون نے جو علیؓ کے مددگار تھے عمرو بن العاص کے فیصلے کو نہ مانا اور خلافت بدستور دو عملی میں رہی کوفیوں کے خلیفہ علیؓ اور عراقیوں اور شامیوں کے معاویہ یہاں تک کہ علیؓ عبدالرحمن بن ملجم کے ہاتھ سے شہید ہوئے اور ادہوری اور متنازع خلافت کے لیے کوفیوں نے حسنؓ کے ہاتھ پر بیعت کی آخر حسنؓ نے خلافت کے دردسر کو اپنی اور عامہ مسلمین کی عافیت میں مخل انداز سمجھکر یہ کالائے بد معاویہ کے سر ماری پھر بھی معاویہ کو نسل اہل بیت کے طرف سے کھٹکا لگا رہا اور اسنے اپنے بیٹے یزید کے لیے بیعت لینی شروع کی حسینؓ نے کیا انکار دونوں میں لڑائی ٹھنی اس لڑائی کا جو کچھ انجام ہوا آج تک مسلمان اسکو روتے پیٹتے ہیں اور اسکے سوائے وہ کر بھی کیا سکتے ہیں ؎

نہ ماند ستمگار بد روزگار ۔ بماند برو لعنت پائدار
پنداشت ستمگر کہ جفا بر ما کرد ۔ برگردن او بماند و بر ما بگذشت

اب ہم پھر اصل مطلب کی طرف لوٹتے ہیں

بیبی ام حبیبہ کا نام صفیہ تھا اور وہ بیٹی تہیں ابوالعاص بن امیہ کی جو حضرت عثمان ذوالنورین کے دادا تھے اس لحاظ سے صفیہ حضرت عثمان کی پھوپی

اور اُم حبیبہ اُنکی پھوپی زاد بہن ہوئیں غرضکہ بیبی اُم حبیبہ کا حسب نسب یہاں وہاں
دونوں طرف سے نہایت شریف نہایت معزز و ممتاز ہے بیبی اُم حبیبہ پیغمبر صاحب کی
بعثت سے ۱۷ برس پہلے پیدا ہوئیں یعنی جس وقت پیغمبر صاحب نے رسالت کا
دعویٰ کیا اُن کی عمر ۱۷ برس کی تھی اس وقت اگرچہ اِنکے باپ ابوسفیان
اور بھائی معاویہ اسلام کے سخت مخالف اور پیغمبر صاحب کے دشمن اور
جان کے لاگو تھے مگر انہوں نے اپنی بلند خیالی اور دانشمندی اور دور اندیشی
کی مدد سے اسلام کی حقانیت اور پیغمبر صاحب کی صداقت بغیر کسی تردد اور تذبذب
کے تسلیم کرلی اور بے چون و چرا مسلمان ہوگئیں ہر چند کہ ابوسفیان اور خاندان
کے تمام لوگوں نے مزاحمت کی اور طرح طرح کی تکلیفیں بھی پہنچائیں لیکن ام حبیبہ کی
ثابت قدمی اور استقلال میں ذرہ بھی فرق نہ آیا - ان کی پہلی شادی عبیداللہ
بن حجش سے ہوئی جو نہایت سیدھا سادہ آدمی تھا اور جو ام حبیبہ کی ترغیب سے
اُن کے ساتھ ہی مسلمان ہوگیا تھا مسلمانوں کو ہجرت حبشہ کی اجازت ہوئی
تو یہ دونوں میاں بیوی بھی کفار کے مظالم اور سخت گیریوں سے بچنے کے لیے
حبشے ہجرت کرگئے یہاں آکر عبیداللہ نصرانی ہوگیا یہ وقت ام حبیبہ کے لیے
بڑا مشکل اور نازک وقت تھا کوئی اور عورت تو عورت مرد بھی ہوتا تو شاید اس
موقع پر اس کے قدم ڈگمگا جاتے مگر انہوں نے اُسوقت بھی اپنے مردانہ استقلال
میں ذرہ بھی فرق نہ آنے دیا اور فوراً عبیداللہ سے الگ ہوگئیں عبیداللہ سے
اُن کے ہاں ایک لڑکی حبیبہ نام پیدا ہوئی تھی جس کے نام پر انہوں نے
اپنی کنیت ام حبیبہ رکھ لی تھی پیغمبر صاحب کو مکے میں جب یہ خبر پہنچی تو آپ کی
رحمدلی اور ہمدردی اس امر کی متقاضی ہوئی کہ ام حبیبہ کو جس نے اسلام کی
خاطر اتنی تکلیفیں اُٹھائیں اور زحمتیں جھیلی ہیں اُس کی تسلی اور دلجوئی کیلئے

اپنے نکاح کا پیام بھیجنا چاہیے چنانچہ آپنے عمرو بن امیہ ظمری کو اپنا خط دیکر جشے کے بادشاہ نجاشی کے پاس روانہ کیا خط میں نجاشی کو لکھا گیا تھا کہ اپنی وکالت سے میرا نکاح ام حبیبہ کے ساتھ کردو اور ساتھ ہی مہر بھی ادا کردو نجاشی پیغمبر صاحب کے حکم کی فوراً تعمیل کی اور ام حبیبہ کا آپ سے نکاح کردیا۔ اس نکاح کی کیفیت خود ام حبیبہ اپنی زبان سے اس طرح بیان کرتی ہیں کہ میں جشے کے ملک میں تنہا اور اکیلی رہتی تھی اور اسی وجہ سے متوحش اور پریشان تھی میرا شوہر عبید اللہ جو جشے میں عیسائی ہوگیا تھا اس سے میں پہلے ہی الگ ہوگئی تھی جب وہ مرگیا تو تھوڑے دنوں بعد نجاشی کی لونڈی جسکا نام ابرہہ تھا اور جو نجاشی کے بیٹیوں کی کنگی چوٹی اور بناؤ سنگار پر مامور تھی میرے پاس آئی اور لگی کہنے کہ بیبی! بادشاہ نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے اور پیام دیا ہے کہ جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے خط میں لکھا ہے کہ میں اپنی وکالت سے انکا نکاح تمہارے ساتھ کردوں میں یہ پیام سنکر بہت خوش ہوئی اور ابرہہ سے کہا کہ جیسی تو میرے پاس خوشخبری لائی ہے خدا تجھکو نیکی اور برکت کی خوشخبری دے اور جھٹ اپنے ہاتھوں کے چاندی کے دو کڑے اور انگلیوں کے انگوٹھی چھلے اوتار ابرہہ کے حوالے کیے ابرہہ نے کہا اور ہاں مجھے بادشاہ نے یہ پیام بھی دیکر بھیجا ہے کہ تم اپنی طرف سے کسی ایسے شخص کو کھڑا کردو جو اپنی وکالت سے تمہارا نکاح کردے میں نے خالد بن سعید کو جو جشے ہی میں موجود تھے کہلا بھیجا شام ہوئی تو نجاشی نے جعفر بن ابی طالب و عثمان بن عفان اور جس قدر مسلمان جشے میں تھے سب کو بلا بھیجا اور سب جمع ہوگئے۔

خالد بن سعید کی طرف سے ایجاب و قبول ہوچکا تو نجاشی نے چار سو دینار اٹھاکر خالد کو دیدیئے اور خالد نے جوں کے توں میرے پاس بھیجدیئے

نکاح ہو چکے تو پیچھے لوگ اُٹھکر چلنے لگے تو نجاشی بولا سب صاحب ٹہر جائیں کیونکہ
انبیا علیہ السلام کا مسنون طریقہ ہی کہ نکاح کے بعد طعام ولیمہ کہلایا جائے
پس سب لوگ ولیمے کا کہانا کہا کر جائیں یہ کہکر نجاشی نے کہانا منگایا اور سب
لوگ کہا کر چلے گئے اس کے دوسرے یا تیسرے روز نجاشی نے اسی لونڈی
ابرہہ کے ہاتھ بہت سا مشک و عنبر میرے پاس بہیجا اور شرحبیل حسنہ کے ساتھ
مجھے نہایت حفاظت سے مدینے روانہ کردیا

پیغمبر صاحب کا نکاح بیبی ام حبیبہ سے سنہ ۶ھ کے آخیر میں ہوا ابوسفیان
کو جب یہ خبر پہنچی کہ پیغمبر صاحب نے ام حبیبہ سے نکاح کرلیا ہے تو وہ آپ کا
سب سے زیادہ دشمن سب سے زیادہ مخالف تہا مگر اُس نے صرف لفظوں
میں کہدیا ذالک الفحل لا یقدع انفہ یعنی وہ ایک ایسا جوانمرد ہے جس کی
عزت پر کسی طرح کا دہبہ نہیں ہے ابوسفیان ابہی تک بہی مسلمان نہیں ہوے تھے
مگر اسلام چپکے چپکے اپنی اپنی حقانیت اور صداقت کا اثر ان کے دل میں پیدا کررہا تھا
اسی اثنا میں قریش قبیلہ بنو خزاعہ سے لڑ پڑے جو پیغمبر صاحب کا حلیف اور
ہم عہد تھا اور معاہدہ یہ تھا کہ پیغمبر صاحب کے کسی حلیف سے نہیں لڑینگے
اب جو قریش کی طرف سے نقض عہد ہوا تو ابوسفیان کو پیغمبر صاحب سے
تجدید عہد کرنے کی غرض سے مدینے جانا پڑا یہاں آئے تو اپنی بیٹی ام حبیبہ سے
ملنے کے لیے اُن کے مکان پر پہنچے بیبی ام حبیبہ نے انکو اندر بلا لیا اور جہٹ
اس گدے کو تہ کرکے الگ رکہہ دیا جسپر پیغمبر صاحب تشریف رکہا کرتے تھے
ابوسفیان نے اُنکی یہ حرکت دیکہکر پوچھا کہ کیا تم نے یہ گدا اس غرض سے
اُٹھا لیا کہ میں اسپر نہ بیٹھ سکوں بیبی اُم حبیبہ نے مذہبی جوش کی دہن
میں کہا کہ ہاں اس ارادے سے اُٹہایا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تم

مشرک ہو اور یہ پیغمبر خدا کا فرش ہی ابوسفیان نے کہا ام حبیبہ! تو بہت ہی برائی

یادِ فاطمہؓ

از ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے پی ایچ ڈی

فاطمہ بنت عبداللہ یعنی وہ بی بی جس نے جنگ طرابلس میں زخمیوں کی خدمت ایسی کی کہ تمام دنیا میں نام روشن ہوگیا اور جس نے شہدا کو دم مرگ پانی پلانے میں اپنی جان تک کی پروا نہ کی۔

فاطمہ! تو آبروے ملت مظلوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مشت خاک کا معصوم ہے

کس قدر عزت تجھے اے حور صحرائی ملی
غازیانِ ملت بیضا کی سقائی ملی

ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر
دل کہ برگِ نازکِ گل سے بھی تھا پاکیزہ تر

موت کے اندیشۂ جانکاہ سے بیگانہ تھا
موجۂ خوں کی ہم آغوشی سے بھی ڈرتا نہ تھا

یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی

سینۂ ملت میں ایسا جلوہ نا دیدہ تھا
جس کے نظارہ کو اک عالم سراپا دیدہ تھا

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

فاطمہ! گو شبنم افشاں آنکھ تیرے غم میں ہے
نغمۂ عشرت بھی اپنے نالۂ ماتم میں ہے

رقص تیری خاک کا کتنا نشاط انگیز ہے
ذرہ ذرہ زندگی کے سوز سے لبریز ہے

ہے کوئی ہنگامہ تیری تربتِ خاموش میں
پل رہی ہے ایک قومِ تازہ اس آغوش میں

بے خبر ہوں گرچہ ان کی وسعتِ مقصد سے میں
آفرینش دیکھتا ہوں انکی اس مرقد سے میں

یعنی نوزائیدہ تاروں کا فضا میں ہے ظہور
دیدۂ انساں نا محرم ہے جن کی موجِ نور

جو ابھی ابھرے ہیں ظلمت خانۂ ایام سے
جن کی ضو نا آشنا ہے قیدِ صبح و شام سے

ہے ابھی جن کے لیے رفتار کی لذت نئی
آسماں کا خم نیا وسعت نئی عظمت نئی

جن کی تابانی میں اندازِ کہن بھی نو بھی ہے
ہو بہو صورت بنت عبداللہ کا پرتو بھی ہے

آسمانی دولت

رات کی تاریکی۔ سردی کا موسم ٹھنڈی ہوا اور ایک تھکا ماندہ مسافر مینہ کی موسلادھار میں بھیگتا ہوا۔ لکڑی ہاتھ میں لئے راستہ ٹٹولتا ہوا بلند و پست پہاڑیوں میں ایک پیچ در پیچ ناہموار اور پتھریلی پٹیا پر چلا جا رہا ہے۔ بھوک دن بھر کی تکان اور بے خوابی نے اُسکا جسم خستہ اعضا نڈھال اور دماغ پراگندہ کردیا ہے۔ اس کے پھٹے پرانے کپڑے بارش میں بھیگ جانے سے اس کا نحیف اور مرجھایا ہوا جسم سردی کی شدت سے تھر تھر کانپ رہا ہے۔ اس کے قدم لڑکھڑاتے ہوئے کہیں کے کہیں پڑتے ہیں اور ان سب مصیبتوں پر طرہ یہ کہ یہ کمبخت مسافر نہیں جانتا کہ اس کی منزل مقصود کہاں ہے اور وہ کس طرف جا رہا ہے۔

اس تنہائی اور مصیبت کا شریک صرف ایک چھوٹا سا سفید خوبصورت کتا ہے۔ جس کا پاؤں زخمی ہونیکے سبب اُسے وہ ایک ہاتھ سے بغل میں دبائے اُٹھائے چلا جا رہا ہے۔ چلتے چلتے اُسکا پاؤں زخمی ہونیکے سبب جسے وہ ایک ہاتھ سے بغل میں دبائے اُٹھائے چلا جا رہا ہے خود اُسکا پاؤں دفعتہً ایک پتھر سے ٹھوکر کھاتا ہے اور وہ چلکر فوراً ہی گر پڑتا ہے اور بیہوش ہو جاتا ہے۔ قدرت کے عناصر ہوا اور مینہ اپنا عمل جاری رکھتے ہیں اور گرد و پیش میں کوئی چیز ایسی نظر نہیں آتی جس کو اس بوڑھے کی اس حالت کی خبر ہو۔ وفا اور محبت کی ننھی سی جان۔ رفاقت کا حق ادا کرنیکو ادھر اُدھر نظر کرتی ہے مگر انسان۔ حیوان کسی متنفس کے نزدیک ہونیکے کوئی آثار دکھائی

نہیں دیتے۔ آخر مایوس ہو کر یہ چھوٹا کتا نا امیدی کی چیخ و پکار شروع کر دیتا ہے اور آسمان کی طرف منہ کر کے خدائی امداد کو چلا چلا کر بلاتا ہے۔ آسمان والے بے زبان کی فریاد کو شاید بہت جلد قبولیت تک پہنچا دیتے ہیں چنانچہ اس کی درد بھری ہلکی آواز جو دس بیس قدم پر بھی مشکل سے سنی جا سکتی اب رات کی خاموشی میں ہوا کے رخ سے کم و بیش آدہ میل کے فاصلے پر ایک جھونپڑے تک جو پہاڑی پر بنا ہوا ہے پہنچ جاتی ہے۔ اس جھونپڑے کی مالک ایک جوانی ڈہلی ہوئی عورت جو اتنی رات گزرے تک لیس بنانے کا کام چراغ کے سامنے بیٹھی کر رہی ہے۔ یہ آواز سنکر دل میں سوچتی ہے کہ جس طرف سے یہ آواز آ رہی ہے اُدہر نہ کوئی بستی ہے نہ مکان۔ آخر کار اس کتے کی آواز کے کیا معنی؟ یہ دل میں خیال کر کے یہ باہمت عورت اس آواز کے سراغ پر چل کھڑی ہوتی ہے اور جوں جوں قریب آتی جاتی ہے ووں ووں وہ آواز زیادہ صاف اور بلند سنائی دیتی ہے۔ آخر جب وہ اس جگہ پہنچتی ہے جہاں وہ مسافر بیہوش پڑا ہے تو کتا اسکو آتا دیکھکر شکریہ کے لہجہ میں کُوں کُوں کرتا ہوا دم ہلا کر اس کی طرف بڑھتا ہے

پانچ سات منٹ بعد جب اس بوڑہے کو ہوش آتا ہے تو اپنے سر کو ایک عورت کی گود میں رکھا ہوا پاتا ہے۔ جو ٹکٹکی باندھے ہوئے اُس کی طرف تک رہی ہے۔ اس کے آنکھیں کھولتے ہی وہ نہایت محبت آمیز اور ہمدردانہ لہجہ میں پوچھتی ہے "ہیں تمہاری طبیعت اب اچھی ہے نا؟ چلو یہاں قریب ہی میرا مکان ہے وہاں تمہیں ہر طرح کا آرام ملے گا چلو اُٹھو" یہ سنکر بوڑہا ہاں ہوں کر کے پھر آنکھیں بند کر لیتا ہے مگر یہ نیک بخت عورت اُسے سہارا دیکر جوں توں کر کے کھڑا کر دیتی ہے اور

اپنے جھونپڑے کی طرف اس بوڑھے کو سنبھالے ہوئے آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی ہوئی چل دیتی ہے۔ اور وہاں پہنچکر اس کے پانی سے تر بتر کپڑے اُتار کر صندوقچی میں سے ایک گرم کوٹ اور پاجامہ نکالتی ہے اور بوڑھے سے التجا کہتی ہے "یہ کپڑے میرے والد مرحوم کی یادگار ہیں مجھے امید ہے کہ آپ انکو مہربانی فرما کر پہننے میں تامل نکریں گے۔ آپ یہہ پہنئے۔ اتنے میں آپ کے لیے چا بنا کر لاتی ہوں"۔

بوڑھا جس کا نام داؤد ہے اس محبت بھرے حکم کی تعمیل بے اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور تھوڑی دیر میں مریم جو اس گھر کی مالکہ کا نام ہے گرما گرم چا بنا کر لاتی ہے اور داؤد کو پلا کر جلدی سے ایک چھوٹی سی کوٹھری میں اُسکے لیے بچھونا بچھا دیتی ہے اور اسکو وہاں لٹا دیتی ہے اور آپ علیحدہ برابر والی کوٹھری میں سونے کے لیے جاتی ہوئی ایک گھنٹی اس کے پاس رکھ جاتی ہے اس درخواست کے ساتھ کہ اگر رات کو کسی وقت تمہیں میری ضرورت ہو تو اس گھنٹی کو بجا دینا۔

بوڑھا داؤد سردی سے اکڑا ہوا دن بھر کا تھکا ماندہ چا پیتے ہی غافل ہو کر سو جاتا ہے اور صبح کو اسوقت آنکھ کھولتا ہے جب آفتاب افق پر پہنچ جاتا ہے اور مریم کو اپنے سرہانے بیٹھی ہوئی لیس بنانے میں مصروف پاتا ہے۔ مریم اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر فرزندانہ محبت کے لہجہ میں پوچھتی ہے "کیوں اب تمہاری طبیعت اچھی ہے نا؟" مگر درد و بخار کی شدت میں ہاں ہوں کر کے ٹال دیتا ہے لیکن دل میں سوچتا ہے کہ خدایا میں کہاں ہوں۔ یہ مکان کس کا ہے؟ اور یہ مہربان عورت کون ہے؟ یہ سوچتے سوچتے اس پر کچھ غفلت طاری ہو جاتی ہے اور مریم اسکو اس حالت

اس حالت میں چھوڑ کر مکان کا باہر لا دروازہ بند کر کے گاؤں کیطرف جو اس کے مکان سے کچھ زیادہ دور نہیں ہے جاتی ہے اور تھوڑی دیر میں اس گاؤں کے مشہور حکیم کو اپنے ساتھ لے آتی ہے۔

چار پانچ روز میں اس حکیم دیہاتی علاج اور مریم کی دلسوز تیمارداری کے سبب داؤد تقریباً تندرست ہو جاتا ہے اور جو ہمدردی گاؤں والے اس کی مزاج پرسی کر کے اسکے ساتھ ظاہر کرتے تھے اس پر تعجب کرتا ہے اور دل میں خیال کرتا ہے کہ اس سچی ہمدردی اور خلوص کا مقابلہ جو گاؤں والے ایک اجنبی مفلس اور ضعیف شخص کے ساتھ کرتے ہیں اگر اس خودغرضانہ خوشامد اور چاپلوسی سے کیا جائے جو اہل شہر میں پائی جاتی ہے تو دونوں کے اخلاق میں ایک بین فرق معلوم ہوتا ہے۔ بلاشبہ ان جاہل گاؤں والوں کے خیال میں راستی۔ ان کے اقوال میں سچائی ان کے تعلقات میں خلوص۔ ان کے برتاؤ میں سادہ پن محنت و رنج میں توکل اور اپنی بری یا بھلی حالت پر قناعت ایسی خوبیاں ہیں جن سے شہر والوں کے مکر و ریا۔ خودغرضی تکلیف نخوت نمود و نمایش اور بے اطمینانی کو کوئی نسبت نہیں یہ کیسے سادہ دل لوگ ہیں۔ ان کے ظاہر و باطن کی موافقت کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ اُن کے کام میں تصنع ظاہرداری اور تکلف کو نام نہیں۔ ستایش غرور اور خودپرستی سے یہ بالکل آزاد ہیں جاہ طلبی اور دولت کی حرص جن کے سبب انسان دہوکہ دغابازی اور مکاری پر آمادہ ہوتا ہے انکے دامن عموماً ان داغوں سے پاک ہیں۔ بیشک اُن کی سادہ اور قانع زندگی پر جو یہ لوگ اپنے ٹوٹے ہوئے کچے جھونپڑوں میں بسر کرتے ہیں وہ عیش و آرام جو ساز و سامان سے بھرے ہوئے

آراستہ محلوں میں خدمت گاروں کی دوڑ دھوپ کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ ملتا ہے ہزار بار قربان۔ اُن کی خواہشات محدود اور سہل الحصول۔ اور اسی لیے اُن کی خوشیاں زیادہ۔ اُن کے دل مطمئن اور مسرور اپنے حال میں خوش اور اپنی کھال میں مست۔ دنیا کی کشمکش سے مستغنی۔ اے وہ لوگو! جو اپنے آپ کو تہذیب اور شائستگی سے آراستہ۔ زمانہ موجودہ کی ہر نئی ایجاد سے بہرہ مند تازہ ترین فیشن کے مطابق زندگی بسر کرنیوالے سمجھکر ان جاہل نصف بدن ڈھکے ہوئے دیہاتیوں پر نظر حقارت کرتے ہو۔ دیکھو۔ تم دھوکہ میں ہو۔ یہ دیہاتی تم سے زیادہ خورسند۔ تم سے زیادہ شادماں ہیں۔ دلی اطمینان اور خوشی جس کے حصول میں تم اپنی زندگیاں صرف کردیتے ہو اور نہیں پاتے۔ ان کو ہر قدم پر میسر ہے انسان کی خوشی اور عظمت کا راز قناعت ہے اور قناعت قلت حاجت ہی سے مراد ہے۔

دولت کی ہوس اصل گدائی ہے یہ	ساماں کی حرص بے نوائی ہے یہ
حاجت کم ہے تو ہے یہ شاہنشاہی	اور کچھ نہیں حاجت تو خدائی ہے یہ

داؤدان ہی خیالات میں غرق تہا کہ اس کا چھوٹا کتا جو فی الحقیقت اس کی جان بچانیکا سبب ہوا تھا اس کے پاؤں میں آکر لوٹنے لگتا ہے اور اپنے آقا کا شکریہ حاصل کرتا ہے جسکو وہ اپنے ہاتھ پھیر کر یہ کہتا ہوا ظاہر کرتا ہے خدا کی قدرت اور شان۔ اپنے بدترین مخلوق کو جسے مغرور انسان ذلیل اور حقیر ترین سمجھتا ہے وہ گوہر بے بہا عطا کیا ہے جسے انسان اپنی خودغرضی سے کھو بیٹھا ہے۔ سچی محبت۔ خالص وفاداری اور احسان کا بار بار اقرار و شکریہ کتے کی فطرت میں ایسا مضبوطی کے ساتھ ودیعت کیا ہے کہ جس سے انسان باوجود اشرف المخلوقات کہلانے کے اگر مطلقاً نہیں تو قریب قریب محروم

ہے۔ اے شارلی۔ تو میرا پیارا کتا ہے۔ تو نے میری جان بچائی ہے تیری محبت اور وفاداری کا تجھے کیا بدلہ دوں۔ بتا۔ تو کیا چاہتا ہے۔ ایک ہڈی پا کر جسقدر تو خوش ہوتا ہے۔ اسقدر خوشی ایک لکھپتی کو لذیذ سے لذیذ کھانے کھاکر بھی نصیب نہیں ہوتی۔ بیشک اُن عزیزوں۔ دوستوں اور خادموں سے جن کی محبت دوستداری۔ اور خیر خواہی میں خودغرضی پنہاں ہے۔ ایک کتا جو فطرتاً وفادار اور جاں نثار ہے ہزار درجہ بہتر رفیق ہے۔

چندروز گزرنے کے بعد داؤد بالکل صحیح وتندرست ہو جاتا ہے اور مریم کے ہمراہ اکثر گاؤں آنے جانے میں اس کی واقفیت اور دوستی گاؤں والوں سے اور زیادہ ہو جاتی ہے گاؤں والے اسکے ساتھ خلوص اور محبت سے برتاؤ کرتے ہیں اور اس کی وجہ زیادہ تر یہی ہے کہ مریم نے اس اندیشہ سے کہ عام طور پر دیہات کے لوگ ایک آوارہ اجنبی کو شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس لئے داؤد کو بھی وہ چور اچکا خیال کرکے اس سے پرہیز کریں اور خود لُسے ایک آوارہ اجنبی فقیر کو اپنے پاس ٹہرانے سے بُرا بھلا نہ کہیں یہ مشہور کردیا تھا کہ داؤد اُسکے باپ کا ایک قدیمی دوست ہے اور وہ اس کی تلاش میں یہانتک پہنچا ہے۔ گاؤں والوں کے اطمینان کے لیے یہ بات کافی تھی۔ داؤد سے بھی جب کسی نے اس کی نسبت کچھ پوچھا تو اس نے یہی جواب دیا کہ میں ایک دوست کی تلاش میں پھرتا ہوں۔ گاؤں والوں کو زیادہ تفتیش کرنے اور مزید حالات معلوم کرنیکی زیادہ ضرورت تھی نہ شوق اور اس لیے وہ داؤد کو مریم کا مرحوم باپ دوست سمجھکر نہایت مہربانہ سلوک کرتے تھے۔

مریم کی نسبت داؤد کو ابتک جو کچھ معلوم ہوا وہ یہ تھا کہ یہ نیک دل عورت تن تنہا پاکدامنی کے ساتھ محنت کرکے گزران کرتی ہے۔ دو ایک برس ہوئے

اُس کا باپ جو بڑھئی کا پیشہ کرتا تھا مر گیا ہے اور چونکہ وہ گل کاری کا کام خوب جانتی ہے اس لیے وہ خودمختارانہ زندگی اپنی محنت سے بسر کرتی ہے نہ اس کا کوئی قریب ہے نہ عزیز ہے اور نہ اُس کی ابتک شادی ہوئی ہے اگرچہ اس کی عمر تیس ہے اور شادی نہ ہونیکا سبب یہ تھا کہ وہ جب بیس برس کی تھی تو اس کی ایک جگہ نسبت ہوئی اور جب شادی کے دن قریب آئے تو اسکے باپ کو دفعتہً ایک ٹھیکہ میں نقصان ہوا اس لیے اُسکے منسوب کو جو امید مریم کے ساتھ شادی کرکے بہت سا نقد روپیہ اور مال ملنے کی تھی جاتی رہی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نسبت بھی ٹوٹ گئی اور جو صدمہ اور رنج مریم کو اس سے ہوا اس کے لیے اس نے مصمم ارادہ کرلیا کہ اب تمام عمر شادی نکروں گی۔ اس کا خیال یہ تھا کہ شادی ایک مضبوط گرہ ہے محبت اور صرف محبت ہی کی زنجیروں میں جس سے زن و شوہر ایسی مضبوطی سے باندھے جاتے ہیں کہ موت ہی فقط ان کو جدا کرسکتی ہے اپنے منسوب سے جو محبت دل ہی دل میں وہ کرنے لگتی ہے اور آئندہ زندگی کی خوشیوں کا تصور کیا کرتی۔ پھر جب اس پر یہ ناگوار حقیقت روشن ہوئی کہ شادی کے معاملہ میں سب سے زیادہ جاہ و دولت کا خیال طرفین کو ہوتا ہے۔ اور نیک خصلت عمدہ اخلاق - اور محبت جو فی الحقیقت شادی کی زندگی کو مسرور کرسکتے ہیں ان کی مطلق پروا نہیں کیجاتی تو اُسے وہ صدمہ ہوا کہ نہ صرف شادی کے خیال کو اس نے دل سے نکال دیا بلکہ مرد کی صورت سے اس کو نفرت ہوگئی اور سوائے اپنے بوڑھے باپ کی خدمت کرنے کے اپنی زندگی کا مقصد اُس نے کچھ اور نہ رکھا لیکن جب سے اس کے باپ کا انتقال ہوگیا تھا اور وہ تنہائی کی زندگی بسر کرتی تھی اسوقت سے اس کو اپنی زندگی بے مقصد خالی خالی اور کٹھن معلوم ہونے لگی تھی۔ زیادہ تر اس لیے

کہ خدا نے اس کی طبیعت میں جذبۂ محبت زیادتی کے ساتھ ودیعت کیا تھا۔ باپ کے مرنیکے بعد کوئی چیز اُسے گرد و پیش میں ایسی نظر نہ آتی تھی جسپر وہ یہ پاک جذبہ صرف کرے اور اگرچہ کئی بار پھر اسکو شادی کے پیغام آئے مگر اُس نے اس درشتی سے انکار کیا کہ آیندہ یہ درخواست اس سے کرنیکی کسی کو جرات ہی نہوتی تھی جس طرح قدرت نے پھولوں کو خوبصورتی بھی عطا کی ہے اسطرح نیک دل مریم کو بھی خدا نے جسمانی خوبصورتی سے محروم نہ رکھا تھا اگر وہ حسن کا کامل ترین نمونہ نہ تھی تو کم سے کم یہ کہا جا سکتا ہے کہ دیہات کے لوگوں کی خوبصورتی کی بہترین مثال تھی۔ اور اس کے دلکش چہرے کو اس کی پاکدامنی اور نیک دلی کے نور نے ایسا روشن اور منور بنا دیا تھا جس سے اُسکا رعب حسن غیر معمولی طور پر بڑھ گیا تھا۔ عام طور پر گاؤں کے لوگ اسکو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور بہ سبب اُس تھوڑی سی تعلیم کے جو اسکے باپ نے اسے دی تھی اور خداداد قابلیت و ذہانت کے گاؤں کی عورتیں اُس سے اپنے خانگی اُمور میں مشورہ لینے اکثر آیا کرتی تھیں اور اس سے باوجود اس کی بے بضاعتی کے اگر اسکو اُس گاؤں کی ملکہ کہا جائے تو کچھ بیجا نہوگا۔ مرد عورت بچے بوڑھے سب اس کے حُسن و جلال سے مرعوب تھے اور اسکو خاص وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اُس پاس کے شہر و دیہات کی بیگمات اور امیر عورتیں لیس اور گلکاری کے کام سب مریم کے پاس بھیجتی تھیں اور اس حلقہ میں بھی وہ ایسی ہی ہر دلعزیز تھی جیسی عوام میں بہرحال گرد و نواح کے خاص و عام اس کے زیر اثر کم و بیش ضرور تھے۔

چند دن اور رہنے کے بعد داؤد نے مریم سے کہا کہ میں تمہارے احسان کا بدلہ بہ سبب اپنی مفلسی کے کسی طرح نہیں دے سکتا۔ اور جس

شفقت اور ہمدردی سے تمنے میری تیمارداری کی اس کا شکریہ میری زبان ادا کرنے سے قاصر ہے۔ بیشک تم نے مجھ بوڑھے کو دوبارہ زندگی بخشی ہے اب مجھ میں اتنی طاقت آگئی ہے کہ میں پھر سفر کرسکوں۔ سوائے اسکے میں نہیں چاہتا کہ تمپر میرا بار پڑے۔ بس تم سے رخصت چاہتا ہوں۔ اور تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہارے احسانات کو میں ہرگز نہ بھولوں گا۔"

مریم نے آبدیدہ ہو کر جواب دیا "بوڑھے داؤد۔ اپنے باپ کی وفات کے بعد تم ہی پہلے شخص ہو جس سے مجھے محبت اور ہمدردی پیدا ہوئی ہے اگر تم چلے جاؤ گے تو مجھے بہت رنج ہوگا۔ میں تنہا ہوں اور اپنی محنت سے اتنا کما لیتی ہوں کہ ہم دونوں کے گزارہ کے لیے کافی ہو تم ضعیف ہو۔ راستہ کی تکالیف تم سے برداشت نہو سکیں گی میں نہیں سمجھتی کہ تم کیوں اور کس چیز کی تلاش میں سفر کرتے ہو کیا وہ تمہیں یہاں نہیں ملسکتی؟ میری خواہش تو یہ ہے کہ تم اپنی بقیہ عمر اس جھونپڑے میں بسر کرو۔ میں اپنے باپ کے بجائے تمہیں سمجھوں گی اور تمہارے خدمت کر کے تمہیں آرام پہنچانے کی کوشش کرونگی تم نہ جاؤ۔ کہیں مت جاؤ۔ اور یہیں رہو"

داؤد کچھ دیر تک سوچتا رہا اور پھر کہنے لگا "لیکن میں تمپر بار ہو کر رہنا نہیں چاہتا کچھ کام ایسا تبلاؤ جو مجھ سے ہو سکے اور میں بھی تمہاری قلیل آمدنی میں اپنی محنت سے کچھ اضافہ کرسکوں"

مریم نوراً بولی کہ اگر تم یہی چاہتے ہو تو ٹوکریاں بنانے کا کام میں تمہیں بہت جلد سکھا دوں گی اور تم اُس سے چار پانچ آنے روز کما سکوگے۔

داؤد نے اُسکو بخوشی قبول کیا اور وہاں سے روانگی کے ارادہ کو بالکل فسخ کر کے مریم سے ٹوکریاں بنانا سیکھنے لگا۔ اور ٹوکریاں فروخت کرنے

سے جو کچھ پیدا کرتا وہ روزانہ مریم کے حوالہ کر دیتا اس طرح رہتے ہوئے اُسے چندماہ گزر گئے اور مریم کے خلوص اور محبت نے اسکو اور زیادہ اپنا احسانمند بنالیا۔ وہ اپنے دل میں سوچتا تھا کہ وہ کیا بات ہے جس کے سبب مریم میرے ساتھ اسقدر خالص فرزندانہ محبت کرتی ہے۔ ظاہرا مجھ مفلس اور ضعیف سے اُسے کیا بدلے یا فائدے کی امید ہوسکتی ہے۔ مجھے جو کچھ زندگی کا تجربہ ہے وہ اس بات کا یقین نہیں دلا سکتا کہ خلوص اور محبت ایسی چیز ہے کہ بلا کسی غرض کے کسی کے ساتھ کیجائے

میری محنت اور مشقت کا بچپن جس کے سبب میں جوانی میں دولتمند ہوگیا اور پھر نذیرہ کے ساتھ شادی کی جس نے میرے ساتھ بیشک ابتدا میں محبت کی مگر افسوس اس کم بخت بدمزاج نے میری زندگی کو کسقدر تلخ کیا اور جب تک زندہ رہی اپنی بدطینتی فضول خرچی اور بدمزاجی سے مجھے ہمیشہ رنج و تکلیف دیتی رہی۔ اچھا ہوا اسلئے نذیرہ تو مرگئی۔ ورنہ میری زندگی کو بھی تو کم کر دیتی۔ مگر جو دو لڑکے اس نے چھوڑے۔ اُن کی تعلیم و تربیت میں مینے کسقدر کوشش کی۔ کسقدر پدرانہ محبت سے انکو ناز و نعمت میں پالا مگر میری کثیر دولت مال اور دونوں بیٹوں کی بدطینتی کو نہ بدل سکی۔ یہ دونوں کمبخت جب جوان ہوئے تو کسقدر خود غرض عیاش اور بدچلن نکلے۔ یہ دونوں ہر وقت میری موت کے خواہاں تھے۔ آہ کس لیے؟ کہ وہ کثیر دولت جو میں نے عمر بھر محنت اور مشقت سے جمع کی اُن کے قبضہ میں آجائے گی۔ اچھا ہوا یہ دونوں کمبخت بھی مرگئے۔ اِن تینوں کے مرنے سے میں فلک میں تنہا رہ گیا مگر میری زندگی کے رنج اور تکلیفیں کم ہوگئیں۔ میں اپنے کاروبار میں زیادہ دلچسپی سے مشغول ہوسکا اور اُسی منحوس رام سونڈل کو دیکھو کہ جس کمبخت پر صرف اس لیے

کہ میرے ہمسایہ کی لڑکی ہے۔ میں نے اپنے بچوں کی طرح روپیہ صرف کیا ۔ اُس کی ہزاروں خواہشات جو اُس کے غریب ماں باپ کبھی پوری نہ کر سکتے میں نے پوری کیں۔ مگر کیا اس لیے کہ جب وہ جوان ہو جائے تو مجھ ساٹھ برس کے بوڑھے سے جو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے شادی کے منصوبے باندھے ۔ صرف اس لیے کہ وہ لکھو کہا روپیہ جو میں نے عرقریزی سے پیدا کیا ہے اُس کی وارث و مالک ہو سکے ۔ اے دنیا تو کسقدر دولت پرست ہے ؟ سب اس دھوکہ میں ہیں کہ زندگی کی خوشی دولت میں ہے لیکن نہیں جانتے کہ داؤد جو آج کئی کروڑ روپیہ کا مالک ہے ۔ جس کا عظیم الشان محل اور اُس کا سامان ۔ دنیا کے شاہی محلوں میں بہتوں سے اچھا ہے ۔ جس کی مقروض اسوقت کئی سلطنتیں ہیں جس کی تجارتی کوٹھیاں نئی اور پرانی دنیا دونوں کے سب بڑے بڑے شہروں میں ہیں وہ داؤد جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ دنیا کی ایک تہائی دولت کا مالک ہے ۔ افسوس اس کثیر دولت کے باوجود وہ اپنی زندگی کو بدمزہ اور تلخ ہی پاتا ہے ۔ اس وسیع دنیا میں ایک بھی متنفس ایسا نہیں جو اس سے سچا خلوص اور بے غرضی کی محبت رکھتا ہو ۔ بہتوں نے اس سے یگانگت محبت اور رشتہ داری کا اظہار کیا ۔ مگر سب خود غرضی پر مبنی نکلا ۔ میں نے کس کی غرض پوری نہیں کی ؟ کس کی حاجت مجھسے بر نہیں آئی ۔ کون خواہش لیکر آیا ہے جو بے نیل مرام گیا ہے ؟ لیکن باوجود ان سب باتوں کے اس خود غرض دنیا میں میں نے سب کو خود مطلبی میں گرفتار پایا ۔ خدا نے مجھے دیا تھا دل ۔ دردمند ۔ محبت کرنیوالا ۔ میری فطرت اس کی مقتضی تھی کہ میں محبت کرتا اور کیا جاتا ۔ لیکن افسوس بیوی ملی تو اس رنگ کی اور اولاد ہوئی اس ڈھنگ کی ۔ نوکر اور خدمتگار ۔ جن کی فوج مجھے گھیرے

رہتی ہے ہر ایک میرا خوشامد چوس رہا ہے۔ غرض ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ جو کچھ میں نے جانفشانی سے کمایا ہے جایز یا ناجائز کسی وسایل سے اس کا مالک ہو جائے۔ میں خود بہت دنوں سے خواہشمند ہوں اور میرے دوست بھی مجھے یہی رائے دیتے ہیں کہ میں اپنی اس کثیر دولت کو ہبہ کر دوں۔ مگر کسکو کون مستحق ہے؟ مرنے کے بعد تو بہتیرے دور و قریب کے رشتہ دار کھڑے ہو جائینگے مگر ان میں سے میں تو کسی کو بھی اس قابل اور مستحق نہیں پاتا کہ اسے اپنا وارث بنا جاؤں۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ کوئی شخص ایسا ملے جو مجھسے صرف مجھسے (بلا خیال میری دولت کے) خالص بے لوث محبت کرنیوالا ہو۔ اور ایسے ہی شخص کی تلاش میں تن تنہا یہ فقیرانہ صورت بنا کر نکلا ہوں کون جانتا ہے کہ میں وہی کروڑپتی داؤد ہوں جس کا نام دنیا کے سب بڑے بڑے بازاروں میں زبان زد خلایق ہے۔ اخباروں میں یہ چھپا ہے کہ کروڑپتی داؤد تن تنہا اپنی صحت سنوارنیکو امریکہ گیا ہے۔ مگر کسے معلوم ہے کہ وہی داؤد فقیر کے لباس میں پا پیادہ گاؤں در گاؤں ایک دوست سچے دوست۔ خالص محبت کرنیوالے دوست کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے۔ آہ محبت! کا پیاسا۔ جام محبت ہی سے سیراب ہو سکتا ہے؟ کوئی دنیا کی نعمت محبت کا بدل نہیں ہو سکتی!! نہیں ہو سکتی! بیشک مریم نہیں جانتی کہ میں در اصل کون ہوں؟ وہ تو مجھے ایک فقیر بے گھر اور محتاج سمجھتی ہے اور یہی سمجھکر وہ مجھسے ہمدردی اور خالص محبت رکھتی ہے۔ ایک وہ لوگ تھے جو مجھسے بہ سبب میری بے انتہا دولت کے مجھسے اظہار محبت کرتے تھے۔ اور ان میں سے ایک سوزن تھی اور اُسے کسقدر مایوسی ہوئی ہوگی جب وہ مجھ بوڑھے کو اپنا گرفتار محبت کرنے میں ناکامیاب ثابت ہوئی۔ اور

ایک یہ مریم ہے کسقدر نیک دل جو مجھسے صرف اس لیے محبت کرتی ہے۔ کہ میں ضعیف ہوں۔ محتاج ہوں اور بیکس ہوں ۔ع۔ بہ بین تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔ اگر مریم کو یہ معلوم ہوجائے کہ میں فی الحقیقت کون ہوں اور کیا ہوں۔ تو کیا وہ یہ شفقت اور محبت میرے ساتھ رکھیگی؟ ہرگز نہیں؛ بلکہ فوراً ہی اُس کی محبت اور ہمدردی نفرت اور حقارت سے بدل جائیگی کیونکہ نہ صرف مریم بلکہ اکثر دیہاتی غریب لوگ شہر کے دولتمندوں سے حقارت آمیز نفرت کرتے ہیں۔ دولت کو یہ سادہ لوگ ایک بلا وبال اور مصیبت خیال کرتے ہیں انکا یہ خیال سچ ہے کہ دولت اُن کی آزادی کو معدوم کرنیوالی۔ ان کی سادہ خوشیوں کو فضول افکار اور پریشانیوں میں بدل دینے والی ہے۔ دولت سے یہ دیہاتی فلسفی شاید ایسے ہی ڈرتے ہیں جیسے متمول مفلسی سے مگر حقیقت یہ ہے کہ متمول میں خوشی ومسرت نہیں ہے۔ جن کو خدا دولت دیتا ہے انکو دلی اطمینان مسرت اور خوشی سے محروم کردیتا ہے اور جو دولت سے محروم ہیں وہ قناعت اور زندگی کی سادہ خوشیوں سے مالامال ہیں۔ پس مریم یہ معلوم کرکے ہرگز خوش نہوگی کہ اُسکے جھونپڑے کا شریک ایک کروڑپتی ہے لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ اگر میری بیحساب دولت کا وارث بننے کی کوئی مستحق ہے تو وہ صرف مریم ہی ہے۔"

اس میں کلام نہیں کہ داؤد کے آجانے سے مریم کی بھی دلبستگی ہوگئی تھی اور اُس کی تنہائی کی خالی خولی بے مقصد زندگی میں داؤد کی خدمت اور دلجوئی کا خیال اس کے لیے خاصی مصروفیت ہوگیا تھا۔ داؤد کے چلے جانیکا خیال اسکو پھر تنہائی کا رنج یاد دلاتا تھا۔ اس لیے اُس کی عین تمنا یہ تھی کہ داؤد اُس کے پاس رہے۔ چندون اور ان دونوںکو

ایک دوسرے کی دلجوئی کرنے میں نہایت مسرت سے گزرے کیونکہ داؤد کے دل میں یہ خیال روز بروز مستحکم ہوتا جاتا ہے کہ وہ اپنی تلاش میں کامیاب ہوگیا اور اس نے ایک دوست کی ایک سچے دوست کی محبت کو جسے وہ دنیاوی دولت کے مقابلے میں آسمانی دولت کہا کرتا تھا پالیا۔ اور خود بھی وہ مریم سے اسقدر خالص پدرانہ محبت کرنے لگا گویا وہ اسی کی فرزند تھی۔ اب وہ اس موج میں رہنے لگا کہ مریم کی زندگی کو ہر طرح خوش و خرم رکھے۔ اتفاق کی بات اور مریم کی خوش قسمتی اسی زمانہ میں ایک اجنبی اسی گاؤں میں سمندر کے کنارے ایک مکان کرایہ پر لیکر رہنے لگا اور اس کا مکان مریم کے مکان سے کچھ زیادہ دور نہ تھا۔ ایک دن داؤد صبح سیر کو گیا ہوا تھا اور سمندر کے موجوں کا تماشہ کنارے پر کھڑا دیکھ رہا تھا کہ اس اجنبی سے اسکی ملاقات ہوئی اور وہ اُسے اپنے ساتھ مکان پر لے آیا۔ اثنائے گفتگو میں جو کچھ اس کے حالات معلوم ہوئے وہ مختصراً یہ ہیں کہ وہ ایک مشہور دارالعلوم کا تعلیم یافتہ نوجوان ہے اور علمی مذاق رکھتا ہے۔ چند دنوں تک کسی اخبار کی اڈیٹری کرنے سے اُس کی صحت خراب ہوگئی اور اس لیے وہ تبدیل آب وہوا کے لیے شہر کی شورش و طوفان سے دور اس گاؤں میں آنکر مقیم ہوا ہے اور ایک علمی کتاب لکھنے میں آج کل مصروف ہے۔ چند ماہ تک وہ داؤد اور مریم کے پاس روزانہ آیا کرتا اور اپنی علمی تحقیقات اور خوش تقریروں سے دونوں کو محظوظ کیا کرتا۔ اکثر وہ اسی کتاب کے حصے جو وہ لکھ رہا تھا اپنے ساتھ لے آتا۔ اور پڑھ پڑھکر سُناتا۔ اور دونوں سے بحث کرتا۔ مریم کو اس کی علمی باتوں سے خاص دلچسپی تھی۔ اگرچہ اس مدت میں ان دونوں کو کبھی یہ خیال نہ گزرا کہ وہ ایک دوسرے کو کس حد تک

پسند کرتے ہیں۔ اُن کی طبیعت۔ اُن کا مذاق۔ ایک دوسرے کے کہانتک مناسب ہے اس لیے کہ مریم تو جذبہ محبت کو دل سے نکال ہی چکی تھی۔ اور شادی کا خیال اُس کے دل سے بالکل محو ہوگیا تھا۔ لیکن یہ نوجوان جو نام یوسف رکھتے ہیں بہ سبب اپنے علمی مذاق کے اور علمی تحقیقات میں منہمک ہونیکے اعتبار دل کے جذبات کے مردہ ہوگئے تھے۔ سوائے اس کے وہ طالبعلمی کے زمانہ میں ایک ایسی ہی شکست کھا چکا تھا جیسی کہ مریم۔ یعنی اس کی محبوبہ اور منسوبہ نے جس سے شادی کرنیکی تمنا وہ بچپن سے رکھتا تھا یکایک اس سے محبت قطع کردی اس لیے کہ وہ ایک دولت مند امیر کے ساتھ شادی کرنیکی خواہشمند تھی بہرحال مریم اور یوسف دونوں کے دل میں کبھی یہ خیال نہ گزرا کہ وہ ایک دوسرے سے میاں بیوی کے تعلقات قائم کرینگے لیکن بوڑھا داؤد اپنا منسوبہ دل ہی دل میں باندھتا رہا اور اس کی یہ عین خواہش تھی کہ کسی طرح ان دونوں کی شادی ہوجائے اور سب سے زیادہ مشکل اُسے مریم کی رضامندی حاصل کرنا تھا تاہم اُسنے اول یوسف کے دل کو ٹٹولا کہ وہ کہانتک اُسکا ارادہ ہے اور آخر کار اس سے اشارۃً کہدیا کہ وہ مریم سے اپنی محبت کا اظہار کرے کیونکہ داؤد جانتا تھا کہ بعض دفعہ دوسرے کے دل میں اپنی محبت پیدا کرنیکا ذریعہ اظہار محبت ہوجاتا ہے خصوصاً جبکہ کسی دل میں بجھے ہوے جذبات کو مشتعل کرنا ہو لیکن یوسف باوجود اپنی خوش تقریری کے عرصہ تک اس بات سے قاصر رہا اس سبب سے کہ مریم کا وہی رعب و جلال جس سے ہرگز عصہ کا آدمی متاثر ہوے بغیر نہ رہتا تھا اب وہ بھی اس سے تنہا متاثر تھا کہ اس کی جرات نہوتی تھی اور مریم کیطرف سے کوئی بات ایسی ظاہر نہوئی جس سے اُسے حوصلہ ہوتا۔

داؤد اکثر اس پر تقاضا کیا کرتا اس لیے کہ خود اُس کی بھی ہمت نہ پڑتی تھی کہ مریم سے اُس کی شادی کے متعلق گفتگو کرے قضا کار ایک دن داؤد باہر گیا ہوا تھا اور یوسف اور مریم دونوں مکان میں تھے یہ موقعہ غنیمت جانکر اور ڈر ڈر کر رک رک کر آخر یوسف نے اپنی محبت کا اظہار کرڈالا۔ لیکن یہ ایک بجلی تھی جو مریم کے دل پر پڑی وہ چونک پڑی اور اسقدر ہجوم جذبات اور خیالات کا اُس کے دل پر ہوا کہ وہ جواب دینا تو درکنار یوسف کے پاس سے اُٹھکر اندر کمرے میں چلی گئی۔ یوسف خوفزدہ اپنی جسارت پر نادم چپکے سے اُٹھا اور رخصت ہوا۔ داؤد مکان میں آیا تو مریم کو بہت متفکر اور آزردہ پایا۔ وہ فوراً سمجھ گیا کہ اس کا سبب کیا تھا۔ آخر اس نے بھی ہمت کر کے اول مریم سے اُس کی آزردگی کا سبب پوچھا۔ جب وہ کچھ نہ بولی تو اُسنے خود ہی یوسف کی تعریف شروع کر دی۔ مریم خاموش سنتی رہی اور آخر داؤد کہہ بیٹھا میں تمہیں ایک خوش و خرم زندگی بسر کرتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں اور شاید یوسف اس کا اہل ہے کہ جو تم جیسی نیکدل۔ باسلیقہ اور خوبصورت بیوی کا خاوند ہو۔ مریم پھر بھی خاموش رہی۔ لیکن وہ دیکھ رہی تھی کہ یوسف کی محبت کی چنگاریاں اس کے دل میں پیدا ہو گئیں تھیں۔ کبھی اُس نے یوسف کو اس نظر سے نہ دیکھا تھا اور جو اُسنے سوچا تو اُسے اپنے لیے راحت اور اپنے لیے اطمینان اور اپنے دل کی تسکین پایا۔

چند دن بعد شادی کا دن مقرر ہو گیا تھا اور داؤد نے خوشی خوشی انکی شادی کی تیاریاں کرنی شروع کیں۔ اور اسی سلسلہ میں کچھ سامان لینے کے بہانہ وہ ایک شہر میں گیا اور وہاں ایک مشہور وکیل کے مشورہ سے ایک وصیت نامہ لکھکر اسکو مکمل کرا کے اپنے ساتھ لیتا آیا۔

اس وصیت نامہ میں اُسنے اپنی کرزوڑ ہا روپیہ کی جائداد. نقد و مالیت کا بڑا حصہ مریم کے نام ہبہ کردیا اور کچھہ حصہ خیراتی کاموں کے لیے وقف مریم و یوسف کی شادی ہوگئی. اور وہ دنوں میاں بیوی نہایت خوشی کی زندگی بسر کرنے لگے. داود بھی اسیطرح اُنکے ساتھ اپنی زندگی کے بقیہ دن گزارتا رہا. آخر اس کا وقت آگیا اور وہ دفعتہً ایک ہی دن بیمار رہکر مرگیا. اس کے مرنے پر جب اس کے کاغذات ٹٹولے گئے تو اُن میں وہ وصیت نامہ بھی نکلا. جنکو پڑہکر مریم اور یوسف نہایت حیرت زدہ ہوے اور ان پر یہ راز کہلا کہ اُنکا داود وہ کروڑ پتی داود تھا جس کے عدم پتہ ہونے اور مرجانیکی خبریں کئی مرتبہ اخباروں میں شایع اور رد ہوئیں. یہ ایسا حیرت انگیز راز تھا جسکو وہ جب تک زندہ رہے اور اُن کی اولاد جب تک داود کی دولت سے متمتع ہوتی رہی کسی طرح نہ بھولی انہوں نے داود کی قبر نہایت شاندار بنوائی اور اُسپر یہ کتبہ کندہ کرایا.

دنیاوی اور آسمانی دُنوں دولتونکا مالک یہاں سوتا ہے

لطیف احمد

لڑکیون کی انشا

حامیان تعلیم نسواں کی عرصہ سے خواہش تھی کہ کوئی انشا لڑکیوں کیواسطے مولوی محمد عبد الراشد صاحب الخیری کی قلم سے نکلے لطف زبان کیواسطے کچھہ لکھنا بے سود ہے ہر خط ایسا مؤثر ہے کہ ایک ایک حرف کلیجہ پر گرتا ہے قیمت ایک روپیہ (عہ) ناظرین عصمت و تمدن سے آٹھہ آنے ۸ر

مینیجر عصمت و تمدن دہلی سے طلب کیجے

مُردوں کے ساتھ قبر میں آرام کیجئے

جناب اکبر الہ آبادی نے آج کل کے جذبات کو جس دلکش پیرایہ میں ظاہر کیا ہے وہ پڑھنے والوں اور ہم سب کی عبرت کا تازیانہ ہے سچا موحد وہ ہے جو موجودہ زمانہ کی مذکورہ خرابیوں سے اپنی زندگی کو محفوظ رکھے

چاہا جو میں نے اُن سے طریق عمل پہ وعظ　　بولے کہ نظم ذیل کو ارقام کیجئے
پیدا ہوئے ہیں ہند میں اس عہد میں جو آپ　　خالق کا شکر کیجئے آرام کیجئے
بے انتہا مفید ہیں یہ مغربی علوم　　تحصیل ان کی بھی سحر و شام کیجئے
یورپ میں پھر یئے پیرس و لندن کو دیکھئے　　تحقیق ملکِ کاشغر و شام کیجئے
ہو جائیے طریقۂ مغرب پہ مطمئن　　خاطر سے محو خطرۂ انجام کیجئے
پیرانِ بے فروغ کا گل ہو چکا چراغ　　ناحق نہ دل کو تابع اوہام کیجئے
رکھئے نہ دل کو دیر و کلیسا سے منحرف　　متروک قیدِ جامہ احرام کیجئے
الفاظِ کفر و فسق کو بس بھول جائیے　　ہر ملت و طریق کا اکرام کیجئے
رہئے جہاں میں وسعتِ مشرب سے نیکنام　　مجھکو مرید ہندوں کو رام کیجئے
رکھئے نمود و شہرت و اعزاز پر نظر　　دولت کو صرف کیجئے اور نام کیجئے
سامان جمع کیجئے کوٹھی بنائیے　　با صد خلوص دعوتِ حکام کیجئے
آرائشوں سے گھر کو مہذب بنائیے　　تزئینِ طاق و سقف و در و بام کیجئے
یاران ہم مذاق سے ہم بزم ہو جئے　　موقع ملے تو شغل مے و جام کیجئے
چشم و لب بتاں سے بھی غافل نہ ہو جئے　　تکمیل شوق پستہ و بادام کیجئے

نظارۂ مساں سے تروتازہ رکھئے آنکھ | تفریح پارک میں سحر و شام کیجئے
مذہب کا نام لیجئے عامل نہو جئے | جو متفق نہ ہو اُسے بدنام کیجئے
طرز قدیم پر جو نظر آئیں مولوی | پبلک میں اُنکو موردِ الزام کیجئے
زنجیر فقہ توڑیئے کہکر خلافِ شرع | مضمون لکھئے دعویٰ الہام کیجئے
ممنوع ہے تعدد ازواج خاصکر | یوں گھوم پھر کے تنقیہ عام کیجئے
لڑکے نہوں تو ہو نہیں سکتی چہل پہل | فکریں پئے وظیفۂ و انعام کیجئے
تحصیل چندہ کیجئے لڑکوں کو بھیجکر | سارا علاقہ ہند کا اب خام کیجئے
بے رونقی سے کاٹئے کیوں اپنی عمر کو | کیوں انتظار گردش ایام کیجئے
جو چاہیئے وہ کیجئے بس یہ ضرور ہے | ہر انجمن میں دعویٰ اسلام کیجئے
لیکن نہ بن پڑیں جو یہ باتیں حضور سے | مردوں کے ساتھ قبر میں آرام کیجئے

توحید

یاسمین۔ پروفیسر میرزا محمد سعید صاحب ایم۔ اے مصنف خواب ہستی کا یہ لاجواب ناول اور تمدن ایجنسی کی پہلی کتاب جس کا عرصہ سے ملک کو انتظار تھا تیار ہو گئی ہے یہ کتاب جو درحقیقت حسن و محبت کی زندہ تصویر ہے۔ قابل مصنف نے خصوصیت سے نوجوان طلبار کے واسطے لکھی ہے اور مختلف مضامین پر اس قابلیت سے بحث کی ہے کہ بے ساختہ داد دینی پڑتی ہے یاسمین جو اس تمام قصہ کی جان ہے اور بنگالہ کی ایک مشہور عورت ہے اوس کی زندگی کا ہر ورق فلسفہ حیات کے پیچیدہ مسئلہ کو نہایت خوبی سے حل کر رہا ہے۔ قابل مصنف کا اسم گرامی کتاب کے لاجواب ہونے کی کافی ضمانت ہے

قیمت عہ

منیجر عصمت و تمدن دہلی سے طلب کیجئے

ہیئت

گو اکثر ممالک میں ہیت نے نہایت معقول ترقی کی مگر چین ایران اور ہندوستان اس علم کو معراج کمال پر پہونچا دیا ہے

اصطرلاب اور رصد گاہیں جنسے اجرام فلکی کی گردش معلوم ہوتی اگرچہ ابھی حالت میں موجود نہیں مگر اپنے بنانے والوں کی تحقیق و تلاش کا پتہ دے رہے ہیں مقامات کواکب کو معلوم کرنے کے واسطے ثوابت کے مختلف مجموعوں کو علیحدہ علیحدہ بارہ برجوں میں منقسم کیا ہر برج کی تقسیم کی ہر سیارہ کا مدار گردش سیارات کا باہمی فاصلہ زمین کی دوری تمام حقایق علمی کی ہر راز کی تہ تک پہنچ گئے۔

تقریباً چار ہزار برس ہوئے کہ شہنشاہ فغوزنش نے ایک کرہ آسمانی تیار کیا جس میں سیارات ثوابت اور تمام اجرام سماوی کے مقامات نہایت صحت کے ساتھ معلوم کئے۔

تعجب یہ ہے کہ کسوف و خسوف اور گردش کواکب کا حساب ایسا ٹھیک اور درست لگایا کہ ہزاروں سال بعد جب محققین یورپ نے اس کی جانچ پرتال کی تو حرف بحرف درست پایا اور موجودہ قواعد و آلات ان کے سامنے ہیچ نکلی۔

یورپ کہتا ہے کہ ان لوگوں کے پاس ایسے آلات ستارہ بینی و فلک پیمائی میسر نہ تھے مگر یہ نہایت ہی رکیک دعویٰ ہے اگر ایسا ہوتا تو ان کی محنت و تلاش آج دور جدید کے کانٹے میں ٹھیک نہ اترتی اور اگر ایسا تھا بھی تو وہ لوگ اور زیادہ داد کے مستحق تھے کہ بلا صرف کثیر

اور تضییع اوقات کے محض اپنے ذہن رسا سے وہ پتہ لگا گئے جس کی باوجود کوشش کے یورپ سے تردید نہ ہو سکی۔

درستی تقویم کے لیے جس کو چینی تیوہاروں کے ایام پرستش چاند اور سورج گرہن کے زمانے اور شادیوں کی تاریخ ٹھہرانے میں پیش نظر رکھتے تھے انھوں نے خط نصف النہار منطقۃ البروج منطقۃ محرقہ منطقۃ معتدلہ اور منطقۃ مبردہ وہ مقامات اور سبعہ سیارات کی گردش کی راہیں وغیرہ اور دیگر آسمانی حصوں کی تقسیمیں نہایت صحیح اور محققانہ کی تھیں

چین کے بعد ہندوستان کی ہیئت قابل تذکرہ ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ یہ ہیئت قدیم زمانہ سے ہے۔ کیونکہ آریہ لوگ آفتاب پرست تھے۔ ویدوں میں سورج کی مہما یعنی تعریف بہت کچھ کی گئی ہے یہ خیال غالباً صحیح ہے اور ویدوں سے اس زمانہ کی قدامت اچھی طرح ثابت ہے کیونکہ کواکب پرستی کا رواج ان لوگوں میں علم ہیئت کے انتہائی کمال کو پہنچ جانے پر ہوا ہوگا۔ علاوہ ازیں چاروں ویدوں کے ساتھ ایک ایک جوتش یعنی رسالہ نجوم بھی لگا ہوا ہے جو قدامت ہیئت کو ثابت کر رہا ہے

درحقیقت مبصرین کا یہ خیال صحیح ہے کہ ہندوستان میں تدوین خیالات یعنی لکھنے کا ہنر قدیمی نہیں اسی وجہ سے دیگر علوم کی طرح ہیئت کو عرصہ دراز تک سینوں ہی میں محفوظ رہنا پڑا

ایران کا علم اختر شناسی باعتبار قدامت ہندوستان سے کم نہیں کیونکہ آفتاب پرستی اور نجوم کی بنا ایران میں یزدان پرست جمشید کے بعد ہی پڑ چکی تھی جو پیشدادیان کا چوتھا بادشاہ تھا اور جس کو پانچ ہزار برس ہونے آئے مگر یہ تعجب کی بات ہے کہ ایران و ہندوستان

دونوں کے قوانین واصول قواعد قریب قریب یکساں ہیں اہل ایران زمانے کو زمانہ کے بہت سے دوروں میں تقسیم کرتے ہیں جس کی موجودہ تعداد مقررہ اعداد شمار سے بڑھ جاتی ہے۔ علی ہذا القیاس اہل ہندوستان بھی۔

نظر بر حالات مندرجہ ایشیا کی علم ہیت کی ترقی کا ٹھیک ٹھیک زمانہ بتانا بہت مشکل ہے مگر معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ہیت کی حقیقت ہر قوم میں علمی حیثیت تھی جو ادائے رسوم مذہب کے لیے جزو مذہب بنی اور بالآخر مذہب بن گئی۔ ثوابت وسیارات میں ۔۔ وسعادت کے جھگڑے شروع ہوئے گویا اجرام فلکیہ تقدیر سمجھے گئے۔ تغیرات عالم اور انقلاب روزگار میں انکو مختار کل تسلیم کیا گیا نتیجہ یہ ہوا کہ سبعہ سیارات کی پرستش ہونے لگی اور انکو درجہ معبودیت عطا ہوا۔

ایرانی مخلوقات آسمانی کو انوار مجردہ کا پرتو جانتے تھے یہی وجہ تھی کہ انہوں نے سات سیاروں کے نام علیحدہ علیحدہ سات مندر بنائے جنہیں ہیکل اور سیاروں کی مورت کو پیکر کہتے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے

فارسی	عربی	ہندی	فارسی	عربی	ہندی
کیوان	زحل	سنیچر	برجیس	مشتری	برہسپت
ہور	نیر اعظم	سورج	ناہید	زہرہ	سکر
تیر	عطارد	بدھ	بہرام	مریخ	منگل
ماہ	قمر	چاند			

ہر ہیکل میں اسی معبود سیارے کا پیکر قایم تھا جس کا وہ ہیکل تھا۔ ہر ہیکل میں بہت سے اہلکار متعین تھے جو اپنے فرایض انجام دیتے

ہر ہیکل کے ساتھ باورچیخانہ کا انتظام تھا اور ہر وقت کھانا تیار رہتا تھا اذن عام تھا کہ جس کا جی چاہے کھائے اور پیئے - ہر ہیکل کا ایک شفاخانہ تھا جہاں اس کے متوسلین کا علاج ہوتا تھا اور دوا وغیرہ ملتی تھی ہر ہیکل کا مسافر خانہ الگ تھا جس میں مہمان ٹھہرتے تھے -

سیاروں کی شکلیں تجویز تو کردی مگر اہل ایران کو ان کی ارواح کی عالم خیال یا مقال میں دوسری دوسری صورتیں نظر آتی تھیں پس ان مندروں میں جو مورتیاں تھیں وہ خیالی صور تو پر قائم تھیں

ان خیالی پیکروں کو متعلقہ سیارات کے ساتھ کچھہ نہ کچھہ مناسبت ضرور تھی تی تھی مثلاً مریخ جو پدر فلک اور آسمانی سپاہی مانا جاتا تھا جو شجاعت بہادری اولعزمی کا ایک دیوتا تھا اور اس کے پیکر میں یہ لحاظ ہمیشہ رکھا جاتا تھا -

محمود الحسن

عصمت - جس طرح یہ امر مسلم الثبوت ہے کہ قوم کی ترقی کا انحصار تعلیم نسواں پر ہے - اسی طرح اس میں بھی کلام نہیں کہ رسالہ عصمت لڑکیوں کے واسطے ایک بیش بہا نعمت ہے جس میں خانہ داری تعلیم و تربیت - مذہب وغیرہ پر منتخب اہل قلم کے مضامین نکل رہے ہیں +

عصمت کنواری لڑکیوں کو فرزانہ دانا بیویاں - اور بیویوں کو سلیقہ شعار گھر کی بیبیاں اور سگھڑ مائیں بنانے کے واسطے ایک لاجواب چیز ہے - جو بیش قیمت کاغذ اعلے درجہ کی لکھائی چھپائی رنگین ٹائیٹل سنہری بیل اور تصویر سے مزین ہو کر ہر مہینہ دہلی سے شائع ہوتا ہے - قیمت سالانہ (۲ روپے)

منیجر عصمت و تمدن دہلی

خواتین عرب کا ثبات و استقلال

(از شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی)

مسند آرائے خلافت جو ہوئے ابن زبیر
سب نے بیعت کے لیے ہاتھ بڑھائے یکبار

ابن مروان نے حجاج کو بھیجا پئے جنگ
جس کی تقدیر میں ارکانِ ستم کا تھا شمار

حرم کعبہ میں محصور ہوئے ابن زبیر
فوج جب لے کے وہاں سے گیا [illegible] کا حصار

دامن عرش بھی ہوتا تھا [illegible] آلودہ گرد
بارش سنگ سے اٹھتا تھا جو رہ رہ کے غبار

تھا جو سامانِ رسد چار طرف سے مسدود
ہر گلی کوچہ بنا جاتا تھا اک گنج مزار

جب یہ دیکھا کہ کوئی ناصر و یاور نہ رہا
ماں کی خدمت میں گئے ابن زبیر آخر کار

جا کے کی عرض کہ اے دختِ حریمِ نبوی
نظر آتے نہیں اب حرمت دیں کے آثار

آپ فرمایئے کہ اب آپ کا ارشاد ہے کیا
کہ میں ہوں آپ کا اک بندۂ فرماں بردار

صلح کر لوں کہ چلا جاؤں حرم سے باہر
یا میں رہ کے اسی خاک پہ ہو جاؤں نثار

بولی وہ پردہ نشین حرم سر عفاف

حق پہ گر تو ہے، تو پھر صلح ہے مستوجب عار

یہ زمین ہے وہی قربانگہ اسماعیل

فدیہ نفس ہے خود دین خلیلی کا شعار

ماں سے رخصت ہوئے یہ کہہ کے بہ آداب و نیاز

آپ کے دودھ سے شرمندہ نہ ہوں گا زنہار

پہلے ہی حملہ میں دشمن کی الٹ دیں فوجیں

جس طرف جاتے تھے یہ ٹوٹتی جاتی تھی قطار

منجنیقوں سے برستے تھے جو پتھر پیہم

ایک پتھر نے کیا آ کے سر و رخ کو فگار

خون ٹپکا جو قدم پر، تو کہا از رہ فخر

یہ ارادہ ہے کہ ہم ہاشمیوں کا ہے شعار

اس گھرانے نے کبھی پشت پہ کھایا نہیں زخم

خون ٹپکے گا تو ٹپکے گا قدم پر ہر بار

زخم کھا کھا کے لڑے جاتے تھے لیکن کب تک

آخر الامر گرے خاک پہ مجروح نزار

لاش منگوا کے جو حجاج نے دیکھی تو کہا

اس کو سولی چڑھا دو کہ یہ تھا قابل دار

لاش لٹکی رہی سولی پہ کئی دن لیکن

ان کی ماں نے نہ کیا رنج و الم کا اظہار

اتفاقات سے اک دن جو ادھر جا نکلیں

دیکھ کر لاش کو بے ساختہ بولیں یک بار * ہو چکی دیر کہ منبر پہ کھڑا ہے یہ خطیب * اپنے مرکب سے اترتا نہیں اب بھی یہ سوار * ([illegible])

ایک ولایتی دن

صبح کوئی آٹھ بجے کے قریب اُٹھکر ہاتھ منہ دہویا اور جلدی جلدی کپڑے پہن نیچے کہانے کے کمرہ میں ناشتا کھانے گیا۔ مسز پارکر میری راہ دیکھ کر ابھی اپنی جوان لڑکی مس پارکر اور اپنے خاوند مسٹر پارکر کے ساتھ کہانے بیٹھیں تھیں جو نہیں میں کمرہ میں داخل ہوا مسز پارکر بولیں

مسز پارکر "گڈ مورننگ (صبح کا سلام) مسٹر علی۔ ہم کو شروع کیے کچھ بہت دیر نہیں ہوئی۔ یہ کہکر گھنٹی بجی۔ جس کے تہوڑی دیر بعد گہر کی خادمہ تلا ہوا انڈا میرے لیے لائی"

میں "گڈ مورننگ۔ مسز پارکر مجھکو بہت افسوس ہے کہ میں آج معمول کے خلاف دیر میں اُٹھا"

مسز پارکر "اوہ! مسٹر علی اس کا کچھ مضائقہ نہیں۔ آپ کچھ خیال نہ فرمائیں"

میں "یہ موسم ذلیل ہے! مینہ ہے کہ تھمنے کا نام نہیں لیتا"

مسز پارکر "بس کچھ پوچھیے نہیں! ایسا ردی موسم ہے کہ مجھکو تو دیکھے سے وحشت ہوتی ہے۔ انگلستان کا کچھ موسم پلٹ ہی گیا ہے پچھلے سال گرمیوں میں تو یہ حالت نہ تھی"

میں "(مس پارکر کی طرف مخاطب ہوکر) مس پارکر آپ کی طبیعت کیسی ہے آج کچھ جیب جیب معلوم ہوتی ہو؟"

مس پارکر "مسٹر علی میں اچھی طرح تھینکس (شکریہ) مگر اس کمبخت موسم کو دیکھکر میری طبیعت گری جاتی ہے۔"

میں - سچ کہتی ہو از حد خراب موسم ہے مگر امید ہے کہ شام تک کھل جائے -

مس پارکر - دیکھئے امید تو میں بھی کرتی ہوں مگر شاید ہی ہے جو آج شام تک کھلنے کا نام لے - بادلوں کو دیکھئے تہ پر تہ جمی ہوئی ہے جس طرح ہمارا اس کمبخت موسم نے ناک میں دم کر رکھا ہے بس خدا ہی بدلہ لیگا -

میں - مس پارکر - آپ تو اس موسم سے بالکل ہی ناراض معلوم ہوتی ہیں -

مس پارکر - میں واقعی اس بیہودہ موسم سے ناراض کیا بلکہ نفرت ہے مجھکو مینہ کی جھڑی ایک آن نہیں بھاتی -

مسٹر پارکر - مسٹر علی بات اصل یہ ہے کہ اول تو یہ موسم ہی ناگوار ہے دوسرے ہم انگریزوں کا یہ کچھ خاصہ ہی ہے کہ ہمیشہ موسم پر لعنت ملامت کیا کریں - آپکے ملک میں تو اس طرح نہ ستاتا ہوگا جسطرح ہمکو ستاتا ہے

میں - مسٹر پارکر ہمارے ملک میں تو تقریباً بندھے ہوئے موسم ہوتے ہیں مثلاً موسم بہار میں بارش زیادہ تر ہوتی ہے اور یوں جاڑوں میں بھی کئی چھینٹے پڑ جاتے ہیں -

مس پارکر - ہائیں! مسٹر علی کیا آپ ایسے ناہنجار موسم کو موسم بہار سے تعبیر کرتے ہیں - میں تو سارے جہان کے موسموں کو بہار کہوں گی پر نہ کہوں گی تو اس بیہودہ موسم کو -

مسٹر پارکر - بیٹی مسٹر علی کے ملک میں اسوجہ سے بہار کہتے ہیں کہ وہاں گرمی بڑی شدت کی ہوتی ہے اور مینہ سے جو خنکی ہو جاتی ہے وہ بھلی معلوم ہوتی ہوگی "

غرض اس اثنا میں ہم سب ناشتا کھا کر فارغ ہو چکے تھے اس لیے میں کھانے کے کمرے میں سے اٹھ کر بڑے کمرہ میں آیا جسکو ڈرائنگ روم

کہتے ہیں اور وہاں ایک آرام کرسی پر بیٹھکر روزانہ اخبار دیکھنے لگا اُس میں
دو چار سُرخیاں ایسی تھیں جن کو دیکھ کر انسان کا خواہ مخواہ پڑھنے کو
جی چاہے۔ مثلاً ایک عاشق نے اپنی معشوقہ کا گلا کاٹ کر خودکشی کرلی
بے بہا ہیرے اور موتیوں کی چوری اور مسٹر اسکوئتھ کی تقریر، وغیرہ
وغیرہ۔ کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اخبار بینی کرتا رہا۔ پھر خیال آیا کہ ابھی فوجداری
کے قانون کی کتاب کو نہیں دوہرایا۔ چلو اُسی کے کچھ صفحے پڑھ لو۔ چنانچہ
اوپر جاکر اپنے کمرے کی میز پر سے کتاب اُٹھا کر نیچے لایا اور دو گھنٹے
تک اسکو پڑھتا رہا پھر اس سے بھی جی گھبرا گیا تو اُسکو ایک طرف رکھ
کمرے میں ٹہلنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد دوپہر کے کھانے کی گھنٹی بجی
اور میں اپنی مقررہ جگہ جاکر بیٹھ گیا۔ اتنے میں مس ایلسی پارکر بھی مسکراتی
ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں اور دو چار ایسی میٹھی میٹھی نظریں مجھپر ڈالیں
کہ جس سے زاہد صد سالہ کے دل میں بھی گُدگُداہٹ پیدا ہوجائے
مگر اسوقت میں نے اپنی توجہ دوسری طرف پھیر لی اور اِدھر اُدھر
کی باتیں کرنے لگا۔ کھانے سے فارغ ہوکر ہم کچھ دیر تک وہیں بیٹھے
رہے اور میں مسٹر پارکر سے ملکی معاملات پر بحث کرتا رہا۔ وہ یہ کہتے تھے
کہ ہم کو ہر ایک چیز پر جو غیر ملک سے انگلستان میں آتی ہے محصول
لگانا چاہیے تاکہ اپنی دیسی دستکاری میں ترقی ہو اور انگریزی کاریگروں
کو کام ملے۔ دوسرے جب ہم غیر ملک کے مال پر محصول لگائیں گے تو
اُس کا اثر وہاں کے کارخانوں پر پڑیگا گویا غیر ملک والے ہمارا
ٹیکس ادا کریں گے۔ میری بنا ئے بحث یہ تھی کہ یہ خیال ایک منطقی غلطی کا
نتیجہ ہے کیونکہ جو کچھ محصول بھی درآمد مال پر لگایا جائیگا وہ درحقیقت

اُس مال کے استعمال کرنے والوں پر پڑے گا۔ اور اسی اصول کے مطابق
ہر شے جو باہر سے آتی ہے اُس پر ٹیکس لگانا پڑے گا۔ لہذا اناج اور اشیائے
خوردنی لامحالہ مہنگی ہو جائیں گی۔ اگرچہ میں نے بہت کوشش کی کہ مسٹر پارکر کو
اپنی دلیل سمجھاؤں مگر وہ اپنی ہی کہے گئے اور سمجھا تو یہی سمجھتا ہوا فقرہ یہی
کہہ دیا کہ مسٹر علی یہ قاعدے کی بات ہے کہ جب ایک غیر ملک کا آدمی ہمارے
ملکی معاملات پیش کرتا ہے تو اس کے خیالات "لبرل" (آزاد یا جدت پسند)
ہوتے ہیں مگر جب وہی شخص اپنے ملک کے متعلق کچھ کہتا ہے تو اس میں
کنسرویٹو (قدامت پسند) جھلک نظر آتی ہے۔ اب آپ ہی بتائیے
کہ آپ ہندوستان کے حق میں کونسی تجویز پسند کرتے ہیں؟ یہ
کہ غیر ممالک کی درآمد پر بھاری بھاری ٹیکس لگا دیا جائے تاکہ دیسی
دستکاری میں ترقی ہو یا برخلاف اس کے تجارت کا دروازہ چوپٹ
کھلا چھوڑ دیا جائے کہ اور تو سارے ملکوں کے کاریگروں کا فائدہ
ہو اور اجنبی تجار وہاں سے روپیہ کمائیں مگر ہمارے ہندوستانی
دستکار بھوکوں مریں۔ بتائیے کونسی تجویز اچھی ہے؟

میں نے کہا: غریب ہندوستان کی کچھ نہ پوچھیے۔ وہ کسی گنتی میں نہیں۔
انگلستان میں کم از کم یہ تو فائدہ ہے کہ انگریزی کارخانوں پر
غیر ممالک کے فائدے کی خاطر محصول نہیں لگایا جاتا ہے۔ مگر ہندوستان
میں اس سے بالکل برعکس معاملہ ہو رہا ہے۔ وہاں ہمارے دیسی
کارخانوں پر اس وجہ سے محصول لگا ہوا ہے کہ غیر ملکی مال کے
مقابلہ میں سستا نہ بیچ سکیں

مسٹر پارکر: مگر میرا خیال ہے کہ آپ سے کسی نے غلط کہا ہے یا جہاں

کہیں آپ نے پڑھا ہے اُس کا لکھنے والا متعصب ہوگا۔
اس قسم کے ناگوار بحث ختم کرنے کی خاطر میں نے کہا۔ شاید میری معلومات میں غلطی ہو۔ جب ہم کھانے وغیرہ سے فارغ ہو گئے تو میں پھر بڑے کمرے میں آنکر بیٹھ گیا اور میرے تھوڑی دیر کے بعد مس ایلسی پارکر بھی وہاں آگئیں اور پیانو بجانے لگیں پھر میری طرف مخاطب ہوکر کہا مسٹر علی آپ کو تو ہمارے انگریزی گانے بجانے سے کچھ مس نہ ہوگا آپ کے ہاں کیا باجا بجاتے ہیں؟" اس کے جواب میں میں نے از راہ تکلف کہا کہ "مجھکو آپکا انگریزی علم موسیقی بہت پسند ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اوّل اوّل میں نہیں قدر کرتا تھا کیونکہ سمجھ میں نہیں آتا تھا لیکن اب چونکہ اُس سے کان آشنا ہو گئے ہیں اس لیے دل سے پسند کرتا ہوں۔ ہمارے ہاں پیانو کا زیادہ تر رواج نہیں البتہ ہارمونیم کا بہت رواج ہی اس پر مس پارکر بولیں" کیا خوب! ہارمونیم اور ارگن تو ہمارے اکثر گانوں کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔" اس کے بعد گفتگو کا رُخ بدلنے کے لیے میں نے مس پارکر سے دریافت کیا کہ آج شام کو کس شغلہ میں وقت صرف کیجئگا۔" وہ بولیں کہ اس نامعقول موسم نے میرا سارا پروگرام خاک میں ملا دیا ورنہ میرا ارادہ تھا کہ آج اپنی کلب میں ٹینس کے لیے جاتی۔" موقع مناسب جانکر میں نے کہا "چلیئے میرے ساتھ آج تماشے میں تشریف لے چلیئے۔ ہر مجسٹی کے تھیئٹر میں" جھوٹے خداؤں کا جو تماشا آجکل ہو رہا ہے اُسکی بڑی تعریف سننے میں آئی ہے" اس درخواست پر مس پارکر نے مسکرا کر کہا" مسٹر علی میں آپکی بڑی مشکور ہوں مجھکو آپکے ساتھ جانے سے بڑی خوشی حاصل ہوگی میں نے بھی سُنا ہے کہ وہ

تماشا بڑے زور کا ہے" ان کے رضامند ہو جانے سے مجھکو بہی بڑی مسرت ہوئی - کیونکہ اول تو مجھکو پارکر کے خاندان میں آتے ہوتے بہت زمانہ نہ ہوا تہا اور پہلے کوئی ایسا مناسب موقع نہ نکلا تہا کہ مس پارکر کو اپنے ساتہہ کہیں باہر لے جاسکوں دوسرے اس درخواست کے قبول ہوتے ہی دل میں یہ ولولہ پیدا ہو گیا کہ آج ضرور اپنے حال دل کی تمہید اُٹہاؤنگا شاید کارگر ثابت ہو - غرض یہ سوچکر جی ہی جی میں طرح طرح کے منصوبے باندہنے لگا - کبھی تو یہ خیال آتا کہ صفا صفا کہدوں کہ مس ایلسی تمہارے تیر نظر نے میرے دل کو زخمی کر دیا ہے اور تمہاری زلف کے ہر حلقے نے مجھکو بگوش غلام بنا لیا ہے اس لیے اپنے نیم بسمل کے حال پر رحم کرو ورنہ دست جنوں ہوگا اور اپنا گریبان اور تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگی کہ تمہارا عاشق در در کی خاک چہانتا پہرتا ہے اور بازار کے لڑکے اُس کے پیچھے پتھر ہاتہ میں لیے دوڑتے ہیں - مگر جب یہ سوچا کہ اس خیال کو انگریزی میں کیونکہ ادا کرونگا تو اظہار محبت کا یہ طریقہ حد سے زیادہ مشرقی نظر آیا اور یہ خیال کیا کہ وہ بیچاری اپنے دل میں یہ کہے گی کہ عجب خبطی آدمی ہے اگر فرض کرو کہ میرے پیچھے دیوانہ ہی ہوا تو فوراً پاگل خانے بہیجدیا جائے گا لڑکے پتھر لیکر کیوں پیچھے پہرنے لگے - لہذا اس طرح تمہید کو چہوڑ کر آخر یہی فیصلہ کیا کہ سیدہے سادے انگریزی طور پر آغاز کروں گا میں ابھی اسی غوطہ میں تہا کہ چار کی گھنٹی بجی اور میں چار پینے کے لیے دوسرے کمرے میں گیا وہاں جہاں اور گفتگو ہوتی رہی اُسی کے ضمن میں مس ایلسی پارکر نے اپنی والدہ سے کہا - مما مسٹر علی کہتے ہیں کہ آج میرے ساتہہ تماشے میں چلو اس پر بڑی بی بولیں بیٹی یہ اُنکی بڑی مہربانی ہے

شوق سے چلی جاؤ۔ تمہاری طبیعت بھی بہل جائے گی۔ اس کمبخت مینہ کے سبب سارے دن گھر سے نہیں نکلیں اس لیے شام کو خاصی تفریح ہو جائے گی غرض جب ہم چا رپی پلا کر فارغ ہو گئے تو کوئی پونے آٹھہ بجے کے قریب میں نے کرایہ کی موٹر گاڑی جسکو یہاں ٹکسی کیب کہتے ہیں نوکر کے ہاتھہ منگوائی اور خود شام کا لباس پہن اور اوپیرا ہیٹ یعنی تہیٹر میں جانے کی خاص ٹوپی اوڑھکر تیار ہو گیا۔ اور تہوڑی دیر میں ایسی ہی شام کا شاندار لباس زیب تن کر کے آگئیں۔ یہ جوڑا اُن پر لاکہہ پھبن دیتا تہا۔ اوّل تو حسن وہ جسکو اگر ماہ کامل دیکھے تو اپنا سا منہ لیکر رہ جائے اُسپر غضب یہ کہ جوانی کا اُٹھان اور لباس کی وضع قطع زاہد فریب جس میں تن نازک کی ہر ایک خوبی عیاں۔ گریباں قاعدے کے موافق سینے کے اُبھار تک کہلا ہوا جس سے صراحی دار گردن اور سارے سینے کا گورا گورا بنڈا گیس کی روشنی میں آنکھوں کو ایسا بھلا معلوم ہوتا تہا کہ بے اختیار ایک مسلمان کی زبان سے صلی علیٰ نکلے۔ اُس ماہ پیکر کو جب اس طرح آراستہ و پیراستہ دیکھا تو ایک دفعہ اور مشرقی جنون عشق نے دل میں زور کیا اور خواہ مخواہ اُس غریب کو قاتل بے رحم سفاک۔ قیامت خیز فتنہ انگیز۔ کافر اور بے وفا وغیرہ کہنے کو جی چاہا صرف اس جرم پر کہ اُس کا ہر انداز میرے دل میں چٹکیاں لیتا تہا مگر اپنے دلی جذبے کو ضبط کر کے میں نے اُنسے گاڑی میں بیٹھنے کی درخواست کی۔ چلتے وقت مسز پارکر نے کہا مجھے اُمید ہے کہ تم دونوں تماشے کا خوب لطف اُٹھاؤ گے۔ اس کے بعد ہماری موٹر وہاں سے روانہ ہو گئی اور چونکہ ہز مجسٹی کا تہیٹر ہمارے مکان سے

کوئی آدھ گھنٹے کے فاصلے پر تھا اس لیے پہلے سے دل مضبوط کر کے یہ ارادہ کر لیا کہ اس قیمتی موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دونگا۔ لہذا انگریزی قاعدے کے موافق سلسلہ گفتگو یوں شروع کیا۔

"مس ایلیسی بار کر مجھکو بے انتہا خوشی ہے کہ آج تم میرے ساتھ تماشے میں چل رہی ہو۔ درحقیقت یہ تمھاری عین عنایت ہے۔" اسپر وہ بولیں کہ مجھکو خود بڑی مسرت ہے اور عنایت تو اصل میں تمھاری ہے کہ تم نے مجھکو لے چلنے پر آمادہ کیا۔"

میں نے کلام قطع کر کے کہا کہ اچھا یہ تو بتاؤ کہ تم برا تو نہ مانوگی اگر میں تمھیں فقط ایلیسی کہہ کر پکاروں۔" کہنے لگیں "ہرگز نہیں۔" اس پر میں ذرا دلیر ہو کر بولا "ایلیسی تمھاری صورت اور تمھاری باتیں بے حد شیریں ہیں۔ مجھکو دل سے پسند ہیں۔"

ایلیسی۔ کیا در اصل تم ایسا خیال کرتے ہو؟"

میں۔ واقعی میں ایسا خیال کرتا ہوں۔" اور اس کے ساتھ ہی میں نے اپنا ہاتھ اُن کی نازک اور پتلی کمر میں ڈالدیا۔ چونکہ اس پر اُن کی طرف سے کسی قسم کی نارضامندی کا اظہار نہیں ہوا اس لیے میرا دل اور بھی بڑھ گیا اور اب میں نے اُن کی ہر ایک سے کی تعریف کرنی شروع کر دی۔

میں "پیاری ایلیسی حسن و خوبی میں تم ایک خواب ہو (انگریزی ترجمہ) ہر ایک چیز جو قدرت نے تم کو عطا کی ہے لاثانی اور بے عیب ہے اور سینہ میں تو وہ جادو بھرا ہے کہ خدا کی پناہ دیکھنے سے انسان کا دل بے قابو ہو جاتا ہے۔"

یہ کہہ کر میں ہنسنے اور پھر جب شوق نے زور کیا تو بے اختیار اُس بُت کا ذکر اپنے کلیجے سے لگا لیا۔ میں ابھی دل ٹھنڈا کر رہا تھا کہ ٹیکسی بان نے تھیٹر کے دروازے پر گاڑی لے جا کر کھڑی کر دی اور ایلسی نے گھبرا کر کہا۔ علی! مجھے چھوڑو وہ دیکھو تھیٹر آگیا۔ غرض میں ایک دفعہ ہی ہوشیار ہو گیا اور فوراً گاڑی سے نیچے اتر کر ایلسی کو اُتارا اور ٹکٹ گھر سے دائرہ بالا (اپر سرکل) کا ٹکٹ لیکر ہم دونوں اپنی جگہ جا بیٹھے۔ ابھی تماشہ شروع ہونے میں کوئی پانچ منٹ کی دیر تھی اس لیے ہم ادہر اُدہر کی باتیں کرتے رہے جب پردہ اُٹھا تو دیکھا کہ واقعی جیسا سنا تھا اُس سے کہیں زیادہ قابل تعریف تماشہ ہے مگر میرے دل کو سارے وقت یہ لو لگی ہوئی تھی کہ کب تماشہ ختم ہو اور کب ہم واپس گھر جائیں تا کہ ٹیکسی میں ایک دفعہ پھر اُسی ماہ جبین کو اپنے گلے لگا کر اپنے دل کو قابو میں لاؤں۔ مارے خدا خدا کر کے تماشہ بھی ختم ہوا اور میں نے فوراً ٹیکسی منگوا کر گھر کا رُخ کیا راستے میں جو راز و نیاز کی باتیں ہوئیں اُن کی بابت ہم دونوں کا عہد ہو گیا ہے کہ دوسرے کے کانوں تک نہ پہونچیں گی۔

ازلندن ۔ ر ۔ سے ۔

قوت الخیال ۔ پروفیسر صاحب موصوف کی دوسری کتاب جو اُس مشہور انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے جسکی تھوڑے عرصہ میں تیس چالیس ہزار جلدیں فروخت ہو چکی ہیں کتاب کی خوبی دیکھنے سے معلوم ہوسکتی ہے قیمت ۸/

ساقی نامہ و احوال ضعف در قید خانہ

نواب واجد علی شاہ مرحوم نے حالتِ قید میں ایک مثنوی لکھی تھی جس کا ایک قلمی نسخہ خوش قسمتی سے ہمارے ہاتھ لگا اور ہم اوسکو نہایت خوشی سے تمدن میں باقساط شائع کرتے ہیں :-

دلا بعد احمد او نعتِ رسول — پس از منقبت لکھ نواب با اُصول

پلا ساقیا وہ مئے سُرخ رنگ — کہ ہو نشہ سے جس کے دلکو اُمنگ

کھنچی تاکِ انگور سے وہ شراب — جو سونگھے سے دے بوئے عطرِ گلاب

شرابِ مصفا کا اِک جام دے — ذرا دخترِ رز کو یہ پیغام دے

کہ ہے طالبِ وصل اک بادہ خوار — ہے جامِ محبت کا اوسکو خمار

اکیلا ہے زنداں میں اک مَے پرست — شب و روز ہے خوفِ روزِ الست

مہینوں سے ہے طالبِ وصلِ یار — نہ زنداں میں پہونچے نسیمِ بہار

نہ آتی ہے جاں نے نکلتا ہے دم — جگر ہو گئی رنج سے چشمِ نم

نہ تسکین کو ہے پرتوِ آفتاب — تماشے کو آتا نہیں ماہتاب

ہوا بھی جو آتی ہے تو سہمگیں — نہ یاور نہ مونس نہ کوئی قریں

رفیقوں نے چھوڑا اکیلا مجھے — سبھوں نے کوئیں میں دھکیلا مجھے

خبر تک نہیں اپنے احوال کی — توقع نہیں کچھ زر و مال کی

عیال اور اطفال لوٹے گئے — جہاں میں مرے لال لوٹے گئے

کوئی مضطرب ہے کوئی نالہ کش — کوئی پیٹتا ہے تو آتا ہے غش

نفس سرد مہری سے ژالہ ہوا — بدن فرطِ غم کا نوالہ ہوا

جگر جل گیا گرمی رنج سے | تنفر ہوا اک قلم گنج سے
بدن تار مسطر سے ہل ہل گیا | کلیجہ مصیبت سے ہل ہل گیا
نمی تک نہیں نام کو آنکھہ میں | نہ نیند آتی ہے شام کو آنکھہ میں

نہ کھانے کا اسباب ہے کچھہ نصیب
نہ پانی کا ہے ذکر لب کے قریب

در صفت کرنیل کونیا صاحب بہادر

مگر مین الطاف صاحب سے واہ | کونیا لقب جن کا ہے خوش کلاہ
وہ کرنیل صاحب سپہر ہنر | کہ ہیں ٹون میجر وہ عالی گہر
خدا رکھے ذات اوس فلک قدر کی | بڑہے عمر و دولت بہی اوس بدر کی
ہوئیں ٹٹیاں خس کی مجکو نصیب | آہی جلیں غم سے اُس کے رقیب
ملا کرتی ہے برف بہی آٹھہ سیر | یہہ کیا جان جو ہو ذرا اوس مین دیر
لگے ہیں کنشاہ عجب بادکش | کہ دل خنکی جھار پہ کرتا ہے غش

مہیا قلی رات دن کام کو،
خدا رکہے کرنیل کے نام کو

اثبات واجب الوجود - وہ لاجواب کتاب جس کے ترجمے پر پنجاب ٹکسٹ بک کمیٹی نے پروفیسر مفتی انوار الحق صاحب ایم - اے - کو انعام دیکر اپنی پسندیدگی کا اظہار فرمایا - اس کتاب مین باریتعالے کے وجود کا ثبوت اس خوبی سے دیا گیا ہے کہ ایک ایک حرف دلنشین ہوتا ہے - یہ کتاب عقائد کی پختگی کیواسطے اکسیر کا کام دیگی - عبارت سلیس ترجمہ بامحاورہ مضمون دلچسپ طرز بیان دل آویز قیمت ایک روپیہ (عہ) منیجر عصمت و تمدن دہلی سے طلب کیجئے -

ایک بہن کا خط

اللہ، میاں اکرم! برے دن اور بُری راتیں، اسی دن کو کی تھیں کہ بہن جیسے صلاح کے پُرزے کو ترسے اور تمھیں بھیجنا نصیب نہ ہو، مری ہوئی ماں کی وصیت، اور جنتی بہن کی حسرت، خوب پوری کی، ہاں بھائی شاباش اپنے بچوں کو دکھ دیکر تم کو سکھ دیا، اپنے گھر میں جھگڑا ڈال تمکو کلیجہ سے لگایا، ساس کے طعنے، نند کی فضیحتیاں، سب کچھ انگیزا اور تمکو جُدا نہ کیا، سگے باپ نے، ایک دیوار بیچ، مرے اڑاسے، اور تمھاری بات تک نہ پوچھی، مگر نصیبوں پھوٹی بہن نے سر چڑھے کا سر اور ماں کی نشانی سمجھکر، آنکھیں بچھائیں، جو میاں بھر جھولی، چار سو روپیہ مہینے کے مہینے لاکر، دیتا تھا اس سے بُری بنی، اور تمہارے دلپر میل نہ آنے دیا، پورے دو ہزار کا زیور، تمھاری تعلیم پر اُڑا ف کر دیا، اور منہ سے بھاپ نہ نکالی۔ اپنے اور غیر سب ہی نے سمجھایا مگر اس دھوم دھام سے شادی رچائی، کہ کنبہ بھر میں نام ہو گیا، اکرم میاں اسی دن کو نہ، کہ تم ہمارے سلام کے بھی روادار نہ ہو، اس وقت کو یاد کرو، جب سیف آباد، والیاں پانچ ہزار، کے چڑھاوے پر اڑی ہیں، ابا جان، کانوں پر ہاتھ دھر گئے، برات اٹھنے کا وقت آگیا، آٹھ ہزار کے چھا لکھ گوڑیوں کے مول بیچکر، تمھارا چڑھاوا کیا، اور یہ بھی سوچا کہ برات اٹھ گئی، تو شہر میں ناک کٹ جائے گی، کونسا ارمان تھا جو پورا نہ کیا، اور کونسی رسم تھی جو لادھوری رہ گئی یہی سسرال

والے، جو لالوں کے لال ہیں، مقدمہ کے وقت، طوطے کی طرح دیدے بدل گئے، اس آگ میں گرنے والی بہن ہی تھی میاں تک کو خبر نہ کی، اور خالہ اماں کے ہاتھ، مکان کا قبالہ، تمہارے حوالے کیا، دنیا تجارت کرتی ہے، کھرا اور کھوٹا سب چلتا ہے میں نے ماں کے پیٹ سے سودا کیا، اور ٹوٹا ہوا، کیا خبر تھی کہ جو کچھ کر رہی ہوں یہ یتیم بچوں کی حق تلفی ہے۔ میرا راج لٹ جائیگا۔ اور میرے پھلواے لال دو دو دانوں کو ترسیں گے، جس بھائی پر دولت اٹھا رہی ہوں، یہ جوان ہو کر بات ہی نہ پوچھیگا اپنے پاس سے تو کیا، اگر میرا ہی دیا ہوا، واپس کر دو تو چار بچے کیا چار نوکروں کو، کھلا کر کھاؤں، مگر میاں وہ وقت نکل گیا، اب اللہ رکھے سب قابل ہو، بہن رانڈ ہوگئی تو بلا سے اور بھانجا بھانجی بھوکے رہیں تو صدقہ سے،

اکرم میاں، سوچو، انصاف کرو اور خدا سے ڈرو، حق دار کو بے حق، کرنا اچھا نہیں، یہ معصوم بچے مٹھی مٹھی دانوں کو ترسیں اور تم قرض کے ادا کرنے کی پرواہ تک نہ کرو، ہماری پہاڑ سی راتیں آنکھوں میں کٹیں، اور تم کو دھیان تک نہ رہے،

نابالغ یتیموں کا مال ہضم ہونے والا نہیں۔ یہ بہت کچھ لیکر ڈوبیگا اب بھی ہشیار ہوجاؤ، اور ننھے سے دل ہاتھ میں ہو تو ان کی آہ خالی جانے والی نہیں، انکا وارث، تم سے زیادہ زبردست ہے، یاد رکھو برباد ہو جاؤ گے، اکرم میرے لال، بڑی مصیبت کے سہلے ہوئے ہیں، نو برس کی بیاہی رانڈ ہوئی ہوں، اور آج سر کا وارث اٹھ

تیرہ برس ہو گئے، یہ رنڈاپا ساس نندوں کے سامنے، اسی چوکھٹ پر بسر کر دیا، روکھی سوکھی جو میسر ہوئی کھلادی، اور کھالی، حلف رکھدو سارے محلہ کے، ہاتھہ پر، جو کبھی سنے آواز تک سنی ہو، خدا، دیکھتا ہے، سلائیاں کیں، بہو کی سوئی، پیوند لگائے، مگر مرے ہوئے باپ دادا کی آن میں فرق نہ آنے دیا، کیوں بھائی، تمھاری کمائی ہیں، دکھیا بہن بھا بجوں کا اتنا بھی حق، نہ رہا، کہ تیج تہوار، کو تو، یاد کر لو، ماشا، اللہ صاحب اولاد ہو، دل پر ہاتھہ رکھو کیا گذرتی ہوگی۔ مجھہ ماں کے دل پر۔ آج برس کے برس دن ٹکے کا مزدور بھی، دنوں پہلے بچوں کے کپڑے تیار کرتا ہے۔ مگر اللہ اللہ تحصیلدار کی بیٹی، اور ڈپٹی کی بہن کے بچوں کو، دھوبی کے دھلے کپڑے بھی نصیب نہیں، اس وقت، رات کے گیارہ بجے ہیں۔ مگر خدا دیکھہ رہا ہے، کہ صبح سے ایک دانہ بھی اُڑکر حلق میں گیا ہو تو حرام کیوں بیرن بھائیوں کا ارمان اسی دن کو کہتے ہیں، تمھارے ہاں روپیہ کی ریل پیل ہو، اور یہیں جلانے کو تیل بھی نہیں، ماں جائے اکرم شمسہ ساس نندوں کی بہو ہے انگوڑی ناہٹی نہیں، ساری سسرال جنم میں تھوک رہی ہے کس کس کا منہ کیلوں، چور کی ماں گھٹنے میں سر دے اور روئے، یہ پانچ روپیہ کا نوٹ، چھہ روز کے واسطے قرض لیکر بھیجتی ہوں، اس کا منی آرڈر میرے نام کر دو کہ ہر لمحہ کے تیر دل سے بچوں؟

اکرم، برا نہ ماننا، مدتوں کا بخار، اور عرصہ کی بھڑاس تھی نکل گئی، تمہاری دولت تمکو نصیب تمہارے بچوں کی عمر دراز، دولہن بیگم کو خدا اس سے زیادہ راحت دے نند جلنے والی تمہیں دعا گو ہی۔

میں نہ تمہارے روپیہ کی بہو کی نہ عنایت کی طلبگار۔ بھانجا بھانجی فاقو پر فاقے کریں، مگر تمہارے آگے ہاتھ نہ پھیلائیں گے، اور بہن دنیا بھر کی مصیبتیں اٹھائے، لیکن تمہارے در پر نہ آئے گی، ہاں اتنی التجا ضرور ہے، کہ مہینہ میں ایک دفعہ خیر صلاح بھیجدیا کرو، کہ بہن کا زخمی دل زیادہ نہ تڑپے، ملنے کی امید تو رہی نہیں، اب لاہور میں تمہارا کون بیٹھا ہے جس کے لیے آؤ گے، اور جب تک آؤ گے اسوقت تک بارہ مہینے کی بیمار، بہن جس کا تتنی جیسا ڈیل سوکھہ کر کانٹا ہو گیا تمہاری صورت کو ترستی رخصت ہو جائے گی +

شمہ

عِصمَت

جس طرح یہ امر مسلم الثبوت ہے کہ قوم کی ترقی کا انحصار تعلیم النسوان پر ہے اسی طرح اسمیں بھی کلام نہیں کہ رسالہ عصمت لڑکیوں کیواسطے ایک بیش بہا نعمت ہے جس میں خانہ داری تعلیم و تربیت۔ مذہب و غیرہ پر منتخب اہل قلم کے مضامین نکل رہے ہیں +

عصمت۔ کنواری لڑکیوں کو فرمانبردار بیویاں اور بیویوں کو سلیقہ شعار گھروالیاں اور سگھڑ مائیں بنانے کے واسطے ایک لاجواب چیز ہے جو بیش قیمت کاغذ اعلیٰ درجے کی لکھائی چھپائی۔ رنگین ٹائیٹل سنہری بیل اور تصویر سے مزین ہو کر ہر مہینہ دہلی سے شائع ہوتا ہے قیمت سالانہ (عہ)

منیجر عصمت و تمدن دہلی۔

دمِ واپسیں

اپریل کی ایک اس شام کو، جب، انیسویں صدی کی مخلوق، کشاکش ہستی میں منہمک تھی، آسمان، زمین والوں کی کج فہمی پر ہنس رہا تھا ایک ایسی شام کو جب ہوا، کسی چمن کے، خاموش گوشہ میں، کلیوں کا منہ کھول رہی تھی، ایک ننھی سی روح، اضطراب آمیز، استقلال، نفرت آمیز انفعال، سے، کوشش کر رہی تھی کہ، آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں میں، جا ملے رخصت ہو جائے پیوست ہو جائے۔

ایک ننھا سا بچہ ایک ماں کی گود میں تھا، اور ایک آنکھ جس میں آنسو کا قطرہ تک نہیں، مگر ماتا کا دریا لہریں لے رہا تھا، حسرت و یاس سے بھری ایک معصوم چہرہ پر ایک ایسی صورت پر، جس نے دو سال خونِ جگر پیا، چھ سال سینہ پر لوٹی، پڑ رہی تھی، موت کا فرشتہ، ایک نورانی نقاب لیے ان دو زندہ روحوں کے پاس کھڑا تھا، اور منتظر تھا اس وقت کا جب ایک آخری سسکی، اس پھول کو مرجھا دے، اور قدرت کا ایک آبدار نشتر اس قابل رحم عورت، کی تمام، امیدوں کا خاتمہ، ارمانوں کا تکملہ، اور خواہشوں کا انجام دکھا دے،

کمرہ کے در و دیوار، اس ننھے سے مہمان کو حسرت سے تک رہے تھے، اور چار برس کا رفیق کتا، اپنے پیارے مالک کے سرہانے خاموش بیٹھا تھا،

صحن کی زمین، آج سے، ایک ہفتہ پہلے اسی وقت، الوداع

کہہ چکی تہی، جب ننہے ننہے پاؤں، آخری مرتبہ، اسکی گود میں پونہچے
مگر گہر کے در و دیوار اس سکون مطلق میں، جو اسوقت چاروں
طرف طاری تہا، اپنے ہمدم کی مفارقت، ابدی پر، آنسوؤں کے
پہول چڑہا رہے تہے،

عورت، جس کے پہلو میں ایک زخمی دل ٹیکیاں لے رہا تہا، جو
اسی قسم کے ایک داغ سے پہلے ہی آشنا ہو چکی تہی، گہور رہی تہی ان
آنکہوں کو جن سے محبت کی شعاعیں نکلتی تہیں، تک رہی تہی ان
ہونٹونکو، جن سے پہول جہڑتے تہے، اور دیکھ رہی تہی ان ہاتہونکو
جو گلے میں پڑکر، عالم حیات کی تمام تکالیف کو زائل کر دیتے تہے
اور دل ایک ایسی خوشی محسوس کرتا تہا، جو بے لوث تہی، اور جس کے
آس پاس الام کی جہلک تک نہ تہی، اعضائے جسمانی اپنا کام کر رہے تہے،
مگر قلب و دماغ، اس عورت کو جو رنج و راحت پونہچا سکے، بہول چکے تہے
عورت ایک تصویر تہی ساکت، ایک انسان تہی خاموش، ایک شنکار
تہی زخمی،

قریب، آپونہچا، آخر وہ وقت، جب وہی جسد خاکی جو طرح طرح کے
اندازوں سے دل موہتا تہا، ان ہی آنکہوں کے سامنے جو دیکھ دیکھ کر
نہال ہوتی تہیں، تڑپ تڑپ کر، روح سے جدا ہو، وہ پہول جو ہر لمحہ
دل و دماغ تازہ کرتا تہا، مرجہا جائے۔ وہ چاند جس کی روشنی، بہت سے
دلوں کو روشن کرتی تہی۔ گہنا جائے، وہ بچہ جس کے، قدموں پر،
ماباپ، آنکہیں بچہاتے تہے، ہمیشہ ہمیشہ کی نیند سو جائے،
نبض ساقط ہو چکی تہی، مگر گلشن امید، لہلہا رہا تہا، محبت انتہائی محبت

الفت، الفت بدرجہ غایت دلفریفتگی۔ عشق، نہیں ماننا نے، ہوش و حواس زائل کر دیے تھے، ایک یقین تھا ایک تسکین تھی، ایک خیال تھا، ایک امید تھی، کہ ایک زبردست قوت اس انقلاب میں، کام کر رہی ہے، اور اگر وہ رحم کرے، وہ سُن لے، وہ سمجھ لے، وہ محسوس کر سکے، اور کرے، تو یہ سبزۂ زندگانی، یہ لازوال دولت کی دوسری تغیر سے محفوظ، بدستور کھیلتی مالتی، ہنستی پھرتی، بولتی چالتی، کلیجہ سے لگی رہے ؛

دل بہت سے تھے، متمنی تھے، دعاگو تھے، مگر ایک تھا، ایک عورت کا دل تھا، اسی کا، اسی عورت کا، جو اپنے یقین کے موافق اس طاقت سے، جو خدا کے نام سے تعبیر ہوتی تھی التجا کرتا تھا، روتا تھا سر جھکاتا تھا۔ کیسا دل تھا، سچا تھا، صاف تھا، مسلمان کا دل تھا،

بالآخر دم دابسیں نے، تمام تعلقات منقطع کر دیے، امیدیں اور دعائیں ختم ہو گئیں، ایک گوشت کا لوتھڑا، بیجان رہ گیا، کچھ ہڈیاں تھیں، کچھ بال تھے، کچھ کھال تھی،

فضائے عالم میں، پھرنے والی، پاک روحوں تم ہمکو فراموش کر گئیں، مگر، ہمارے دل، تمہاری یاد سے غافل نہیں۔ تمہارا عارضی قیام مدتوں خون رلوائیگا۔ تم ظاہری آنکھوں سے بچھڑ گئے، لیکن حافظہ، تمکو نہیں بھولتا، کھلنے سے پہلے مرجھانیوالی کلیوں، تمہاری خوشبو آجتک، دماغ میں بسی ہوئی ہے، آنکھیں تمہاری خاک سر پر رکھے رہی ہیں، کہاں ہو کلیجہ کے ٹکڑوں، چاند سی صورت

دکھادو، برکت والے بندوں، دل کی راحت سے گئے، اور وہ داغ چھوڑا کہ دل ودماغ بیکار ہوگئے۔ زندگی میں موت کا مزہ چکھا دینے والے پیاروں، کان تمہاری باتوں کو ترس گئے، چاروں طرف خاک چھان لی، مگر تمہارا پتہ نہیں چلتا کیسی پرلطف تھی تمہاری شب حیات، اب وہ رات میسر نہیں ہوتی اور کسقدر ظالم تھی، وہ صبح جس نے تمہاری بزم وصال درہم برہم کردی، مبارک ہے تم کہ تمہاری خاک تک عزیز ہوئی اور آج تمہارے فانی اجسام کا مسکن، ہمارا سجدہ گاہ ہے، تمہاری صورتیں آنکھہ سے اوجھل ہوچکیں، مگر تمہارے ہاتہہ کی جلائی ہوئی شمع روشن ہے ؟ اور اسکی لو کلیجہ میں لگ رہی ہے،

آسمانی دولت کے، مالکوں، اسی فانی دنیا سے جہاں رنگ برنگ کے پکھیرو اپنی اپنی بولیاں بول رہے ہیں، بعض جگر خراش صدائیں بھی آرہی ہیں اور ایک جم غفیر، خواہش نفسانی کی زنجیروں میں جکڑا باواز بلند، تلقین، کررہا ہے کہ، ہم، تمہارا خیال تک دل سے بھلادیں اور جولاں، منور گھروں کو، اندھیرا گھپ کرکے انکا دھیان تک نہ آے ...

.... مگر انصاف کی آنکھیں، ان کا مضحکہ اڑا رہی ہیں، اور دل، یہ صدا دے رہا ہے،

کلیجہ کے ٹکڑوں، گو بحر بے نے تمہاری امید مواصلت منقطع کردی تمہارا قیام چند یا رین بسیرا تہا، تم ہم سے چھوٹ کر اچھی جگہ پہونچ گئے تمہاری بھولی بھولی صورتیں، ہماری آنکھوں سے چھپ گئیں، اب تم کہاں اور ہم کہاں، دل کی بستی سونی ہوگئی اور اب اسکی آبادی، اللہ ہی اللہ ہے مگر، دل تمہاری محبت کے دم بھر رہے ہیں اور مفارقت کے

وہ پھول، جو تم اپنے نازک ہاتھوں سے ہمارے کلیجہ پر رکھ گئے تا دمِ حیات شاداب رہیں گے۔

عالمِ خیال کے شہزادوں، قریب آؤ، تمہارے رُخِ نازک کو بوسہ دوں، دلِ مجروح کا یہ تحفہ قبول کرو، اور یقین کرو، کہ تمہاری یادگار، یہ داغ فراق، مرتے دم تک تروتازہ رہے گا۔

راشد۔ الخیری

یاسمین

ہلال احمر

وہ بھی اک دن تھا، کہ اوج مذہب اسلام تھا
جس جگہ تھا جس کے لب پر تھا، اسی کا نام تھا

دولت و جاہ و عروج اسکو بھی حاصل تھا کبھی
آسمانِ ارتقا پر بدر کامل تھا کبھی

ہائی کیا عالم تھا اس کے نور عالمگیر کا
ایک دریا بہ رہا تھا خاک پُر تنویر کا

جائے نظارہ سے جاسکتی تھی جس جا تک نظر
چاندنی ہی چاندنی تھی، آنکھ اٹھتی تھی جدہر

آسماں سے کب کمال اُس کا نہ دیکھا جا سکا
رفتہ رفتہ اُس کو نقصان آہ پہونچانے لگا

دست برد چرخ نے جس دم لگایا اسمیں ہاتھ
ہوگئی کایا پلٹ، چھوڑا مقدر نے بھی ساتھ

پھر نہ وہ تابش نہ چہرے کی بحالی رہ گئی
دیکھتے ہی دیکھتے شکل ہلالی رہ گئی،

آہ اس پر بھی ستمگر کو نہ جب تسکین ہوئی
دل میں پیدا ایک فکرِ ظلم نو آئین ہوئی

یعنی چاروں سمت آفت خیزیاں کرنی شروع
عالم اسلام میں خونریزیاں کردیں شروع

اندلس میں، مصر میں، بغداد میں، ایران میں
شام میں، غرناطہ میں، دیلم میں، اور گیلان میں

روم میں، سسلیہ میں، سندھ میں، اسپین میں
قرطبہ میں، اور قادس میں، حلب میں، چین میں

آج یاں کردی قیامت، کل وہاں ڈھایا غضب
اور جب ڈھایا غضب تو ناگہاں ڈھایا غضب

سر مسلمانوں کے تھے، اور خنجر جنگر فشاں
جسجگہ دیکھا لہو کا ایک دریا تھا رواں

گھٹتے گھٹتے تو ہوا تھا ماہ کامل سو ہلال
اور بھی ان آفتوں نے کردیا اسکو نڈھال

دیکھکر خون مسلماناں ہلال اس کا خون ہے
بلکہ قطرہ رنج و غم سے یہ سراپا خون ہے

یہ دکھانے کو کہ کیسی حالت اسلام ہے
اب ہلال سرخ نقشِ رایت اسلام ہے

تمنّا۔ عمادی پھلواری (عفی عنہ)



دہلی

تمدن

ابن باجہ اور مسئلہ ارتقا

ابن ماجہ اور ابن باجہ یہ دو نام تھوڑے سے اختلاف سے قریب قریب ایک ہیں مگر ہماری بحث اسوقت ان بزرگ ابن ماجہ سے نہیں ہے جن کا نام آسمان حدیث پر قمر چہار دہم کی طرح جگمگا رہا ہے۔ بلکہ اندلس کے اُس مشہور حکیم ابن باجہ سے ہے جس کے فلسفہ اور تعلیم پر ایک عرصہ تک یورپ سر تسلیم خم کرتا رہا۔

فلسفہ جدید نے سترھویں صدی عیسوی میں اس راز کا انکشاف کر دیا کہ یورپ کی تمام تحقیقات و معلومات کا منبع مسلمانوں کی محنت ہی اور یہ جو کچھ ظاہر ہوا اور ہو رہا ہے ان ہی بادیہ نشین دماغوں کی گلکاریاں

ہیں جو یورپ میں پہنچکر خون جگر سے سینچی گئیں اور آج ہم کو معطر کر رہی ہیں۔
باتوں میں ردّ و بدل اصلاحات میں اصلاح آلات و رصد گاہوں میں ترمیم یورپ کا صرف اس لئے کہ ایجاد کا سہرا انہوں نے بجائے اپنے شیوہ رہا یہی وقت ہمکو ابن باجہ کے نام میں بھی پیش آرہی ہے جو ہمکو اوپیس کی صورت میں نظر آرہا ہے۔ یہ کچھ تعجب انگیز نہیں کیونکہ ابن رشد بھی وہاں پہنچکر اوبروز بنگیا تھا اور اسی طرح اکثر ناموں کی ہیئت تبدیل ہوگئی مگر افسوس اس کا ہے کہ عربی کی وہ کتابیں جو اسوقت ہمارے پاس موجود ہیں ابن باجہ کے حالات پر مطلق روشنی نہیں ڈالتیں صرف آثار الازہار میں ضمناً تھوڑا سا حال درج ہے اس کی تصانیف کے ترجمے مختلف زبانوں میں یورپ نے کئے اور سپین میں اب بھی وہ کتابیں موجود ہیں۔
اسلامی تاریخ پانسو برس آگے نکل آئی مشرقی علوم و فنون کا دریا زور شور سے لہریں لے رہا ہے کہ سرگوسہ میں ابن باجہ کی پیدائش نے فلسفہ کا ڈنکا بجا دیا وقت ایسا نازک تھا کہ فلسفہ الحاد کی جڑ تسلیم کر لیا گیا تھا اور نہ صرف عوام بلکہ حکومت بھی اس سے متفق تھی ایسی حالت میں ابن باجہ کا تحصیل فلسفہ میں اسقدر محنت کرنا کہ ایک وقت میں مشرق و مغرب دونوں پر اس کا سکہ بیٹھ جائے اسی کا کام تھا
یہ کچھ کم افسوس کی بات نہیں کہ ابن باجہ کے ابتدائی حالات کا کسی کتاب

سے مطلق پتہ نہیں چلتا مگر اس کی بدقسمتی تھی کہ اہل سرگوسا کو اس کے کمال سے کوئی فائدہ نہ پہنچا والی سرگوسا ابن صحراوی جو فلسفہ کا جانی دشمن تھا ابن باجہ کی شہرت سنکر اسکے ملنے کا مشتاق ہوا اور ایک جلیل القدر عہدے پر اسکو ممتاز کیا مگر تھوڑے ہی عرصہ بعد یعنی ۵۱۲ھ میں ابن صحراوی کے ہاتھ سے سرگوسا کی باگ حکومت نکل کر اہل فرنگ کے قبضہ میں آئی اور ابن باجہ اشبیلہ چلا گیا۔

اشبیلہ اس وقت فلسفہ کا مرکز تھا اہل شہر نے اچھی طرح مہمان نوازی کی مگر کچھ آب وہوا کی ناموافقت اور کچھ اہل فاس کا اصرار ۵۲۱ھ میں امیر یحییٰ بن یوسف کے دربار میں وزیر مقرر ہوا جہاں اس نے علوم کے ایسے دریا بہائے کہ آج تک دنیا بالعموم اور یورپ بالتخصیص اس سے سیراب ہو رہا ہے۔

اس کا خیال تھا کہ قبل از آفرینش موجودہ کائنات کا وجود با تفویٰ خدا کی ذات میں تھا اور وہی ذات مرئی ہو کر محسوسات عالم میں شامل ہو جاتی ہے یہ ہی خیال جرمنی کے مشہور فلاسفر ہیجل کا ہے مگر برخلاف ہیجل کی رائے کے کہ وہ پرستش انسان کو مقدم سمجھتا ہے۔ ابن باجہ کے خیالات سے خدا پرستی آشکار ہو رہی ہے

وہ بظاہر ارسطو کا پیرو معلوم ہوتا ہے اور اس نے جا بجا خدا کی وحدانیت کا اقرار کیا ہے۔ مسئلہ ارتقا پر اس نے کافی بحث کی ہے۔ مگر بآغاز عمر وہ توحید کی طرف جھک گیا ہے اسکی تصانیف کا اندازہ بہت مشکل ہے

صاحب طبقات الاطبا نے ایک طویل فہرست اس کی تصانیف کی درج
کی ہے مگر افسوس وہ سب ہمارے واسطے ناپید ہیں۔ طب منطق۔ ریاضی
فلسفہ میں اس نے ایسا نایاب ذخیرہ چھوڑا کہ یورپ نے اُسکو سر اور آنکھوں پر
رکھا اور اب تک اُس کے رسایل اسکوزیل کے کتب خانہ میں موجود ہیں
عرب کہتے ہیں کہ فارابی کے بعد ابن باجہ صرف وہ شخص گذرا جس پر عرب جتنا فخر کرے
کم ہے مگر عرب مصنفین نے ابن ماجہ کی قدردانی میں بخل سے کام لیا
فارابی کی قابلیت سے ہمکو انکار نہیں مگر ابن ماجہ کا شاگرد رشید ابن رشد
تبحر علم کی کسی شاخ میں فارابی سے کم نظر نہیں آتا
حقیقت نفس پر اسکی تصنیف قوت محرکہ پر اسکی تحقیق اور ارادہ وقصد
پر اس کے مضامین ایسے مفصل اور مدلل ہیں کہ اسکے بعد ان موضوع پر
قلم اُٹھانے والونکو اسی کی اطاعت کرنی پڑی اس کے فلسفہ کا خلاصہ
تدبیر حیات المتوحد میں درج ہے جس میں اس نے باوجود ارتقا کے توحید
کو ہاتھ سے نہ دیا وہ کہتا ہے انسان کو حیوان سے وہی نسبت ہی جو حیوان
کو نباتات اور نباتات کو جمادات سے اسی سلسلہ میں وہ کہتا ہے خدا پر
ایمان لانے والے کو اپنے مدارج زندگی کس طرح طے کرنے چاہیں ؟
اب وہ افعال انسانی سے بحث کرتا ہوا اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ ہر عمل انسان
جو صرف اس لئے اُسکا عمل ہو سکتا ہے کہ وہ انسان ہے صرف وہ عمل ہے
جو آزادانہ اس سے صادر ہو گو یہ صدور بالقصد ہو مگر صدور بالقصد
بعد تامل اور اگر فوری یا طبعی ہو تو وہ آزادی کی حدود میں داخل نہیں

وہ افعال انسانی کو دو حصوں پر اس طرح تقسیم کرتا ہے۔
حیوانی یعنی انسان کا ہر وہ کام جس میں فاعل کے سوا کسی ایسے ذی روح کا فائدہ یا نقصان متعلق نہ ہو جس کے نفع و ضرر سے فاعل کو کوئی واسطہ ہے۔
انسانی یعنی وہ قوت جس میں فاعل نے اُسکے صدور کے وقت یا قبل از صدور کسی دوسرے بنی نوع انسان کے فائدہ کو ملحوظ رکھا ہو
فتح ابن خاقان جو غالبًا ابن باجہ کا ہمعصر تھا۔ پہلا شخص ہے جس نے اس کے حالات لکھے مگر افسوس باہمی رنجش کی وجہ سے یہ حالات زیادہ تر ابن باجہ کے مخالف ہیں اور اسکی وجہ یقینی کسی ذاتی مخاصمت پر مبنی تھی ورنہ فتح ابن خاقان جیسا مصنف جس کی مشہور کتاب قلائد العقیان ایک عرصہ تک اس کا نام زندہ رکھیگی متضاد الفاظ قلم سے نہ نکالتا
علامہ احمد مقری نے ابن خاقان کی یہ رائے نفح الطیب میں نقل کی ہے
"ابن باجہ میں نور دانشمندی چمک رہا ہے اور اُسکے دلائل و براہین اہل حجت کو منقطع کرتے ہیں اس کا زمانہ زمانوں کا سرتاج ہے۔
مخاصمت و رنجش باہمی جو مسلمانوں کا اب بھی اصول زندگی ہے اسوقت بھی موجود تھا اور ابن باجہ کسی دشمن کے زہر سے ۵۳۳ھ میں رخصت ہوا اور ایک ایسا شخص جہاں سے اٹھ گیا جس کی یادگار قیامت تک قایم رہے گی

ہوا!

تیرے چلنے اور ہوا ہی اعتبار زندگی
تیرا دم ہے باغ ہستی میں بہار زندگی

آمد و رفت نفس ہے صرف تیری ذات سے
لطف دنیا کی ہوس ہے صرف تیری ذات سے

تیرے چلنے کو بلندی اور پستی ایک ہے
تیرے آگے کوہ جنگل اور بستی ایک ہے

تیری سرعت کے لئے اک کھیل ہے دنیا کی سیر
تیری ہمت کو ہے آسان عالم بالا کی سیر

روح کو فرحت نہ دی تو چلکے تو گھبرائے وہ
تو نہ پہنچی شمع کی تو تک تو گل ہو جائے وہ

زندگی اک نقطہ اُسکا اور ہوا مطلب ہے تو
روح کا مرکب ہوئے سانس کا مرکب ہے تو

عنصری قوت سے تو ہی عالم اجسام میں
ایک چوتھائی پہ قابض ملک ہفت اندام میں

تو لطیف ایسی کہ ہمکو شکل دکھلاتی نہیں
جسم کو چھوتی ہے آنکھوں کو نظر آتی نہیں

ہو اگر ناقص تو خلقت کے لیے تو سم ہے
صاف آمیزش سے ہو تو صحت عالم ہے

جو نفس دنیا میں ہی بھرتا ہے وہ تیرا ہی دم
سب تجھی کو کھاتے ہیں لیکن تو نہیں ہوتی ہے کم

دم نہیں لیتی ذرا بھی سانس اگر پاتی ہے تو
پیٹ میں جاتی ہے باہر پھر نکل آتی ہے تو

راز غنچہ گل ہوا جب پردہ در تو ہو گئی
منتشر چاروں طرف تشہیر سے بو ہو گئی

نرم چلتی ہے تو پھولوں کو کھلا دیتی ہے تو
تیز چلتی ہے تو پیڑوں کو ہلا دیتی ہے تو

برگ رقصاں ہوتے ہیں جب آتی ہے تو عنبر
ساتھ تیرا پا کے اڑتی پھرتی ہے بو باغ میں

تو جو چلتی ہے تو یوں ہلتے ہیں پیڑوں میں شجر
جیسے ہو نغمہ کو سنکر وجد میں صوفی کا سر

تو نہ لائے تو نہ آئے ہم تک آواز طیور
تیرے ہی چلنے بلندی پر ہی پرواز طیور

ساتھ اپنے اوج پر بادل کو لیجاتی ہے تو
جا بجا سے جمع کر کے اسکو پھیلاتی ہے تو

رعد کی آواز بنکر تو ڈراتی ہے کبھی
زلزلہ بنتے کو زیر ارض جاتی ہے کبھی

بادلوں کو تو نہ ٹکرائے تو کیوں تاباں ہو برق
تو نہ نکلے تن سے تو کیوں عمر کی کشتی ہو غرق

تیرے چلنے زور دست موج کا ہے اور ہوا
جس سے کٹتے ہیں سمندر کے کنارے جا بجا

کھیلتی ہے تو کبھی موجوں سے اب بحر میں
جا کے چھپتی ہے کبھی قصر حیات بحر میں

تو نہو تو بادباں کا کام چل سکتا نہیں
کام کیسا بلکہ اسکا نام چل سکتا نہیں

سرو گرم دہر سے ہے متفق دنیا میں تو
سرد ہے سرما میں تو اور گرم ہے گرما میں تو

تو نے اپنے دم سے ہر ظرف تہی کو بھر دیا
غیر ممکن ہے خلا یہ مسئلہ طے کر دیا

تیری تیزی سے جو ہوتا ہے تلاطم بحر میں
غرق ہو کر کشتیاں ہو جاتی ہیں گم بحر میں

دخل دیتی ہے وہاں تو راہ پاتی ہے جہاں
گرد کو بھی ساتھ لیجاتی ہے جاتی ہے جہاں

تیز رو ہو پھولوں کے سر کو پھرا دیتی ہے تو
زور کرتی ہے تو پیڑوں کو گرا دیتی ہے تو

رقص پر جب تو ہوئی مائل بگولا بنگئی
تیرے ہاتھوں شاخ گل چڑیوں کا جھولا بنگئی

بنکے آندھی تو اڑاتی ہے خس و خاشاک کو
تو چڑھاتی ہے بلندی پر زمیں سے خاک کو

اوج پر تیرا کرہ ہے اور تو ہے پست میں
پھرتی ہے باغوں میں گلیوں میں گھروں میں دشت میں

سرد ہو کر تو صبا ہے گرم ہو کر لو ہے تو
چین ہے جسکے نہ آئے خلق کو تو وہ ہے تو

انکسار ایسا کہ ہے تو خاک در بے قدر دم
افتخار ایسا کہ ہے بالانشیں دشت و شہر

اختیار ایسا کہ جسکے گھر میں چاہے جائے تو
اعتبار ایسا کہ دلوں میں بھی جا ہے آئے تو

گر نہ تجھکو جانب جذب رطوبت میل ہو
جسم انساں کا ایسا اثر بڑھنے میل ہو

مل کے سورج کی شعاعوں سے جو تو ہوائی ہو
بجنے کر دیتی ہے دانتوں کو جو ہونٹوں نغمے ہم

دوش پر لیکر اگر تو ہو نہ ہر جانب رواں　　نکلے بسم اللہ کے گنبد سے نہ آواز اذاں
بانسری سے نکلے نغمہ آتی ہے کانوں میں تو　　ہوں ساکس طرح تا میں گونجتا کانوں میں تو
بارش گرما میں دریا پر فروں تیرا جلال　　فصل سرما میں عیاں تیری روش سے اعتدال
تو نہ ہو تو نہیں کہیں خشک اور کہیں مرطوب ہے　　دو نوں شکلیں ہیں مضر ہو معتدل تو خوب ہے
چین تو پاتی نہیں فطرت کے ہاتھوں رات دن　　کام گردش ہے تجھے بارہ مہینے سات دن
رخ بدلنا تیرا شیوہ ہے تلون تیری خو　　بس انھیں چالوں سے جو بائی ہوئی مشہور تو
دم میں کوسوں دور ہو گی گو ابھی تو ہم میں ہے　　صرف بجلی تجھ سے بڑھ کر تیز رو عالم میں ہے
ملکے باراں سے کیا حملہ جو تو نے شہر پر　　پڑ گیا پانی گھروں پر گر گئے دیوار و در
بے دہن ہے تو مگر آواز رکھتی ہے ضرور　　ساز اور نغمے سے باہم ساز رکھتی ہے ضرور
لاکھ پردوں میں بھی پہنچے وہ رسائی تجھ میں ہے　　ہر جگہ ہونے سے اک وصف خدائی تجھ میں ہے

کھینچتی ہے دم میں آہ گرم دم میں آہ سرد
شوق سودائی کی صورت رہتی ہے تو کوچہ گرد

احمد علی ۔ شوق قدوری

عمر کا تخمینہ مغربی علما نے بعد از تحقیقات اندازہ لگایا ہے کہ گھریلو مکھی ۲۴ گھنٹہ تا ۵ مئی کی مکھیاں ۶ ہفتہ جیتی ہیں۔ تتلیاں اور شہد کی مکھی ایک سال زندہ رہتی ہے خرگوش اور بھیڑیے کی عمر ۶ سے ۱۰ سال تک بھیڑ کی ۱۲ سے ۱۵ سال اور بلبل ۱۲ سال کتے کی عمر ۱۵ سال تک مویشی کی عمر ۲۰ سال گھوڑے کی عمر ۲۵ سے ۳۰ سال عقاب کی ۳۰ سال۔ بارہ سنگے کی ۲۵ سے ۴۰ سال۔ بنگلے شیر ببر اور ریچھ کی ۵۰ سال۔ ہاتھی کی ۱۰۰ سال۔

اورنگ زیب کی خانگی زندگی

ازواج نمبر (۱)

بادشاہوں کے جو حالات عام طور پر مشہور خلایق ہوتے ہیں وہ زیادہ تر اُن کی پولیٹکل زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور چونکہ ایسی حالت میں انسان قواعد وضوابط کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہوتا ہے اس لئے وہ زیادہ تر ایک میشین کی مانند ہوتا ہے کہ کنجی دیدی اور مشین چلنے لگی۔ لیکن اگر کسی بادشاہ کی بشریت دیکھنی ہے تو اسکی خانگی زندگی کا ملاحظہ کرنا چاہیے۔ تخت پر بیٹھکر بادشاہ خدا کا سایہ ہونے کی حیثیت سے اپنے دبدبے اور جلال کے رعب سے ایک عجیب خوفناک چیز معلوم ہوتا ہے لیکن محل کی چار دیواری میں ایک خاوند اور باپ کی حیثیت سے وہی بادشاہ ہر معمولی انسان کی طرح خاصہ بھلا چنگا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ جو روتا بھی ہے اور ہنستا بھی ہے۔ بیوی سے چوچلا بھی کرتا ہے اور بچوں سے کھیلتا بھی ہے اورنگ زیب مغل بادشاہوں میں سب سے زیادہ احکام شریعت اور قانون ملک پر چلنے والا بادشاہ تھا اور نہایت سخت گیر اور منصف مزاج حاکم تھا۔ نوّے برس کی عمر پائی اور بادشاہت کا زیادہ حصہ دکن کی یلغار میں صرف کیا اور وہیں وفات پائی شہزادگی کے زمانے میں

بھی دکن میں حاکم رہا اور شروع سے اخیر تک کبھی چین سے بیٹھکر محلات میں عیاشی کرنے کا موقع نہ ملا ایسے بادشاہ کی خانگی زندگی خالی از دلچسپی ہوگی

شاہ طہماسپ صفوی بادشاہ ایران نے قندھار کا قلعہ اپنے بھتیجے سلطان حسین میرزا کو بخشدیا تھا۔ حسین میرزا کے صاحبزادے میرزا مظفر حسین نے قندھار اکبر کے حوالے کیا اور خود اسکے دربار میں جگہ پائی۔ مرزا مظفر کے چھوٹے بھائی میرزا رستم بھی اس زمانہ میں ہندوستان میں آکر رہنے لگے اور جہانگیر کے عہد میں بڑے بڑے جلیل القدر عہدوں پر ممتاز ہوئے میرزا مظفر حسین کی بیٹی شاہ جہاں کو بیاہی گئی اور میرزا رستم کی ایک بیٹی کا بیاہ شہزادہ پرویز سے ہوا اور دوسری کا شجاع سے۔ میرزا رستم کا بیٹا بھی اب امراد شاہی میں سے تھا اور اسکو شاہ نواز خان کا خطاب ملا ہوا تھا۔ شاہ نواز کی ایک بیٹی کی نسبت اورنگ زیب سے ہوئی اور دوسری کی مراد بخش سے۔ اورنگ زیب کی منسوبہ کا نام دلرس بانو بیگم تھا۔ شادی کی رسم بڑی دھوم دھام سے ادا ہوئی۔ ۱۵۔ اپریل ۱۶۳۷ء کو اورنگ زیب بحالت شہزادگی آگرہ پہنچ گیا تھا۔ شاہجہان نے اُسے بہت پیار کا خط لکھا تھا۔ شاہی نجومیوں نے ۸ مئی کا دن شادی کے لئے مبارک قرار دیا تھا ایک دن پہلے حنابندی کی رسم ادا ہوئی۔ دلہن والوں نے بڑے تزک وشان سے مہندی بھیجی۔ کشتیوں میں دولھا کا جوڑا۔ دولھا کے عزیزوں کے

لئے رومال تھے۔ نقل۔ میوے۔ مٹھائیاں۔ عطر پان اور آتشبازی خوانوں میں قرینے سے لگی تھیں۔ دولھا کے ہاتھ پاؤں میں مہندی لگائی گئی جوڑا پہنایا گیا۔ اور نقل کھلائے گئے۔ باقی کی چیزیں عزیز و اقربا میں تقسیم ہوگئیں۔

دوسرے دن باجے گاجے کے ساتھ برات چلی اور دلھن والوں کے گھر پر نکاح پڑھایا گیا۔ شاہ جہاں بھی تشریف رکھتے تھے۔ چار لاکھ کا مہر بندھا۔ دلہن رخصت ہوکر سسرال آگئی۔ اس طرح اورنگ زیب کی پہلی شادی کی رسم ادا ہوئی۔ دلرس بانو بیگم کا خطاب ملا شاہ صفوی کے خاندانیں سے ہونیکی وجہ سے انکو اپنے خاندان کا بہت غرور تھا۔ مزاج کی بھی ذرا تند تھیں اور تریاہٹ سب اُن پر ختم ہوگئی تھی۔ اورنگ زیب کی بھی اس بیگم سے کتنی دبتی تھی اور کبھی اس کی بات رد نکرتا تھا بیس برس تک اورنگ زیب کا ساتھ دیکر آخر ۸ اکتوبر ۱۶۵۷ء کو دلرس بانو بیگم بچہ ہونیں اورنگ آباد میں انتقال کرگئیں اور اورنگ زیب نے اپنی تخت نشینی پر انکی قبر پر آگرہ کی تاج کے نمونے پر ایک شاندار مقبرہ تعمیر کرایا جسکی مرمت بعد میں دلرس بانو کے فرزند ارجمند شہزادہ اعظم نے کرائی یہ مقبرہ رابعہ الدوران کے نام سے آجتک مشہور ہے انکے علاوہ اورنگ زیب کی جو دوسری ازدواج تھیں وہ علی قدر مراتب بائی اور محل کے خطاب سے مشہور تھیں اورنگ زیب کی دوسری بیوی رحمت النسا جو کشمیر کی ریاست راجوری کے راجہ کی بیٹی تھی انکی پیدایش کے متعلق ایک عجیب حکایت مشہور ہے کہتے ہیں کہ کشمیر میں سید شاہ میر ایک بڑے بزرگ گذرے ہیں راجوری کے راجہ کو ان سے بڑا اعتقاد تھا حتی کہ اُسنے اپنی بیٹی ان کی خدمت میں پیش

کردی - سید صاحب نے اس راج کنواری کو مسلمان کرکے اس سے نکاح پڑھا لیا - خدا نے اس عورت سے سید صاحب کو ایک لڑکا اور ایک لڑکی عطا فرمائی - اسی اثنا میں سید صاحب حج کے ارادے سے بیت اللہ تشریف لے گئے اور بال بچے پیچھے راجہ کے سپرد کر گئے سید صاحب تو واپس نہ آئے مگر راجہ نے ان بچوں کو اپنی اولاد کی طرح پالا - حتیٰ کہ کسی پر یہ بھی ظاہر ہونے دیا کہ وہ مسلمان ہیں یا ہندو - جب لڑکی جوان ہوگئی تو راجہ نے اسکو شاہ جہان بادشاہ کی خدمت میں بطور نذرانہ پیش کیا - شاہجہان نے اس کا عقد اورنگ زیب سے پڑھوا دیا

آخر عمر میں نواب بائی کی اورنگ زیب سے ناچاقی ہوگئی تھی جس کی وجہ غالبًا محمد سلطان اور معظم کی سرکشی تھی جو نواب بائی کے بطن سے تھے ان کی یادگار رفردا پور کی سرائے اور اورنگ آباد کا بیجی پورہ محلہ ہے - ان کا انتقال ۱۶۹۱ء میں دلی میں ہوا مرنے سے بہت دن پہلے ہی یہ اپنے خاوند سے جدا ہو چکی تھیں اور برسوں سے اورنگ زیب کی شکل تک نہ دیکھی تھی - ان کا بیٹا معظم اورنگ زیب کے بعد بہادر شاہ کے لقب سے تخت کا وارث ہوا -

تیسری بیوی کا خطاب اورنگ آبادی محل تھا - کیونکہ وہ اورنگ آباد میں محل میں داخل کی گئی تھیں ۱۶۸۸ء میں بیجاپور میں طاعون کا زور ہوا اسی زمانے میں اورنگ زیب کا ادھر سے گزر ہوا بچاری اورنگ آبادی محل کو طاعون نے آدبایا اور وہ بیجاپور کی بھینٹ ہوئیں -

اورنگ زیب کی سب سے چاہیتی بیوی اودے پوری محل تھیں۔ منوچی جارجیا کی زرخرید بتاتا ہے اور لکھتا ہے کہ پہلے وہ دارا شکوہ کے حرم میں تھیں۔ ان کا اور اورنگ زیب کا عمر میں بہت تفاوت تھا جس وقت اورنگ زیب کی عمر پچاس برس کی تھی تو اودے پوری کے پہلا بچہ کام بخش پیدا ہوا بادشاہ اس بیوی پر اسقدر شیدا تھا کہ اسکی کسی بات کو رد نہ کرتا تھا۔ کام بخش کی نالایقی اور بد اطواری کی چشم پوشی صرف اُس کی ماں کی وجہ سے ہو جاتی تھی ورنہ اورنگ زیب جیسا پکا اور متشرع مسلمان کس طرح کام بخش کی بادہ خواری اور بدمستی کو گوارا کر سکتا تھا

ان چار بیویوں کے علاوہ ایک پرستار قدیم الخدمت بھی تھی جس نے کہ اورنگ زیب جیسے صوفی باصفا کو عشق کے بازار میں "ہمچو صنعا زاہدے" رسوا کیا۔ اس عورت کا نام ہیرا بائی تھا اور بعد میں یہ زین آبادی کے نام سے مشہور ہوئی حمید الدینخاں نے حکایات عالمگیر میں اورنگ زیب اور زین آبادی کے عشق کا حال خوب لکھا ہے یہ قصہ یوں مشہور ہے کہ اورنگ زیب کے خالو میر خلیل دکن میں حاکم توپ خانہ بڑے مشہور آدمی تھے۔ اورنگ زیب اپنی خالہ سے ملنے برہان پور گیا اور دوران قیام میں ایک دن دریائے تاپتی کے پار زین آباد نامی باغ میں اس کی نظر ایک عورت پر پڑی جو آم کی ڈالی پکڑے جھوم رہی تھی۔

اورنگ زیب کی عمر اسوقت ۲۵ برس کی تھی اور وہ عین عنفوان شباب میں تھا اس عورت کی یہ مستانہ ادا اورنگ زیب پر ایسی کارگر ہوئی کہ

کہتے ہیں اُسے عشق آگیا

خالہ کو خبر ہوئی بہت سٹ پٹائیں دو تین گھڑی بعد بھانجے کو ہوش آیا خالہ نے بہت پوچھا کہ بابا کیا اسرار ہے مگر اورنگ زیب نہ منہ سے بولتا تھا نہ سر سے کھیلتا تھا آخر بمشکل تمام صبح ہوتے اتنی بات کہی کہ اگر میرے مرض کا علاج کرسکو تو بتاؤں بھی ورنہ کیا فائدہ خالہ نے کہا کہ میں تو تجھ پر سے اپنی جان تک کو قربان کرنے کو تیار ہوں ایسا کیا مرض ہے جس کا علاج ہم نہ کرسکیں گے۔ آخر شہزادے نے رازِ سربستہ کو کھولا خالہ کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی وہ سمجھ گئی کہ یہ عورت ہو نہو ہیرا بائی ہو جو میر خلیل کی مدنظر تھی گھبرا کر بولی کہ میاں صاحبزادے تم اپنے خالو سے واقف ہو میری تمھاری تو کیا اصل اس معاملہ میں تو وہ شاہ جہان بادشاہ کو بھی خاطر میں لانے والے نہیں اگر اس بات کی بھنک بھی ان کے کان میں پڑ گئی تو اول تو وہ ہیرا بائی کا خاتمہ کریں گے اور پھر مجھ پر ہاتھ صاف کریں گے خیریت اسی میں ہے کہ تم اس خیال خام کو اپنے دماغ سے نکال دو

مگر عشق کا بھوت کہیں ناصح نادان کی جھاڑ پھونک سے تھوڑا ہی اترا کرتا ہے۔ اورنگ زیب نے مرشد قلی خان سے مدد مانگی۔ اس شیر مرد نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا کہ صاحب عالم یہ کیا بڑی بات ہے آج شام تک آپ دیکھیں گے کہ آپ کا رقیب (میر خلیل) معشوق کی بغل کے بجائے آغوش لحد میں سوتا ہوگا اورنگ زیب باوجود اس جوانی و عشق کی دو آتشہ

بادہ نوشی کے ایسا مدہوش ہوا تھا کہ ایک بے گناہ کا خون اپنے سر پر لینے کے لئے تیار ہو جاتا اور اپنی خالہ کی بیوگی کا باعث بنتا اس کی جبلی انصاف پسندی اس کے کام آئی اور مرشد قلی خان کو اس سے روکا اور کہا کہ میں اپنی مہندی کی رسم اپنے خالو کے خون سے ادا کرانا نہیں چاہتا ایسی تدبیر نکالو کہ سانپ مرے نہ لاٹھی ٹوٹے مرشد قلیخان نے موقع دیکھ کر سارا حال میر خلیل سے کہدیا۔ اس پر اورنگ زیب کے اس ضبط کا ایسا اثر پڑا کہ اس نے خوشی خوشی ہیرابائی کو اس کے حوالے کر دیا جس کے بدلے میں اورنگ زیب نے اپنی لونڈی چیتر بائی میر خلیل کی نذر کی۔

کہتے ہیں کہ اورنگ زیب ایک زمانے میں اس عورت کی محبت میں ایسا ازخود رفتہ اور مدہوش ہو گیا تھا کہ اس نے محبت آزمانے کے لئے ایک دن اورنگ زیب سے اصرار کیا کہ اگر تجھے مجھ سے الفت ہے تو میری خاطر سے شراب پی لے۔ اورنگ زیب نے بہت کچھ انکار کیا مگر وہ کب ماننے والے تھے آخر جو بات دادا کی نہ مانی وہ ایک بت طناز کے کہنے کرنے پر آمادہ ہوا اورنگ زیب اللہ ثانی اللہ کافی کہہ کر پیالہ منہ سے لگانے ہی کو تھا کہ زین آبادی نے جھٹ جام ہاتھ سے چھین لیا اور کہا کہ بس مجھے یقین آگیا کہ تم کو مجھ سے محبت ہے میں تمہارا ایمان نہیں خراب کرانا چاہتی یہ عورت عین عنفوان جوانی میں ملک جاودانی کو سدھاری اور اپنی جدائی کا داغ اپنے عاشق شیدا کے دل پر چھوڑ گئی

مشتاق احمد زاہدی

دلِ ہمدرد

کیا کہیں آپ سے کس واسطے بیتاب ہیں ہم حال کیوں غیر ہے کیوں ماہی بے آب ہیں ہم
کیوں تڑپ دل میں ہے کیوں صورت سیماب ہیں ہم اب تُلے آج پہ شکوۂ احباب ہیں ہم

مدتوں ضبط کیا اب نہیں یارا باقی
کوئی تدبیر نہ ہے اب کوئی یارا باقی

جس قدر پیتے چلے ہم وہ قرینہ مشکل روز و شب خون جگر کا بھی ہے پینا مشکل
اپنے زخم دل صد چاک کا سینا مشکل ایسے آفات ہیں کیونکر نہ ہو جینا مشکل

ضبط سے کام لے انسان کہاں تک صاحب
شکوہ ہم لائیں نہ کس طرح زباں تک صاحب

یہ وہ شکوہ ہے کہ جو اپنے مقدر سے نہیں یہ وہ شکوہ ہے کہ جو قاتل خودسر سے نہیں
یہ وہ شکوہ ہے کہ جو گنبد اخضر سے نہیں یہ وہ شکوہ ہے کہ معشوق ستمگر سے نہیں

میرا شکوہ ہے مسلمانوں کے بچوں سے مگر
میرا شکوہ نہیں غیروں سے ہے اپنوں سے مگر

ہائے افلاس نے ہمتوں کو مٹا رکھا ہے شکر تم کو جو زمانہ نے بچا رکھا ہے
پر تمہیں عیش نے دیوانہ بنا رکھا ہے ہنس کے کہتے ہو کہ تعلیم میں کیا رکھا ہے

جان کیوں مفت میں اپنی کوئی کھوئے صاحب
پاؤں پھیلا کے نہ کیوں چین سے سوئے صاحب

آئے بھی تم اگر اسکول تو پڑھنا کیسا — شوق تعلیم دتومنیں نہیں باقی اصلا
سن لیا سیر تماشے کا اگر کچھ چرچا — یوں لگے کہنے چلیں ہم بھی ہیں پڑھا

چمکے کچھ دیر اگر صبح کے تارے کی طرح
چھپ گئے آنکھ سے بجلی کے نظارے کی طرح

ضد کا یہ حال ہی ہر بات پہ اڑ جاتے ہو — یوں بھی ہوتا ہے کہ بیوجہ اکڑ جاتے ہو
ماں نصیحت کی کہے بات تو لڑ جاتے ہو — باپ تنبیہ کرے اس سے بگڑ جاتے ہو

یہ رہ ورسم یہ تہذیب وسلیقہ سیکھا
حبذا خوب شریفوں کا طریقہ سیکھا

مل گیا خوبی قسمت سی اگر ہاں استاد — کون؟ بہبودی تعلیم کا خواہاں تھا د
کون؟ باسط وہ ہر اک تحا نگراں استاد — صاف دل قوم کا ہمدرد مسلماں استاد

ایسے محسن کا بھی دل ہائے دکھایا تمنے
ڈر خدا کا نہ کیا اس کو جلایا تمنے

شکل استاد کی دیکھی نہیں بیمار ہوئے — یوں جلایا اسے یوں دیر آزار ہوئے
جام عشرت کے اکیلے میں طلبگار ہوئے — خوب مدہوش ہوئے خوب ہی سرشار ہوئے

پاس تہذیب کا تھا اور نہ خودداری کا
اس سے چلتا ہے پتہ صاف دل آزاری کا

فیشنیبل ہیں اگر آپ تو کچھ باک نہیں — کون دلدادۂ فیشن تہ افلاک نہیں
سچ کہیں آپ سے لطف سخن اگر خاک نہیں — جوہر علم کا ست آپ کو ادراک نہیں

یوں تو یہ بات نہیں آپکو شایان صاحب

کچھ ترقی بھی کریں آپ نمایاں صاحب

محفل عیش بپا رہتی ہے ہر صبح و مسا | باتیں احباب سناتے ہیں مع شربا
سامنے جام بکف بیٹھا ہے اک ماہ لقا | دیکھئے بادۂ عشرت کا وہ پھر دور چلا

نیند جلسوں میں نہ آتی ہے نہ خواب آتا ہے
جشن جمشید کا کیا خوب جواب آتا ہے

یہ کوئی بات ہی استاد ہدایت نکرے | تم جو تعلیم سے غافل ہو شکایت نکرے
درد ہو دل میں مگر اسکی حکایت نکرے | فرض ہے چاہیئے انساں کو رعایت نکرے

سچے ہمدرد ہیں اور کام کے انساں ہیں ہم
جھوٹ کہتے نہیں تم سے کہ مسلماں ہیں ہم

اس میں کیا شک ہے کہ ہم غیر نہیں یگانے ہیں | تم سمجھتے ہو ہمیں ایسا ہی ہم جانے ہیں
شمع الفت کے مگر کیا کریں پروانے ہیں | تم پڑھو دل سے اسی بات کی پروانے ہیں

کی بھلائی ہے اگر۔ نیک جزا پائیں گے
ورنہ ہم پیش خدا اسکی سزا پائیں گے

چاہیئے تھا تمہیں تم سر بگریباں رہتے | کوئی سمجھاتا اگر تمکو پریشاں رہتے
اپنی تعلیم میں ہر طرح سے کوشاں رہتے | سبکو خوش رکھتے ادھر آپ بھی شاداں رہتے

بر خلاف اُسکے ہو لڑنے کے لئے تم تیار
یہ بھی نادانی کا ہے صاف نمایاں اظہار

خالص ہی کی بھلائی کو وہ ہیں احسن سمجھے | جان سمجھے نہ کبھی اپنی نہ ہم تن سمجھے
درد مندوں کا نہ تم نالہ [illegible] سمجھا | کیا ستم تمنے کیا دوست کو دشمن سمجھے

میں حشرات الارض کی طرح نکل رہے ہیں اُس کے نصف حصہ تعداد کی عورتوں کو خبر تک نہیں جو ان بے داموں محنت کرنے والوں کا شکریہ ادا کریں۔ میاں ہیں کہ کہیں تمدن میں۔ کہیں مخزن میں۔ کہیں کا مرڈ میں دے مضمون پر مضمون لکھ رہے ہیں پردہ ایسا اور پردہ ویسا۔ بڑا اخرآ سوسائیٹی کا ستیاناس کرنے والا لاحول ولا قوۃ اور بیچاری بیوی کو اپنے گھر بار کے دھندوں اور آپس کی غیبتوں اور وانتا کل کل سے ہی فرصت نہیں جو ان بچاروں کی محنت کی داد دے کہ واہ میاں واہ تم تو خاصا بک لیتے ہو۔ اور جو بیوی نے کہا کہ اوئی میاں توج کسی شریف کی بہو بیٹیاں اس طرح سے باہر نکلیں جیسا تمنے لکھا۔ تو فرمائے کیا ہیں کہ تم بھی وہی رہیں نا جاہل۔ اونہہ کس مردوکی نیت ہے کہ تم یا اور اپنے گھر کی عورتیں باہر جائیں یہ تو فقط دل لگی۔ شہرت اور محض لوگوں کے چھیڑنے کے لئے لکھا جاتا ہے۔ ہاں اگر دوسرے خاندان والوں پر کچھ اپنے مضمون کا اثر بھی پڑ جائے تو ہمارے لئے کیا بُرائی ہے۔ عمل آپ کا یہ ہے کہ پرسوں پرلے دل کی بات ہے کہ بچاری شامت کی ماری کا چھن یعنی ترکاری بیچنے والی گھر میں جو آئی تو ساتھ ایک لڑکا بھی تھا ہو گا کوئی دس برس کا۔ آپ بھی گھر میں موجود تھے۔ کہنے لگے کیوں ری یہ اتنے بڑے بڑے لڑکے تو زنانخانہ میں اپنے ساتھ لے آتی ہے خبردار جو آئندہ سے ایسا ہو گا کیا معلوم نہیں کہ یہاں بیگمصاحبہ تشریف رکھتی ہیں۔ اب سنیں کا دوسرا پردہ اُٹھانے تو وہاں پردے کے موافق صاحب جن کے

دھواں دھار مضامین۔ اخبار وطن پیسہ اخبار۔ آبزرور میں پردے کی ضرورت پر نکل چکے ہیں کئی دفعہ اسپیچیں دے چکے ہیں اور واہ واہ لے چکے ہیں تشریف رکھتے ہیں۔ بیوی سے کہتے ہیں کہ لو چلو کمپنی باغ کی سیر کرتی ہو۔ کیا خاک سیر ہوگی بھلا۔ گاڑی بند ہوگی اس میں کیا دکھائی دے گا۔ بند جھلملیاں اتروا دیں گے اور چلمنیں لٹکوا دیں گے اور جو کوئی ہمیں دیکھ لے۔ دیکھ لیگا توکوں سے تمہارے موتی توڑ لیگا وہ اپنی راہ تم اپنی راہ۔ اس کے علاوہ یہ کہ شاید مشکل سے کوئی دو سکنڈ کے لئے کسی کی نظر چلتی ہوئی گاڑی میں بیٹھے ہوئے پر جمتی ہو اب اتنی دیر میں کیا نقشہ اور شکل کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔ غرض گئے اور عشا کے وقت تک گھر آئے

ہم یہ نہیں کہتے کہ در اصل پردے کے حامی یا مخالف عنقا ہی ہیں نہیں ہیں اور ضرور ہیں البتہ ۸۰ فیصدی تو محض دل لگی ہی کے لئے ہیں جو در اصل کچھ ترقی چاہتے ہیں وہ چپ چاپ کام میں لگے ہوئے ہیں۔ کوئی اپنی لڑکیوں کو مولوی گھر پر رکھ کر مسئلہ مسائل کی کتابیں پڑھوا رہا ہے۔ کوئی خود ہی اخلاق کی کتابیں اور زمانہ کے مطابق کچھ معلومات کر کے اخباروں کے ذریعہ سے اپنی بیوی بہنوں وغیرہ کی لیاقت بڑھا رہا ہے۔ کسی کے گھر پر کوئی معلمہ آتی ہے کوئی لڑکیوں کے مدرسہ میں مناسب احتیاط کے ساتھ اپنی بچیوں کو بھیج دیتا ہے۔ کوئی سوزن کاری سیکھنی ہے تو کوئی بڑی بوڑھیوں سے ملنے جلنے کے

کے اداب ہی سے واقفیت حاصل کر رہی ہے۔ کوئی لڑکیوں کی انشا دیکھ رہی ہے تو کوئی ساجن موہنی مولوی سید احمد صاحب دہلوی کی مصنفہ پڑھ رہی ہے۔ غرض نہ لے ہے نہ دے ہے اپنے مزے سے زندگی آرام سے بسر کرنے کے قابل بنانے کی ہر اک کوشش میں لگا ہوا ہے اس کے برخلاف یار لوگ ہیں کہ نہ کچھ کرتے ہیں نہ دھرتے ہیں۔ لکھنا پڑھنا ماں باپ کی عنایت سے آ ہی گیا ہے۔ مذہب پر حملہ کرنا تہذیب میں داخل سمجھا جانے لگا ہے جب مسلمان کے گھر پیدا ہوئے ہیں تو تین چار حدیثوں کا کان میں پڑ جانا کون سی بڑی بات ہے لہذا مذہبی واقفیت سے بھی اطمینان ہوا۔ اب بات کون سی رہ گئی۔ ہاں اسلامی ممالک کا مروجہ پردہ مصری اور یوروپین لڑکی کی زنانہ سوسائیٹی کی حالت کچھ موجودہ تہذیب کی رو سے بہتر ہو تی جاتی ہو تو خبر نہیں ورنہ ابھی تک تو کوئی عمدہ خبر سننے میں نہیں آئی کہ جدید تہذیب کے درخت سے یہ شیریں پھل حاصل ہوئے یورپ اور خاص کر انگلستان بچارا جس کی ہر بات امنا وصدقنا۔ خود گھبرا رہا ہے کہ الٰہی کس بلا میں جان آ گئی ابھی تو وہ پارلیمنٹ میں ووٹ مانگتی ہیں پھر کہیں گی کہ فوج میں کیوں نہیں داخل کرتے۔ کچھ دلیری میں شک ہو تو ہو جائیں ابھی وزیر اعظم صاحب سے دو دو ہاتھ ایک دفعہ۔ ایک جلسہ میں میاں کا ناطقہ بند ہی جو کر دیا تھا۔ اگر کوئی کہے تو اس میں بڑائی کیا ہے بیشک کچھ حرج نہیں اگر مردانہ داری کھانا۔ پکانا بچوں کی پرورش

وغیرہ کا کام اپنے ذمہ لیں۔ اگر وہ اس پر تیار ہوں تو طبیباں کھیں کہ تھوڑے دنوں تک تو یار لوگ کہیں گے۔ کیوں صاحب چوڑیاں پہنکے گھر میں بیٹھ گئے پھر کوئی پوچھے گا بھی نہیں کیونکہ ایک کی دیکھی دوسرا اسی طرح کرے گا۔

یار و مطلب تو اس بحثا بحثی سے یہی ہے نا کہ ہماری عورتیں جیسی اب جاہل ہیں ویسی نہ ہیں بلکہ مہذب اور شایستہ بنکر زندگی کی گاڑی کو ہمارے ساتھ اسی رفتار سے چلانے کو قابل ہوسکیں اگر یہ مقصد سوائے پردے کے دور کرنے کے ۵۰ فیصدی بھی اور طریقوں سے حاصل ہو جائے تو کیوں اس بیچارے آبا و اجداد کے قایم ہوئے پردہ کو توڑتے ہیں ۵۰ فیصدی کیا ۶۰ فیصدی میں بھی آدمی فرسٹ ڈویژن کے نمبر لاسکتا ہے اور حسن محنت کا وظیفہ بھی مل سکتا ہے۔ ہمیں بھی محنت کا صلہ مل جائے گا۔ اور پردہ ہونے سے جو خرابیاں پیدا ہونگی لطور پیشین گوئی کچھ لوگ بتاتے ہیں یا جنھیں بعض دفعہ تم بھی دیکھتے یا سنتے ہو سکے کیوں اُن کو اپنے اوپر لانے کے درپے ہو

محمد نصیر الحق۔ قریشی علیگ

نواب

خریداران تمدن براہ کرم خط و کتابت میں نمبر خریداری ضرور تحریر فرمائیں۔

عمارت و تجارت

بیڑ علاقہ نظام میں ایک تاریخی مقام ہے جس کا وجود راجہ بکرماجیت اور شالباہن کے نہایت قدیم راج سے بھی قبل کا ثابت ہوتا ہے ایک خوشنما دیول جو پہاڑ تیلیقی صنعت کا اعلیٰ نمونہ ہے تین ہزار برس یا کچھ زیادہ کی یادگار اور بدھ مذہب کی ترقیوں کے باقیات الصالحات میں شمار کیا جاتا ہے - فرسودہ نشانیوں سے قیاس کیا جاتا ہے کہ زمانہ ماضی میں یہ دیول ناف شہر تھا - مگر زمانہ حال گذشتہ تمدن اور ترقی کے متعلق عبرت اور یاس و حسرت کے سوا تجارت اور صنعت و حرفت کی کوئی شاندار تصویر نہیں دکھا سکتا - اسی لئے کمشنر صاحب بہادر صوبہ اورنگ آباد دکن نے اس قدیم مقام کے آباد کرنے کی سعی شروع کی ہے - اس موقع پر جو ایک دلچسپ نظم پڑھی گئی تھی وہ ارسال ہے

محمد بن یوسف عرف ایوب

نظم

ہر اک ذی روح کو مسکن کی خواہش ہے ضرورت ہے
یہ مانا قصر شاہی مل نہیں سکتا غریبوں کو
وہ جنگل یا بن ڈھونڈتی ہے نہ گدڑی ہے نہ کمبل ہے
مگر جو ان تنکوں میں ہیں جوہر کھلتے جاتے ہیں
اگر خس پوش کٹیا کو کوئی تنکوں سے چھاتا ہے

بئے کو گھونسلے کی ہے تو ہم کو گھر کی حاجت ہے
مگر اک جھونپڑا بھی کم نہیں ہے بد نصیبوں کو
نہیں کٹیا کی حاجت سب سے پہلے سب کا دل ہے
یہ سب فطری ارادے ہو تو منزل تک جاتے ہیں
تو اونچے سے بھی اونچا کوئی اپنا گھر بناتا ہے

کوئی مسجد کوئی مندر سمجھتا ہے نشاں اپنا / دھرم سالہ کوئی اپنا تو کوئی کارواں اپنا

عمارات جہاں اوراق ہیں تاریخ عالم کے / یہ دکھلاتے ہیں ہمکو دور دور ہی نسل آدم کے

یہ فطری اقتضا ہی جو عیاں ہے یادگاروں سے / شہنشاہانہ محلوں سے گدایانہ مزاروں سے

انہی سے کھوج لگتا ہے تنزل کا ترقی کا / پتہ پائیں نہ گو ہم بزم کا اور دور ساقی کا

غرض تعمیر کی خواہش ہر اک دل میں ودیعت ہے / پھنسا اس شوق میں انساں ضرورت بے ضرورت ہے

ولیکن وہ عمارت ہی مبارک اور مبارک تر / ہو جسکا مدعا خیر محض کے راز میں مضمر

پھر اسکے بعد وہ تعمیر جو بہر تجارت ہو / رفاہ عام کے مقصد میں پنہاں گنج راحت ہو

تجارت کیا کہ ہر انداز دلدارانہ ہے جسکا / یہی وہ شمع محفل ہے جہاں پروانہ ہی جسکا

گذرگاہ جہاں میں قوم ہے وہ وقف پامالی / تجارت کے تمتع سے جو رکھتی جیب ہے خالی

تجارت شہر میں گر ہو تو پھر بازاروں کو کیا غم ہی / کہ سودائے تجارت رونق بازار عالم ہے

اسی دھن کی ہوس اب بیڑ میں بھی گرم بازاری / کہ سودائے تجارت سے ہیں غافل بیوپاری

فغان بیوہ

ایک نوعروس کا شوہر ۳۔ اگست کو مقتل کانپور میں شہید ہو گیا ہے برگشتہ بخت بیوہ اپنے محبوب کے فراق میں اس طرح سرگرم نالہ و فغاں ہے۔

نہیں زحمت وہ لبہائے گویائی زباں میری / نہیں منت کش گوش شنیدن داستاں میری

بہری بہنو! مجھے کیا پوچھتی ہو میں بلاکش ہوں / مثال یاس ہے ملول سراپا درد جاں میری

زمانہ وہ بھی تھا جب میرے بھی ارمان تھے / مگر اب نقش حسرت ہو جگر میرا زباں میری

زمانہ وہ بھی تھا میرا کہ میں مہندی لگاتی تھی / مگر رنگین اپنے خون میں ہیں اب انگلیاں میری

بدلتی دن میں سو سو بار تھی میں اپنے کپڑوں کو / سنواری جاتی تھیں ہر لحظہ سر کی چوٹیاں میری

غرض وہ دن بھی اپنے تھے کہ راحت سے گذرتا تھا / مگر اب تو فقط ہیں یا یہ چشم خونفشاں میری

اب وہ عیش کے دن ہیں نہ وہ عشرت کی راتیں ہیں / متاع زندگانی رہ گئی طرز فغاں میری

مشرقی اور مغربی تہذیب

ابتدائے آفرینش سے یہ قاعدہ رہا ہے کہ لوگ زمانہ گذشتہ کو جہالت کا اور زمانہ موجودہ کو تہذیب و ترقی کا زمانہ قرار دیں مگر ساتھ ہی اس کے ماضی کی ثنا خوانی ہوتی ہے اور حال کو ہمیشہ ایسا زمانہ خیال کیا گیا ہے کہ جس میں تکالیف و مصائب کا ازدیاد اور ناموزوں مسئلوں کی ایجاد نیز غیر مناسب اشیاء کی اختراع بکثرت پائی جاتی ہے فی الواقع یہ مسئلہ نہایت ہی متحیر کرنے والا ہے کہ باوجود یہ تسلیم کر لینے کے کہ حال میں ترقی و تہذیب کا دور دورہ ہے لوگ اس زمانہ سے خوش نہیں یہ انسانی فطرت کی قناعت کا لامحدود ہونا ثابت کرتا ہے۔

تہذیب اُن معروف الفاظ میں سے ہے کہ جو تقریباً ہر کس و ناکس کی زبان پر موجود ہیں مگر جس کے معنی اگر معقول تعلیم یافتہ اصحاب سے بھی دریافت کئے جائیں تو آئیں بائیں شائیں کے سوا جواب ملنا مشکل ہے۔ تہذیب کی تعریف کسی عالم متبحر یا فاضل نے آجتک ایک یا دو الفاظ میں نہیں کی اور اگر کی بھی تو ضرورت زمانہ کے موافق۔ مغربی حکماء نے بھی وقتاً فوقتاً محض ایک سرسری طور پر اسکی طرف توجہ کی اور یونہیں ادھورا چھوڑتے گئے ہوئے۔

چنانچہ ایک مغربی حکیم و فلسفی کا قول ہے کہ تہذیب کے معنی و تعریف ہر زمانہ میں جدا رہے ہیں اور ہر اک قوم نے اسکو اپنی ضرورت کے موافق استعمال کیا ہے۔ بعض اوقات ترقی صنعت و حرفت کے زمانہ کا نام

زمانہ تہذیب قرار دیا۔ ایک زمانہ میں شاعری کے عروج اور زبان کی تکمیل کے زمانہ کا نام زمانۂ تہذیب تھا۔ بعض قوموں نے نئے مذاہب کی اشاعت کے زمانہ کا نام زمانۂ تہذیب مستند مانا۔ کبھی سنگ تراشی مصوری۔ موسیقی اور دیگر فنون لطیفہ نے عروج پا کر زمانہ کو مہذب کہلوایا پھر علوم ریاضی۔ نجوم۔ جفر۔ فلسفہ۔ ہیئت و طبعیات کی بنا اور ترقی سے زمانہ نے تہذیب کا جامہ زیب تن کیا اور اسیطرح مختلف اوقات میں مختلف زمانے مہذب کہلانے کے مستحق ہوئے فی زمانہ فیصلہ کرنا کہ دنیا تہذیب کی کھیتی ہے نہ صرف مشکل بلکہ ایک مسئلہ لاینحل ہے

شاید باریک بین اور زود فہم اصحاب کی رائے ہو کہ زمانۂ موجودہ میں ان تمام ضروریات تہذیب کے اجتماع کو تہذیب قرار دینا مناسب ہوگا۔ تو سوال باقی رہے گا کہ اس لحاظ سے کون کون اقوام مہذب ہوئیں۔ شرق کا مقابلہ غرب سے ہے اور غرب کا اس سے جو کسی کے وہم و گمان بھی نہیں

مشرق کی تہذیب سابقہ تسلیم کرتے ہوئے مغربی حکماء ہندوستان جیسے ملک کو کہ جو تاریخ میں تہذیب کا ملجا و ماوا رہے گا مہذب کہتے ہوئے جھجکتے ہیں اور بجا و درست دنیا نے پلٹے کھائے اور ایسے کھائے کہ کایا پلٹ گئی شخصی حکومت کو شخصی آزادی نے وہ زک دی کہ اسکی چاشنی اختتام دنیا تک زبان سے نہ جائے گی۔ جس قوم میں یہ نہیں وہ تہذیب سے معرا و مبرا جس قوم کے افراد اپنے حقوق سے ناواقف اور آزادی سے بے بہرہ ہیں وہ مہذب کہلانے کے ناقابل جس ملک میں شاہ و گدا میں تفریق اور گورے

وکالے یں تمیز باقی ہے اور جس میں مساوات حقوق انسانی کا امتیاز نہیں وہ بلاشک وشبہہ غیر مہذب تعبیر کیا جائے تو بیجا نہیں۔ قوم ہندی کا عروج اگر کبھی تھا تو وہ آج اس پستی واد بار میں مبتلا ہے کہ جس کی مثال پردۂ دنیا پر کم نظر آتی ہے۔ بڑے بڑے راجپوت اور پٹھان جاٹ اور مغل جن کی موچھ میں ایک بال سیدھا ہوتا تھا آج وہ تلواروں کی میان خالی ہلاتے بڑے بڑے درباروں میں طوق غلامی گلے میں ڈالے جھک جھک کے سلام کرتے نظر آتے ہیں۔

آزادی فطرت انسانی میں ودیعت کی گئی ہے۔ آزادی انسانی حقوق میں سے ایک ہے۔ آزادی اشرف المخلوقات ہونے کا نشان ہے آزادی بشریت کا جوہر ہے۔ آزادی تہذیب کی جان ہے مگر وہ کون سی آزادی ہے۔ آزادیِ خیال نہیں اقوال وافعال نہیں کہ جو چاہا سو کیا اور جو سمجھ میں نہ آیا تو نہ کیا جس کو چاہا لوٹا مارا اور جس کو چاہا مالا مال کیا کوئی پرسان حال نہ ہو وہ آزادی نہیں بلکہ جان کا جنجال ہو گی نہیں یہ آزادی محض ایک خیال ہے کہ ہم نہ کسی کے زیر حکومت ہیں نہ کسی کے دبے بستے ہیں ورنہ یوں تو آزادی کے ساتھ صدہا قیود اور پابندیاں آتی ہیں۔

فی زمانہ مہذب وہ شخص ہے جو اس آزادی کا مالک ہے جو مہذب سے روبرو ہو کر مصافحہ کر سکے۔ نہ کہ وہ جو جھک جھک کے سلام کو سے اور کورنش بجا لائے واقعی تہذیب یہ ہے کہ کوئی فرد بشر نہ تو اپنے آپ کو کسی سے برتر اور نہ کمتر خیال کرے۔ ہر ایک انسان کو اپنی برابر مانے اور اسکی حتی المقدور امداد کرے۔ گورا ہو یا کالا اور جو اپنی

ابرو نہ کرے اسکو دائرہ تہذیب سے باہر خیال کرے ممکن ہو تو درست کرلے اور غیر ممکن ہو تو منہ نہ لگائے ہر انسان کے حقوق برابر تصور کرلے اور حاکم ومحکوم کی تفریق وتمیز کو محض ایک غیر مہذب امتیاز گردانے۔ تعلیم یافتہ اور ناتعلیم یافتہ مالدار وغریب کی تفریق بھی ایک مہمل بات ہے مگر بشرط ضرورت اسکا تسلیم کرنا بے جا نہیں مگر دنیا میں نہ کوئی کسی کا حاکم اور نہ کوئی محکوم ہے یہی تہذیب کا ایک ادنیٰ مسئلہ ہے جو مثل کسوٹی کے کام دیتا ہے جو شخص اس کسوٹی پر کس نہ دے یا بدرنگ رہے وہ غیر مہذب ہے۔

مہذّب

اسلامی رواداری

یورپ میں جبکہ جھگڑی حق وباطل کی چھڑ گئی
حق خنجر آزمانے پہ مجبور ہو گیا

مسلم سپاہیوں کے ذخیرے ہوئے تمام
روئے امید آنکھ سے مستور ہو گیا

آخر امیر فوج جہازی کے حکم سے
آئین جنگ شہر کا دستور ہو گیا

تھا امتیاز کچھ نہ ہلال وصلیب میں
مقصود فوج خانہ معمور ہو گیا

لیکن فقیہ شہر نے جس دم سنی یہ بات
گرما کے مثل صاعقہ طور ہو گیا

چھوتی نہ تھی یہود ونصاریٰ کا مال فوج
مسلم خدا کے حکم میں مجبور ہو گیا

اقبال اُس ہمیرا می کے میں فدا
ایثار جس کی قوم کا دستور ہو گیا

امت کا جس نبی کی حروف جلی میں نام
قرطاس روزگار پہ مسطور ہو گیا

دنیا میں پیچ وتاب ہے شرط ثمر کہ تاک
کھا کھا کے پیچ صاحب انگور ہو گیا

اقبال (ہمدرد)

بیدل عظیم آبادی

کیا ہوا وہ فارسی کی گرم بازاری کا دور
ہر طرف رونق پہ تھی جب نظم کی چلتی دوکان

جوہر ایسے اہل جوہر کی زباں تد آئیں تھے
زنگ تھا ایران کو، مانتا تھا اصفہاں

شیخ سعدی حضرت خسرو تھے اپنے وقت کے
بلبل شیراز وہ یہ طوطئ ہندوستاں

شاعر دربار اکبر فاضل فیضی لقب
ہم قلم جس کا ابوالفضل اور عرفی ہم زباں

بعد ان دونوں کو وہ فخر عظیم آباد تھا
نام ہے مشہور جسکا بیدل جادو بیاں

ہے پٹن دیبی محلہ آجتک معروف عام
جس سے انکے مسکن و مولد کا ملتا ہے نشاں

اُن کا آبائی نسب تھا خاص تورانی مغل
اک معزز فوج شاہی کا قدیمی خانداں

وجہ سے کوئی ممتاز درجہ رکھتی تھیں اُن کو جس چیز نے قبائل قریش کی عورتوں میں فضیلت و بزرگی کی عام شہرت دے رکھی تھی وہ ان کی خوش خلقی اور نیک کرداری تھی

جب بی بی خدیجہ کا انتقال ہوا تو خولہ نے بی بی عائشہ سے پیغمبر صاحب کا نکاح کرا دیا لیکن چونکہ بی بی عائشہ اس وقت نہایت کم سن یعنی صرف چھ سال کی تھیں اور جناب پیغمبر صاحب کو خانہ داری کے انتظام اور لڑکیوں کی غور پرداخت کے لیے ایک منتظم اور سلیقہ شعار اور مدبر اور معمر عورت کی ضرورت تھی اس لئے اس کے چند ہی روز بعد آپ نے سودہ سے نکاح کیا۔ مورخ ابن اثیر نے اس نکاح کی

فکر نازک شانۂ گیسوئے لیلائے سخن | نکتۂ باریک لاکھوں موشگافیں نہاں
طبع رنگین غازۂ رخسار سلمائے سخن | حسن معنی شاہد الفاظ سے جلوہ کناں
کلیات انکا وہ سطریں جسمیں ہیں نقشے ہزار | جس سے نثر و نظم کے دفتر کا اندازہ عیاں
شاعرانہ وضع درویشانہ خو مرزا منش | رہنے سہنے ملنے جلنے میں خلیق و مہرباں
بے تکلف بے غرض آزاد مستغنی مزاج | نام پر رزاق کے بیفکر رزق آب و ناں
زندہ دل زہد آشنا گوشہ نشیں لٹ گئیں | فقر و محتاجی میں بھی حاجت سے بے پروائیاں
نوکری ہے مستقل کوئی نہ اسباب معاش | بات اتنی تھی کہ حامی تھے سخن کی قدرداں

❖

جب بلا بھیجا دکن نواب آصفجاہ نے | مطلع عذر قناعت لکھ کے اک بھیجا وہاں
اب اودھ ہو یا دکن پنجاب ہو یا ہو بہار | قدرداں ایسے کہاں ہیں باکمال ایسے کہاں

وہ بھی شکل نقش پا ہونگے شفق پیوند خاک
ہیں جو کچھ باقی غبار کاروان رفتگاں

(شفق عماد پوری)

مسلم سپاہیوں کے ذخیرے ہوئے تمام | روئے امید آنکھ سے مستور ہو گیا
آخر امیر فوج حجازی کے حکم سے | آئین جنگ شہر کا دستور ہو گیا
تھا امتیاز کچھ نہ ہلال و صلیب میں | مقصود فوج خانۂ معمور ہو گیا
لیکن فقیہ شہر نے جس دم سنی یہ بات | گرما کے مثل صاعقۂ طور ہو گیا
چھوتی نہ تھی یہود و نصاریٰ کا مال فوج | مسلم خدا کے حکم میں مجبور ہو گیا
اقبال اُس پیمبر امی کے ہیں فدا | ایثار جس کی قوم کا دستور ہو گیا
امت کا جس نبی کی حروف جلی میں نام | قرطاس روزگار پہ مسطور ہو گیا

دنیا میں پیچ و تاب ہے شرط ثمر کہ تاک
کھا کھا کے پیچ صاحب انگور ہو گیا

(اقبال ہمدرد)

اُمّ المومنین سودہؓ رضی اللہ عنہا

از شمس العلما مولوی حافظ نذیر احمد صاحب ایل ایل ڈی

ان کا نام سودہ باپ کا نام زمعہ یہ بھی قریش ہیں اور چونکہ ان کا سلسلۂ نسب عامر بن لوی تک پہنچتا ہے اس سے عامریہ کہلاتی تھیں پیغمبر صاحب کا شجرۂ نسب دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ بی سودہ کا سلسلہ پیغمبر صاحب کی نویں پشت میں عامر بن لوی سے جا ملتا ہے ان کی ماں کا نام شموس تھا اور بیٹی تھیں قیس کی۔ قیس عدی بن النجار کے قبیلے میں سے تھا جو اس زمانہ میں قریش کے برابر تو نہیں مگر قریش کے علاوہ تمام قبائل عرب میں امتیاز کی نظر سے دیکھا جاتا تھا بی بی حضرت خدیجہ کی طرح نہ تو چنداں مالدار ہی تھیں نہ حسن وصورت ہی کی وجہ سے کوئی ممتاز درجہ رکھتی تھیں ان کو جس چیز نے قبائل قریش کی عورتوں میں فضیلت وبزرگی کی عام شہرت دے رکھی تھی وہ ان کی خوش خلقی اور نیک کرداری تھی

جب بی بی خدیجہؓ کا انتقال ہوا تو خولہ نے بی بی عائشہؓ سے پیغمبر صاحب کا نکاح کرا دیا لیکن چونکہ بی بی عائشہؓ اس وقت نہایت کم سن یعنی صرف چھ سال کی تھیں اور جناب پیغمبر صاحب کو خانہ داری کے انتظام اور لڑکیوں کی غور پرداخت کے لئے ایک منتظم اور سلیقہ شعار اور مدبر اور معمر عورت کی ضرورت تھی اس لئے اس کے چند ہی روز بعد آپ نے سودہ سے نکاح کیا۔ مورخ ابن اثیر نے اس نکاح کی

کیفیت اس طرح لکھی ہے کہ پیغمبرؐ صاحب کو بی بی خدیجہؓ کے انتقال سے جو صدمہ اور رنج ہوا قابل بیان نہیں خولہ نے آپ کی یہ حالت دیکھ کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ نکاح کیوں نہیں کر لیتے۔ فرمایا کس سے کروں عرض کیا چاہیں تو کواری سے کریں چاہیں دُلہاجن سے پیغمبرؐ صاحب نے فرمایا کواری کون ہے اور دہاجن کون عرض کیا کواری تو عائشہ ہے آپ کے دوست ابوبکر صدیق کی بیٹی اور دہاجن سودہ زمعہ کی بیٹی پیغمبر صاحب نے فرمایا کہ دونوں سے درخواست کرو۔ خولہ سودہ کے پاس گئیں بولیں تمہیں مبارک ہو خدا نے تمہارے لئے بہتری اور برکت کے سامان مہیا کر دے ہیں۔ بی بی سودہ نے پوچھا کہ وہ کیا! کہا جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے اور اپنے واسطے تمہاری درخواست کی ہے بی بی سودہ بولیں کہ خولہ مجھے یہ پیام بطوع خاطر منظور ہے لیکن میں چاہتی ہوں کہ تم میرے باپ کے پاس جا کر اس کا ذکر کرو۔ خولہ زمعہ کے پاس گئیں اور سودہ سے پیغمبر صاحب کے نکاح کا پیام دیا۔ زمعہ نے کہا خولہ بات تو بہت اچھی ہے مگر تمہاری ہیلی سودہ کی کیا رائے ہے خولہ نے کہا وہ بخوشی منظور کرتی ہیں زمعہ نے کہا تو اچھا سودہ کو میرے پاس بلا لاؤ۔ خولہ ان کو اپنے ساتھ لوا لے گئیں تو زمعہ نے کہا بیٹا سودہ! محمد بن عبداللہ نے تم سے اپنے نکاح کا پیام بھیجا ہے۔ میرے نزدیک تو بات بہت اچھی ہے کیا تم بھی میری رائے سے اتفاق کرتی اور محمد بن عبداللہ سے نکاح کرنے کو پسند کرتی ہو۔ سودہ نے کہا ہاں۔ زمعہ نے کہا خولہ! تم ان کو یہاں بلا لاؤ پیغمبر صاحب تشریف لے گئے اور زمعہ نے بی بی سودہ کا آپ سے

نکاح کردیا ان کا بھائی عبد بن زمعہ حج کو گیا ہوا تھا وہاں سے واپس
آیا تو یہ خبر سُنکر سر پہ خاک اُڑانے لگا لیکن جب مشرف باسلام ہوا تو
افسوس کے ساتھ بار بار کہتا تھا کہ جس روز میں نے یہ خبر سنکر کہ سودہ
کا پیغمبر صاحب سے نکاح ہو گیا سر میں خاک ڈالی تھی میں اس روز بڑا
احمق و جاہل تھا اور درحقیقت میرے سر سے عقل جاتی رہی تھی بی بی
سودہ جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے پیشتر اپنے چچا زاد بھائی
سکران بن عمر کے نکاح میں تھیں سکران اگرچہ ابتدا میں قریش کا ہم آہنگ
تھا اور قریش جو پیغمبر صاحب کا قبیلہ تھا یہی سب سے زیادہ آپ کا دشمن
بھی تھا لیکن خدا کی ہدایت و توفیق سے مسلمان ہو گیا تھا اس کے انتقال
کے بعد پیغمبر صاحب نے سودہؓ سے نکاح کر لیا سکران کا انتقال ہجرت مدینہ
سے تقریباً پانچ برس پہلے ہوا اور سودہؓ کا نکاح پیغمبر صاحب سے ہجرت
مدینہ سے تین برس پہلے۔

جبتک پیغمبر صاحب کے چچا ابوطالب اور بی بی خدیجہؓ زندہ رہے
کفار مکہ پیغمبر صاحب کا تو کچھ کر نہ سکے نو مسلموں کو وقت بے وقت جسمانی
تکلیفیں پہنچا رہے تھے لیکن ان دونوں کا مرنا تھا کہ کفار کی طرف سے
تکلیفوں کا پہاڑ خود پیغمبر صاحب اور آپ کے ساتھیوں پر ٹوٹ پڑا
اور مخالفین کھلم کھلا طرح طرح کی تکلیفیں پہنچانے لگے تاہم پیغمبر صاحب
نہایت استقلال اور صبر و تحمل کے ساتھ دعوت اسلام کرتے رہے جس کا
نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ لوگ پیغمبر صاحب کی باتوں کو کان لگا کر سننے لگے اور
چونکہ آپ کی ساری باتیں مفید اور نتیجہ خیز ہوتی تھیں۔ قریش میں کی
بعض خوش قسمت جماعت اسلام میں داخل ہوتی جاتی تھی۔ بی بی سودہؓ

بھی ان ہی لوگوں سے تھیں اور ازبسکہ ابتدا ہی سے نیک طینت نیک خصلت اور سمجھ دار تھیں اچھی اور سچی باتیں ان کے دل پر فوراً اثر کر جاتی تھیں پیغمبر صاحب کی راستبازی اور حق گوئی کا شہرہ جب ان کے کانوں میں پڑا اور قرآن مجید کی بعض آیتیں سنیں تو پیغمبر صاحب کی صداقت اور قرآن کے منجانب اللہ ہونے کا ان کو پورا یقین ہو گیا ایک دو دفعہ خود بھی پیغمبر صاحب کی مجلس وعظ میں کسی تدبیر سے شریک ہوئیں اور اُن کو اچھی طرح اطمینان ہو گیا کہ بیشک یہ خدا کے برحق نبی ہیں سکران بن عمران کے شوہر اسی پرانے ڈھرے پر چلے جا رہے تھے اور قریش مکے کے ہم آہنگ تھے یعنی جس طرح اور لوگ جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید جھٹلاتے تھے بی بی سودہ اپنے شوہر کی اس جہالت اور بدعقیدتی سے نہایت مجبور اور عاجز تھیں چاہتی تھیں کہ جس طرح بن پڑے اس دار الکفر سے نکلکر پیغمبر صاحب کی پاک صحبت سے مستفید ہونا چاہیے مگر پھر چندروز توقف کیا اور دل کو سمجھایا کہ ابھی اپنا عقیدہ مخفی رکھنا بہتر ہے ممکن ہے کہ جس طرح خدا کی ہدایت نے میری دستگیری کی ہے سکران کی بھی رہنمائی کرے یہ سوچکر نہایت اطمینان اور سکون سے بدستور گھر کے کاروبار میں مصروف رہیں اور کبھی کبھی اپنے شوہر سکران کو اسلام کی ترغیب دلاتی رہیں خدا کا شکر ہے کہ چند ہی روز میں سکران کی طبیعت اسلام کی طرف مائل ہو گئی اور آخرکار دونوں میاں بیوی مشرف باسلام ہوئے۔

جس زمانہ میں بی بی سودہ اور اُن کے شوہر سکران مسلمان ہوئے اُسوقت

نومسلموں پر کفار کی طرف سے طرح طرح کی سختیاں ہو رہی تھیں بات یہ ہے
کہ پیغمبر صاحب نے مبعوث ہوتے ہی خدائی دین یعنی توحید کی منادی
شروع کردی تھی توحید کی منادی میں شرک اور بت پرستی کی توہین
اور مذمت کرنی ہی تھی وہ گرم مزاج لوگ بتوں کی تحقیر اور اپنے بزرگوں
کی تحمیق کی تاب نہ لاکر بھڑوں کی طرح چھتے سے باہر نکل پڑے اور
پیغمبر صاحب کے ساتھ گستاخی بے ادبی اور دشنام دہی اور موقع
پاکر زد و کوب کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا اور نومسلموں کو تو اس قدر
تکلیفیں اور ایذائیں پہنچائیں کہ وہ بیچارے اکتا کر ترک خانماں پر
آمادہ ہو گئے کیونکہ ابھی تک ان میں اتنی قوت نہیں تھی کہ مخالفوں سے
انتقام لے کر فی الجملہ تسکین پاتے۔ پیغمبر صاحب نے اپنے خاندانی
وجاہت کے بھروسے پر جہاں تک ہو سکا ان نومسلموں کی حمایت کی
لیکن نری وجاہت ایسے لوگوں کی عام شورش کے مقابلے میں
کیا کام آئے جو ہر وقت مار پیٹ اور بے حرمتی پر تلے رہتے تھے آخر
پیغمبر صاحب نے ان نومسلموں کی تحفیظ کے لئے ان کو نجاشی بادشاہ
حبشہ کے یہاں چلتا کیا پہلی بار گیارہ مردوں اور چار عورتوں نے
حبشے میں جا پناہ لی اس گروہ میں جناب پیغمبر صاحب کی صاحبزادی
حضرت رقیہؓ اور ان کے شوہر حضرت عثمانؓ اور جناب پیغمبر خدا صلی اللہ
علیہ وسلّم کے پھوپھی زاد بھائی زبیر بن عوام بھی تھے اور وہیں اُن کا
انتقال بھی ہو گیا بی بی سودہ اُن کے انتقال کے بعد پھر مکّہ چلی آئیں
کیونکہ اس وقت مخالفوں کی شورش میں کچھ کمی ہو گئی تھی۔ بی بی سودہؓ
حبشے سے مکّہ میں آئیں تو اپنے قدیم مکان میں فروکش ہوئیں اور ہجرت

کے تین سال پیشتر جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے اِن کا نکاح ہوا کسی تاریخ سے اسبات کا ٹھیک پتہ نہیں لگتا کہ پیغمبر صاحب سے جب ان کا نکاح ہوا ان کی کتنی عمر تھی لیکن اُن کے سنہ وفات اور سن اسلام کے ملانے سے یہ بات مستنبط ہوتی ہے کہ اس وقت ان کی عمر کم وبیش پچاس برس کی تھی الغرض نکاح کے بعد بی بی سودہؓ تین سال تک جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکے میں رہیں پھر ہجرت کر کے مدینہ میں آئیں اور ابوب انصاری کے گھر میں رہیں جہاں جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم فروکش تھے۔ مدینہ میں آکر جب بی بی عائشہ اور ام سلمہ اور صفیہ رضی اللہ عنہ کئی بیبیاں پیغمبر صاحب کے نکاح میں آگئیں تو ام المومنین بی بی سودہ کو خیال ہوا کہ شاید جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم مجکو ضرورت سے زاید سمجھ کر چھوڑ نہ بیٹھیں اور پھر میں پیغمبر صاحب کے شرف ازواج سے محروم رہجاؤں یہ سوچ کر انھوں نے ایک روز جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ جانتے ہیں کہ میں سن رسیدہ اور بڑھیا ہوگئی ہوں میرے قوٰے بالکل ضعیف اور کمزور ہوگئے ہیں اور مجھ میں کسی طرح کی خواہش نام کو باقی نہیں ہی۔ میری منتہائے آرزو یہ ہے کہ آپکے ازواج کے رجسٹر میں میرا نام باقی رہے اور قیامت کے روز ان ہی بیبیوں میں میرا بھی حشر ہو۔ میں اپنی باری اور اپنا حق بطوع خاطر بی بی عائشہ کو دیتی ہوں پیغمبر صاحب نے بی بی سودہ کی اس درخواست کو قبول فرمایا اور اُن کو طلاق نہیں دی۔

جس زمانہ میں پیغمبر صاحب مدینے میں تشریف لائے ہیں مدینہ ایک قصبہ تھا جس

ایک گاؤں تھا اور اس کا نام مدینہ بھی حضرت کا رکھا ہوا ہے ورنہ اس کا
اصلی نام تھا یثرب چنانچہ قرآن میں بھی مدینہ کو یثرب فرمایا ہے۔ یثرب کے
معنی عربی میں ہیں "اجڑے خراب ہو"۔ پیغمبرؐ صاحب کو بُرے ناموں سے
بھی نفرت آپ نے اس کا نام مدینہ رکھا تب سے یہی نام پڑ گیا جس کے
معنی ہیں شہر۔ یثرب کی آب وہوا بھی خراب تھی۔ حمّی یثرب کی تپ مشہور
تھی نام کے ساتھ پیغمبرؐ صاحب کی برکت سے آب وہوا بھی بدل کر درست
ہو گئی۔ یثرب میں بیت الخلا بھی نہ تھے شرفا کی بہو بیٹیاں رفع حاجت
کیلئے جھُٹ پُٹے کا وقت تاک کر گاؤں کے باہر جاتی تھیں اور اس سے تو
پیغمبر صاحب کی ازواج مطہرات بھی مستثنیٰ نہ تھیں گاؤں کے شریر نوجوان
آتی جاتیوں کو چھیڑتے بھی تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ بات بہت
ناگوار تھی اور وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح امہات المومنین کو پردے میں
بیٹھنے کا حکم دیا جائے اس لئے بار بار جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم
سے پردہ کی بابت عرض کیا کرتے تھے مگر پردے کے بارے میں کوئی
وحی تو آئی نہ تھی پیغمبر صاحب اپنی طرف سے کیسے حکم دیدیتے۔

ایک دن کا ذکر کہ بی بی سودہؓ رفع حاجت کے لئے باہر نکلیں شام
کا جھُٹ پٹے کا وقت تھا کچھ تاریکی پھیل چلی تھی ان کے ساتھ ایک
بی بی اور بھی تھیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو پہچان کر کرخت لہجہ
میں کہا سودہؓ! میں نے تمکو دیکھ لیا ہے۔ بی بی سودہؓ خاموشی کے
ساتھ چلی گئیں اور فراغت کے بعد واپس آئیں تو جناب پیغمبر خدا
صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت عمر کی شکایت کی اور کہا کیا ہم اپنی
ضرورت کو بھی باہر نہ نکلا کریں؟ پیغمبر صاحب نے فرمایا کہ میں غور کروں

کو ان کی ضروریات کے لئے باہر نکلنے سے منع نہیں کرتا بی بی سودہ کے
یہاں جناب پیغمبر صاحب صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی اولاد نہیں ہوئی پہلے
شوہر سکران سے ایک بیٹا ہوا جس کا نام عبدالرحمان تھا۔

سودہ کا انتقال ۱۹ھ حضرت عمرؓ کی خلافت کے آخری دور میں مدینہ
ہوا اور وہیں دفن بھی ہوئیں ان کی نظروں میں دنیاوی جاہ و
جلال ذرا بھی وقعت نہیں رکھتا تھا ان کی سیرچشمی اور فیاضی کی بہت
سی مثالیں کتب حدیث سے مستنبط ہوتی ہیں ازانجملہ یہ کہ حضرت عمرؓ نے
اپنے زمانہ خلافت میں ایک مرتبہ ان کے پاس درہموں کی زنبیل بھیجی
انھوں نے یہ سمجھ کر کہ زنبیل میں کھجوریں ہونگی کیونکہ اُس زمانے میں زنبیل
میں کھجوریں ہی بھری جاتی تھیں خادم سے پوچھا کہ کیا کھجوریں ہیں۔
خادم نے عرض کیا نہیں۔ درہم ہیں۔ بی بی سودہ نے کہا کہ کھجوریں
ہوتیں تو کھانے کے کام میں آتیں درہم لے کر کیا کریں۔ چنانچہ
زنبیل بھرے ہوئے درہم فوراً خیرات کر دئے۔

اس نکاح کے وقت حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور سودہؓ
دونوں کی حالت پر نظر کی جائے تو ماننا پڑے گا کہ خلاف تقدس
کوئی امر طرفین کو نکاح کا محرک نہیں ہوا۔ حضرت پیغمبر صاحب صلی اللہ علیہ
وسلم کی تو حالت یہ تھی کہ دعوت اسلام کی وجہ سے اپنے ہی عزیز و قریب
یعنی سارا قبیلہ قریش کنفس واحدۃ مخالفت پر کمربستہ تھے مارنے مرنے پر مستعد

وظلم ذوی القربیٰ اشد مضاضۃ
علی المرء من وقع الحسام المہند

ہوں سے اتنا پتہ ملتا ہے کہ پیغمبر صاحب ابو طالب کے جنازے کے ساتھ بے اختیار زار و قطار روتے تھے
حالت میں نکاح کی کیا سوجھ سکتی تھی [illegible] لڑکیاں چھوڑ مری تھیں محتاج پرداخت اور انکی [illegible]

فسانۂ تنویر

پہلے گھوڑے کو ایک چابک اور پہلے آدمی کو ایک بات ۔ مانا کہ سلطنت ہمارے پاس سے جاکر ٹوٹا سا مکان اور وہ بھی محدود حکومت کا خاتمہ ہوکر پانچ چار انسان اور وہ بھی کمزور رہ گئے مگر مُردہ رگوں میں ہاشمی خون اب تک دوڑ رہا ہے ۔ اور اگر اس ڈھانچ میں جو صرف ہڈیوں کی مالا ہے جوش آگیا تو اچھے اچھے پہلوانوں کے ہوش کھو دے گا ۔ لیکن خدا کی شان ڈیلی کرانیکل کا نامہ نگار ۔ مذہب سے غیر ۔ قوم سے غیر ۔ عقائد سے غیر ۔ ملک سے غیر ۔ شکل وصورت میں جدا ۔ عادت وخصلت میں جدا رنگ وروغن میں جدا ۔ طرز تمدن میں جدا ۔ کھلے بندوں بھرے ہندوستان میں علی الاعلان یہ کہہ جائے کہ اُس سرے سے اس سرے تک کیا ہندو اور کیا مسلمان تمام ہندوستان میں اگر عورت وقعت کی چیز ہے تو صرف گانے ۔ ورنہ جوان ہو یا بڑھیا کھیلنے کی گڑیا اور دلگی کی پڑیا ہے جس کے چہرے پر جبتک چار چلو خون ہے مرد کا دل بہلائے اور روٹی کھائے اور ہم خون کے سے گھونٹ پیکر چپکے ہو جائیں ۔ مگر اپنی ٹانگ کھینیں اور آپ لاجوں مریں ۔ نامہ نگار نے جو کچھ کہا ٹھیک کہا اور خدا اُس

یہ ہے جو کچھ کہتا ٹھیک کہتا تھا نہ تنویر کا ایک ایک حرف سات سمندر پار بسنے والے نامہ نگار کے قول کی تصدیق کر رہا ہے اور گو یہ داستان مسلمان مردوں کے مظالم کا ادنیٰ نمونہ ہے۔ مگر مغرب آنکھیں کھول کر دیکھے کہ یہ پردے کی بیٹھنے والیاں جن کے دامنوں پر حوریں نماز پڑھیں کس طرح اپنی عصمت پر قربان ہوتی ہیں اسلام کی وہ سچی تعلیم جو آج بھی وحشیوں کو انسان بنا دے ان کی گھٹیوں میں پڑی ہوئی ہے اور یہ اس دودھ سے پلی ہیں جس کا ایک قطرہ تمام یورپ کی شرافت کا مول ہے۔

مرحبا سرزمین ہندوستان۔ تیری خاک سے وہ وہ بچیاں پیدا ہوئیں جن کی زندگی ایک عالم کو عورت کے معنی بتا گئی۔ زہے تقدیر مشرقی قبرستانو تمہارے کھنڈر اس دولت سے مالا مال ہیں جس کی مثال دوسری سمت میں نہیں ملتی اور خوشا نصیب ٹوٹی پھوٹی دیوار و دتم میں وہ گوہر نایاب موجود ہیں جن کی آب و تاب اپنا جواب نہیں رکھتی۔ تعجب ہوتا ہے کہ بھونرے میں پلنے والی بیگم جسنے آنکھ کھولکر ناز و نعم کے سوا کچھ نہ دیکھا۔ محبت کے ظلم و ستم اس طرح اٹھائے اور اُف نہ کرے

مسئلہ تقدیر سے انکار نہیں۔ مگر یہ اقرار کرنا پڑے گا کہ تنویر لاکھ بگڑ چکی تھی مگر پھر بیگم تھی۔ جھوٹوں اشارہ کر دیتی تو خریدی پور اور اسکی بیس ہزار آبادی جان لڑا دیتی۔ مگر ان کمبختوں کو تو

مردے پر بھی آنا نصیب ہوا ورنہ وہ اس دل گردے کے
لوگ تھے کہ بات کی بچ پر خون کی ندیاں بہا دیں فرید دل قدر
کی شرافت۔ نجابت۔ حسب نسب جیسی بھی تھی خوب اور بہت خوب
تھی مگر افسوس اس سیدانی کا لال ہو کر جس کی چوکھٹ پر بڑے
بڑے پرہیزگاروں نے پیشانیاں رگڑیں ایسا بدبخت نکلا کہ سادات
کی ناک جڑ سے کاٹ دی۔ اور جس تنویر کی پالکی اتروانے کا
یہ ارمان تھا کہ پورے چھ سال سیدوں نے ناکیں رگڑی
اس کی وہ مٹی پلید ہوئی کہ الامان الحفیظ۔ مگر رعونت ازلی رفیق
خوشامدی قدیمی شفیق۔ مفت کی دولت لگی ہاتھ اچکوں کا ہوا
ساتھ جو کچھ ہوتا کم تھا۔ بہرحال مدتیں ہوئیں یا برسوں گذرے
یہ تو آج بھی کہنا پڑے گا کہ تنویر تمام خاندان کی لاج رکھ گئی
اور امید ہے کہ جس طرح وہ دنیا سے ترستی پھڑکتی اٹھی عاقبت
میں اسے راحت ابدی نصیب ہو گی

گو دور عزیزی کی دیکھنے والی آنکھیں ایک ساٹھ ستر ہی برس کے الٹ
پھیر میں ہمیشہ کو بند ہو گئیں مگر بنارس کے مقبرے دلی کے کھنڈر۔ اکبرآباد
کی مسجد تنویر جہاں کے باپ نواب عزیز الدین خان کی یاد اب تک تازہ
کر رہے ہیں غدر سنہ ۵۷ء کے بعد جب وہ وہ خاندان جن کے دروازے پر
ہاتھی جھولتے تھے دو دو دانوں کو محتاج ہو گئے تو گو سلطنت عباسیہ
کا یہ آخری تاجدار بھی تاراج ہو گیا مگر ریاست کا چراغ ٹمٹما رہا تھا اور

اس گئے گذرے زمانے میں بھی اس کی حکومت کا ڈنکا تین ساڑھے تین سو کوس تک بجتا تھا چار برس کے قریب ششم ہشتم گذر گئے مگر ۶۱ھ کے بعد ضعیفی و انحطاط نے عزیز کو اس قابل نہ رکھا کہ وہ ان تعلقات میں پھنسا رہتا۔ ولیعہد ریاست یا وارث جائز لے دے کر جو کچھ تھی تنویر گو بعض نے مخالفت کی مگر عزیز یہ سوچ کر کہ جیتے جی اور مرے پیچھے یہ ہی ریاست کی مالک ہے کنارہ کش ہو کر گوشہ نشین ہو گیا۔

جشن تنویری

چاہیے کہ تنویر ریاست کی مالک بنتے ہی کھل کھیلتی اور کوار پنے کی قید۔ ماں باپ کی سختی۔ عزیز و اقارب کی نگہداشت سب سے آزاد ہوتے ہی رنگ لے آتی۔ مگر اس کا دل تو کچھ ایسا مرا تھا کہ کوئی امنگ پیدا ہی نہ ہوتی حتیٰ کہ جشن نوروز بھی اگر اس کا بس چلتا تو کورا ہی ٹال دیتی مگر کچھ رشتہ داروں کے طعنے کچھ کارکنوں کی صلاح اور سب سے بڑھ کر باپ کا اصرار چار و ناچار جشن منانا پڑا

اس جشن کے حالات میں ابو النعیم اس زمانہ کا مشہور مورخ اس طرح لکھتا ہے۔

جشن تنویری اس دھوم دھام سے منا کہ تنویر کا نام ہو گیا۔ آدھی رات کے قریب جب قصر تنویر روشنی سے جگمگا رہا تھا چاروں طرف سے ملکہ شاد باش کے نعرے لگ رہے تھے۔ تنویر سادہ لباس میں جلوہ

افروز ہوئی یہ پہلا اتفاق تھا کہ خلقت نے بے نقاب دیکھا دھانی
لباس زیب تن تھا اور سیاہ بال کمر تک لہرا رہے تھے زیور مطلق
نہ تھا صرف دو ہیرے سرگوشیاں اور ایک الماس کی انگشتری غضب
کو دوبالا کر رہی تھی۔ پندرھواں سال ختم تھا اور نگارستان حسن
کی کوئی ادا ایسی نہ تھی جو اُس کے پاؤں میں نہ لوٹ رہی ہو۔ شباب
کا سن مرادوں کے دن۔ بھولی صورت گوری رنگت۔ حسن کی کان
ملاحت کی جان۔ نزاکت کا مخزن ملاحت کا معدن تیغ بر قدرت کا کرشمہ
اور صنعت کا نمونہ تھی۔ آئی اور اس انداز سے آئی کہ سینکڑوں دل
پچھلے چلی اور اس رفتار سے چلی کہ ارکین دربار کلیجہ مسوس کر رہ گئے۔
بیٹھی اور اس شان سے بیٹھی کہ بڑے بڑوں کے ایمان ڈانواں
ڈول ہو گئے۔ چشم سیاہ ایک جادو تھی کہ جدھر اُٹھی قیامت اور
نگہ ناز ایک تیر تھا کہ جدھر پڑا آفت۔ اہلکار و خدام آداب شاہی
میں رہے مگر حقیقی چچا زاد بھائی ثریا قدر پر ایسی بجلی گری کہ خاک
سیاہ کر دیا نذر دکھانے کو دکھا دی مگر پاؤں لڑکھڑا رہے تھے
چہرہ کا رنگ فق۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے۔ زبان بند دیوانوں کی
حالت۔ سودائیوں کی کیفیت گرتا پڑتا اُٹھا نذر دکھائی اور بیٹھ گیا
تو بر یہ صحیح کہ کمسن بھولی ناواقف ناتجربہ کار سب ہی کچھ تھی مگر صورت
دیکھتے ہی تاڑ گئی کہ ثریا ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ مرے کو مارے
شاہ مدار ظالم اچھی طرح سمجھ بوجھ کر کہ یہ تیر کلیجہ کے پار پہنچا پاس

آئی اور کچھ اس طرح مزاج پوچھا کہ رہا سہا صبر و قرار لوٹ مار چلتی
ہوئی دربار ختم ہوا مگر اسکی یادگار ثریا کے کلیجہ پر ایسا داغ بیٹھا کہ چار
ہی دن میں برسوں کا بیمار معلوم ہونے لگا۔ دیوانہ وار پھرتا اور تنویر
کی صورت نظر نہ آتی۔ بیقرار رہتا اور اس تک رسائی نہ ہوتی وہ تھا
اور قصر تنویری کے چکر۔ ہر چند کوشش کرتا کہ اس خیال کو دل سے بھلادے
مگر ایک ہوک تھی کہ رہ رہ کر اٹھتی۔ دن کی بھوک رات کی نیند سب غارت
ہوئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ کھانا پینا ختم اور ہنسنا بولنا حرام ہو گیا
تنویر کے رئیس ہونے میں کلام نہیں۔ مگر ثریا بھی کسی کا غلام نہ تھا وہ
بڑے باپ کی بیٹی تھی تو یہ چھوٹے باپ کا بیٹا۔ ایک ہڈی ایک خون
ایک گوشت۔ ایک پوست چرچا تو سارے شہر ہی میں ہو رہا تھا۔ ثریا کا
باپ۔ لڑکے کا دیکھا یہ رنگ کان میں پہنچے وہ ڈھنگ غریب دنگ
رہ گیا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ مشورہ نہ صلاح چپکا اٹھ بھائی کے ہاں جا نکاح
کا پیغام دے دیا

تنویر جو کچھ بھی تھی جدا نہ تھی اور ثریا جیسا کچھ بھی تھا ایسا گیا گذرا نہ تھا
کہ عزیز نکاح کے نام سے آگ بگولا ہو جاتا وہ الٹی سیدھی سنائیں کہ
غریب اپنا سا منہ لے سیدھا اٹھ چپکا چلا آیا!

نکاح

عزیز الدین خان بارہ مہینے کا بیمار سدا کا روگی نکاح کا پیام اونگھتے

کو ٹھیلنے کا بہانہ ہو گیا۔ بخار کھانسی نزلہ زکام اور سو مرضوں کا مرض بڑھا پایہ سب کچھ تو پہلے ہی سے تھا اختلاج قلب اور بڑھ گیا حکیموں نے تبدیل آب وہوا کی صلاح دی اور دونو باپ بیٹیاں چندروز کے واسطے دریا پار موضع حسینپور چلے گئے۔

حسینپور والے تنویر جہاں کے رعیت نہ تھے مگر اس کی آؤ بھگت میں کمی نہ کی جی کھولکر دعوتیں کیں اور پیٹ بھر کر روپیہ لٹائے۔

ایک روز شام کے وقت جب تنویر بھی باپ کے پاس بیٹھی تھی فریدوں قدر ایک کروڑپتی تاجر کا لڑکا جو خود بھی مشہور وکیل تھا ملنے آیا ہر چند باپ نے اس کی وجاہت ثروت اور عزت کا خصوصیت سے ذکر کیا مگر تنویر گو نقاب ڈالے ہوئے تھی مطلق متوجہ نہ ہوئی۔ فریدوں قدر کو تنویر کی تمکنت ناگوار تو بہت معلوم ہوئی اور ہونی چاہئے بھی تھی مگر پھر بھی اس نے یہ سلسلہ قایم رکھا کہ دوسرے تیسرے جب فرصت ہوتی آتا تھوڑی دیر بیٹھتا اور چلا جاتا

دو یا ڈھائی مہینے اس طرح گذرے ہوں گے کہ عزیز کی بیماری نے ایک نئی کروٹ لی جس کا انجام موت ہوا اور جس نے تنویر کو ہمیشہ کے واسطے باپ سے جدا کر دیا۔ عزیز کو مرے دو سرا روز تھا کہ تنویر کے پاس یہ خط پہنچا

بیگم خدا آپ کی عمر دراز کرے

نواب صاحب مرحوم کی موت آپ کو جس قدر صدمہ ہو کم ہے مگر دنیا کا دستور

یہ ہی رہا ہے اور رہے گا پھر بھی خدا کا شکر کیجیے کہ آپ کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں۔ دولت۔ حکومت۔ صورت۔ عزت آسائش کا تمام سامان موجود اور مجھ جیسے کفش بردار خدمت کو حاضر یہ تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ کی تمام ریاست میرے پاس اٹھارہ لاکھ میں رہن ہے جس کی میعاد پوری ہو چکی اور اسی لئے مرحوم نے میری درخواست منظور کر لی تھی کہ مجھے اپنی غلامی میں لے لیں۔

بیگم آپ قرضہ کا خیال مطلق نہ فرمائیے روپیہ بھی آپ کا ریاست بھی آپکی میں تو ایک خادم ہوں جو تادم حیات حق نمک ادا کرتا رہوں گا۔

فریدوں قدر

اس خط کے دیکھتے ہی تنویر کے چھکے چھوٹ گئے کا غذات پر غور کرتی تھی تو کہیں رہن کا بیان تک نہیں۔ باپ پر خیال کرتی تھی تو کبھی اشارۃً کنایۃً ذکر تک نہ کیا۔ بہتیرا سوچتی تھی مگر قیاس کام نہیں کرتا تھا کہ اس علت کی اصلیت ہے کیا۔ فریدوں قدر زمانہ کا چلتا ہوا گھاگ اس نے وہ جال بچھایا کہ تنویر سر نہ اٹھا سکے بڑی بڑی کٹنیاں جو اپنے فن میں طاق اور کام میں لاجواب بنیں ماماؤں اور نوکروں کے بھیس میں چھوڑ دیں جن کی چکنی چپڑی باتوں نے تنویر کو شیشے میں اتار لیا اب قرض کے یقین کرنے میں کیا تامل تھا اور یقین کا نتیجہ رضامندی نکاح ظاہر تھا دھوم دھام سے ہوا یا چپ چپاتے مختصر یہ کہ تنویر جہاں بیگم فریدوں قدر کے نکاح میں پہنچ گئیں۔

اور نکاح کے بعد سب سے پہلا کام اُس دستاویز کی تکمیل تھی جس میں یہ وعدہ تھا کہ اٹھارہ لاکھ روپیہ جو میرے ذمے واجب الادا ہے بتدریج ادا کرتی رہونگی۔

فریب

جس دغا بازی اور عیاری چالبازی اور مکاری سے فریدوں قدر نے ایک بھولی بھالی عورت کی آزادی سلب کی ہے وہ تمام فریدوں پور کے واسطے مرجانے کا مقام ہے بے ایمانی کا تو علاج نہیں مگر سچ یہ ہے کہ آج بھی کہ پشتیں گذر گیئں اسُی کی معافی اور گذارے کی بدولت اور اسُی کی جوتیوں کا صدقہ گھر بیٹھے راج کر رہے ہیں

افسوس یہ ہے کہ نکاح کے بعد تنویر کو پھر گھر جانا نصیب نہ ہوا بھتیرا تڑپڑائی۔ ہر چند لوٹی پٹی مگر پھنسی ایسے ظالم کے جال اور مکار کے پھندے میں تھی کہ پورے پانچ سال متواتر رنج والم کے پہاڑ ٹوٹے اور دم بھر کو رہائی میسر نہیں ہوئی۔ بدبخت فریدوں خدا جانے کس سخت دل کا انسان تھا کہ نکاح کے دوسرے ہی روز قیدیوں کی طرح گھر میں ڈال تمام مال و جائداد پر قابض ہو گیا

تنویر اب بنی بچونکی ماتھی مگر کیسی ما جسکو اپنی آمدنی کی خبر نہ شوہر کی کمائی سے واسطہ۔ نہ کسی معاملہ میں دخل دینے کا حکم نہ کسی بات میں بول سکنے کی مجال۔ گھر کا تمام انتظام روپیہ پیسہ کا حساب کتاب فریدوں کے ہاتھ میں تھا۔ مہربان ہوا بیوی سے بات کرلی ورنہ رات کو گیارہ بجے آنا اور سو رہنا۔ اللہ اللہ جس بیگم کے آگے ایک چھوڑ پانچ پانچ

یہ ہی رہا ہے اور رہے گا پھر بھی خدا کا شکر کیجئے کہ آپ کے پاس
کسی چیز کی کمی نہیں۔ دولت۔ حکومت۔ صورت۔ عزت آسائش کا تمام سامان
موجود اور مجھ جیسے کفش بردار خدمت کو حاضر۔ یہ تو آپ کو معلوم ہوگا
کہ آپ کی تمام ریاست میرے پاس اٹھارہ لاکھ میں رہن ہے جس کی میعاد
پوری ہو چکی اور اسی لئے مرحوم نے میری درخواست منظور کرلی تھی کہ مجھے
اپنی غلامی میں لے لیں۔
بیگم آپ قرضہ کا خیال مطلق نہ فرمائے روپیہ بھی آپ کا ریاست بھی آپکی
میں تو ایک خادم ہوں جو تادم حیات حق نمک ادا کرتا رہوں گا۔

فریدوں قدر

اس خط کے دیکھتے ہی تنویر کے چھکے چھوٹ گئے کا غذات پر غور کرتی
تھی تو کہیں رہن کا بیان تک نہیں۔ باپ پر خیال کرتی تھی تو کبھی اشارۃً
کنایۃً ذکر تک نہ کیا۔ بہتیرا سوچتی تھی مگر قیاس کام نہیں کرتا تھا کہ اس
علت کی اصلیت ہے کیا۔ فریدوں قدر زمانہ کا چلتا ہوا گھاگ اس نے وہ
جال بچھایا کہ تنویر سر نہ اٹھا سکے بڑی بڑی کٹنیاں جو اپنے فن میں
طاق اور کام میں لاجواب تھیں ماماؤں اور نوکروں کے بھیس میں چھوڑ دیں
جن کی چکنی چپڑی باتوں نے تنویر کو شیشے میں اتار لیا اب قرض کے
یقین کرنے میں کیا تامل تھا اور یقین کا نتیجہ رضامندی نکاح ظاہر تھا دھوم
دھام سے ہوا یا چپ چپاتے مختصر یہ کہ تنویر جہاں بیگم فریدوں قدر
کے نکاح میں پہنچ گئیں۔

اور نکاح کے بعد سب سے پہلا کام اُس دستاویز کی تکمیل تھی جس میں یہ وعدہ تھا کہ اٹھارہ لاکھ روپیہ جو میرے ذمّے واجب الادا ہے بتدریج ادا کرتی رہونگی۔

فریب

جس دغابازی اور عیاری چالبازی اور مکاری سے فریدوں قدر نے ایک بھولی بھالی عورت کی آزادی سلب کی ہے وہ تمام فریدوں پور کے واسطے مرجانے کا مقام ہے بے ایمانی کا تو علاج نہیں مگر سچ یہ ہے کہ آج بھی کہ پشتیں گذر گئیں اسی کی معافی اور گذارے کی بدولت اور اسی کی جوتیوں کا صدقہ گھر بیٹھے راج کر رہے ہیں

افسوس یہ ہے کہ نکاح کے بعد تنویر کو پھر گھر جانا نصیب نہ ہوا بھنبر اتر پڑا ئی۔ ہر چند لوٹی پیٹی مگر پھنسی ایسے ظالم کے جال اور مکار کے پھندے میں تھی کہ پورے پانچ سال متواتر رنج والم کے پہاڑ ٹوٹے اور دم بھر کو رہائی میسر نہیں ہوئی۔ بدبخت فریدوں خدا جانے کس سخت دل کا انسان تھا کہ نکاح کے دوسرے ہی روز قیدیوں کی طرح گھر میں ڈال تمام مال و جائداد پر قابض ہوگیا

تنویر اب تین بچوں کی ماں تھی مگر کیسی ماں جسکو اپنی آمدنی کی خبر نہ شوہر کی کمائی سے واسطہ۔ نہ کسی معاملہ میں دخل دینے کا حکم نہ کسی بات میں بول سکنے کی مجال۔ گھر کا تمام انتظام روپیہ پیسہ کا حساب کتاب فریدوں کے ہاتھ میں تھا۔ مہربان ہوا بیوی سے بات کرلی ورنہ رات کو گیارہ بجے آنا اور سو رہنا۔ اللہ اللہ جس بیگم کے آگے ایک چھوڑ پانچ پانچ

چھ چھ مامائیں آنکھیں بچھاتی تھیں۔ اب اسکی یہ گت بنی کہ عالی شان محل سرا میں بچوں کو لئے اکیلی پڑی رہتی اور کوئی بات تک کرنے والا نہ تھا جن ہاتھوں نے روپے اور اشرفیاں لٹائیں اب وہ ایک ایک کوڑی کو محتاج تھے۔ مردہ دل تو پہلے ہی تھی ادھر ماں باپ اُدھر آئی مصیبت۔ سمند ناز پہ تازیانہ دو صاحبزادوں کا تشریف لانا جن کے حسن کی دُور دور دھاک تھی چار ہی دن میں خاک میں مل گئی فریدوں ڈھونڈتا تھا چٹک مٹک۔ تنویر ماں باپ کی بیٹی بیوی بی بچوں کی پال نے سارا جوبن گھال دیا۔ میاں کی بے اعتنائی نے مزاج میں ایسی لاپروائی کردی کہ آٹھ آٹھ دن سر گوندھنا قسم ہوجاتا جس جسم پر کبھی چکن اور بنارسی گلبدن پھٹا پڑتا تھا اب اسپر چلٹ تیل کرتے اور میلے چکیلے دوپٹے تھے ایک قیامت خیز مصیبت یہ تھی کہ فریدوں کی پھوپھی زاد بہن بچپن کی منگنی صورت شکل کی اچھی چٹاخ پٹاخ اب تک کنواری بیٹھی تھی اور ماں باپ اس فکر میں تھے کہ کسی طرح فریدوں کے سر چیپکیں انکار تو فریدوں کو بھی نہ تھا مگر مطلب یہ تھا کہ ہلدی لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آجائے ان بیچاروں کو کیا عذر تھا نتیجہ یہ کہ میاں فریدوں فدر دوسرا نکاح کرکے داخل ثواب ہوگئے اس نکاح کی بڑی شرط تنویر جہاں کی طلاق تھی اور سنگدل فریدوں منتظر تھا اسوقت کا کہ مظلوم تنویر پر کوئی الزام لگاکر نکال باہر کرے۔

محبت کے ایام ابتدائی کی ہمراز ایک ہیرے کی انگوٹھی تھی جو دلہن کی طرف سے دولھا کو پیش کی گئی اور اب کہ تنویر ہر طرف سے مایوس

تھی وہ اسی کو غنیمت سمجھ رہی تھی کہ اسکی نشانی دزیدوں کے ہاتھ میں رہے مگر جب اتنی آس بھی نہ رہی اور ظالم نے وہ انگوٹھی نئی دلہن کو چڑھادی تو تنویر کی رہی سہی امیدوں کا خاتمہ ہوگیا

طلاق

جشن تنویری میں ثریا کے دل پر جو چرکا لگا تھا وہ ایسا نہ تھا کہ آسانی سے بھر جاتا عزیز نے جواب دیا تنویر کی شادی ہوگئی مگر جو صورت ایک دفعہ آنکھ میں کھُب گئی وہ کسی طرح نہ بھولی۔ پہاڑ سی راتیں اُن جنگلوں میں ختم ہوئیں جن میں دن دہاڑے جانے آدمی کا پتہ پھٹتا تارے اُس کے سامنے کھلتے چاند اسکے سر پر دمکتا ہوا اسکی گود میں لوٹتے بیتے اس کے اوپر گرتے مگر کائنات میں کوئی شے ایسی نہ تھی کہ اس کا غم غلط کرتی۔ کامل پانچ سال اسی طرح خدائی خوار خاک چھانتا اور بیرمنیا پھرا امید کا ہر شائبہ مفقود ہوچکا تھا مگر منزل مقصود اس کے سامنے تھی اور وحشت دل شہر بشہر اور گلی گلی پھرا رہی تھی۔ ببول کے زرد پھول اور گلاب کی سُرخ پنکھڑیاں۔ فاختہ کی کوکو بلبل کا نالہ کوئی چیز ایسی نہ تھی جو تنویر کی یاد تازہ نہ کرتی ہو ایک روز کہ آفتاب غروب ہونیوالا تھا ثریا اُس سرزمین پر پہنچا جو حسینپور کے نام سے موسوم تھی اس کوچہ میں جانکلا جہاں وہ بھولی صورت بستی تھی اور اُس بارہ دری کے نیچے کھڑا ہوا جس کے اوپر تنویر جہاں کھڑی شفق کو دیکھ رہی تھی تنویر و ثریا کا چار آنکھیں ہونا کیسا نازک وقت ہوگا۔ آنکھ کے سامنے تھی وہ صورت جس کا مشتاق دیدار ثریا کو چاروں طرف دیوانہ وار لئے

پھرتا تھا۔ ڈورئے کا مبلہ کرتا گلے میں اور ململ کا پیازی دوپٹہ سر سے ڈھلک کر کاندھے پر مگر اس حالت میں بھی تنویر حسن کا ایک کرشمہ تھی۔ محبت کا تاج اسکے سر پر لہلہا رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا پریشاں بالوں کو چھیڑتی ہوئی کہہ رہی تھی

نہیں حسن کی اس طرح بھی کمی
کھڑی سے بگڑی تو گویا بنی

چشم شرمگیں اس وقت بھی جھکی اور قریب تھا کہ اوجھل ہوجائے مگر دل نے صدا دی دیوانی جو صورت فریدوں کے ہاتھوں برباد ہوئی یہ اسی کا دیوانہ ہے۔ پانچ برس کی ترسی ہوئی آنکھیں سیراب ہو رہی ہیں ان پر رحم کر اور کرم سے کام لے مگر نگہ ناز اپنا کام کر چکی تھی ثریا کو زیادہ دیر احسان نہ اٹھانا پڑا۔ اتنا زبان سے ضرور نکلا ہائے تنویر جہاں۔ اور غش کھاکر گر پڑی کچھ نہ سہی عنایت محبت۔ مروت۔ یگانگت تقاضا انسانیت بھی تھا نہ تھا حقیقی چچازاد بھائی کوئی غیر نہیں۔ بچپن کے ساتھ کھیلے کچھ پیر نہیں۔ ایک کا گھر ایک کو پردیس ایک ہشیار ایک بیہوش مٹرک کا معاملہ۔ بازار کی بات اندھیرا گھپ۔ سر پر آدھی رات کیسی خاطر اور کس کی مدارات تنویر کے پہلو میں بھی دل تھا پتھر نہ تھا جشن تنویری کا خیال۔ ثریا کا استقلال دونو تصویریں آنکھ کے سامنے تھیں۔ ایام گذشتہ کی یاد نے نازک کلیجہ پر نشتر برسا دئے اور جذبۂ عشق دروازے تک لے آیا گھبرا کر پاس آئی اٹھوا کر اندر لائی اور اب وہ وقت آگیا کہ تنویر کی آنکھیں ثریا کی حالت پر آنسو گرا رہی تھیں اور نازک ہاتھ گلاب کے چھینٹے دے رہے تھے۔ تنویر کی کوشش

قانون قدرت یا ثمرۂ محبت جو کچھ بھی تھا ثریا نے آنکھ کھولی اور دیکھا کہ جس آنکھ کا شیدا ہے اس میں محبت نے کوٹ کوٹ کر موتی بھر دئے ہیں۔ مہماں کی تواضع۔ بھائی کی خاطر۔ سچی محبت کا شکریہ جو چاہے سمجھ لو تنویر پاس سے ہٹ کر اس طرح بولی

کیسا مزاج ہے کدھر آنکلے؟

(ثریا) زندگی عذاب اور حالت اسکا جواب ہے

(تنویر) منہ ہاتھ دھوئیے۔ کچھ کھانا کھائیے

(ثریا) بیگم! فریدوں پور تم سے ہمیشہ کو چھوٹ گیا! حسینور کی آب وہوا نے تمکو کیا سے کیا بنا دیا یقین کرو کہ فریدوں پور کا ایک ایک ذرہ تمہارے دیکھنے کا مشتاق اور تمام خاندان تمہاری جدائی پر رو رہا ہے۔ اگر تم اجازت دو تو میں نواب فریدوں قدر سے درخواست کروں۔

بہت مشکل ہے یہ کہنا کہ تنویر اس کا کیا جواب دیتی ابھی ثریا کا فقرہ ختم ہوا تھا کہ فریدوں یہ کہتا ہوا اندر گھسا میں نے آپ کی بیگم کو کبھی نہیں روکا شوق سے لیجائیے اتنا کہا اور اسباب بندھوا صبح کے وقت ثریا اور تنویر دونوکو حسینور سے رخصت کیا گاڑی نالہ سے پار ہوئی کہ سانڈنی سوار لپکا ہوا آیا اور تنویر جہاں بیگم کو ایک لفافہ دیا جس میں طلاق نامہ رکھا تھا۔

تنویر نکاح میں تھی تو کیا پتھر پڑ رہے تھے کہ طلاق ہو کر مصیبت ٹوٹیگی مگر عمر بھر کی کمائی وہ تین لال تھے جو فریدوں نے زبردستی رکھ لئے اور جن کا خیال اسوقت بدنصیب تنویر کو آٹھ آٹھ آنسو رُلا رہا تھا

وسط ہند کے مشہور پہاڑ ارتیلیشا کے لق ودق میدا یمن دریائے حسن کے

کنارے ایک خوبصورت بارہ دری کے پائیں باغ نے کوسوں ہوا کو معطر کر رکھا ہے۔ طائران خوش الحان چہک چہک کر قدرت کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ صبح صادق کا سہانا وقت ہے اور باد صبا پھولوں سے چھیڑ چھاڑ کرتی پھر رہی ہے۔ صاف شفاف پانی کوسوں بہتا چلا جا رہا ہے۔ آبشار گر رہے ہیں اور کوئل نے پہاڑ سر پر اٹھا رکھا ہے ایک نواڑی پلنگڑی پر ثریا قدر لیٹا ہے اور گھاس کے سرسبز قطعہ پر تنویر ٹکٹکی لگائے بیٹھی ہے آنکھ سے زار قطار آنسو کی لڑیاں بہہ رہی ہیں اور اس طرح التجا کر رہی ہے۔

تم نے مجھے دھوکہ دیا اور میرے کلیجہ کے ٹکڑے ہمیشہ کو چھٹوا دئے کمینہ میں میری ناک کٹی دنیا میں میری خاک اڑی خدا کا واسطہ ہے مجھے چھوڑ دو میں تم سے اور تمہاری محبت سے باز آئی جس نے مجھے برباد کیا اسی کی ہوں وہ جانے اس کا خدا جانے مگر تم ایک ایسی عورت کو جو غیر کی ملکیت اور تمہارے پاس امانت تھی فریدوں پور کے نام سے اس جنگل میں لائے اور الفت میں دھوکا دے کر وہ ستم کیا کہ قیامت تک محبت کا ہر ذرہ تم پر لعنت برسائے گا۔

ثریا جو شخص تمہارے واسطے انسان سے جانور۔ زندہ سے مردہ اور صورت سے بے صورت ہوا جو اس چاند سی صورت کا دیوانہ ہے وہ بہانہ کرے گا؟ تنویر رحم۔ یہ اخبار آج ہی کا ہے اسکو پڑھو اور بتاؤ کہ فریدوں کی یاد کہاں تک درست ہے۔

یہ نواب فریدوں قدر کی بیوی تنویر جہاں بیگم ثریا قدر کے ساتھ تین بچے چھوڑ کر بھاگ گئیں اور اس وجہ سے ان کو طلاق ملی۔

تنویرا اور ثریا دونو عاشق ومعشوق روپوش ہیں"۔
تنویر۔ شاید تقدیر مجھے اس سے بھی زیادہ بڑا وقت دکھائے مگر جب تک دم میں دم اور جان میں جان ہے۔ مرے ہوئے باپ دادا کی آن میں فرق نہ آئے گا میں ایسی ایسی چیزوں کا یقین نہیں کرتی۔

یہ کہکر تنویرا اُٹھ کھڑی ہوئی دل قابو میں نہ تھا اور آنسو ابھی تک جاری تھے چشمہ کے کنارے پر پہنچی گلاب کے پھول جھک جھک کر پانی کو چوم رہے تھے اور ہوا چاروں طرف اٹھکھیلیاں کرتی پھرتی تھی۔ ٹھٹکی کچھ سوچا اور دفعتاً اسکا چہرہ جس پر رنج وحسرت کی گھٹائیں برس رہی تھیں خوشی سے بدل گیا وہ ہنستی ہوئی بولی اور ثریا قدر سے کہنے لگی۔

اب تک میری ضد محض تمہاری آزمایش تھی میں محبت کی قدر تم سے زیادہ جانتی ہوں اور اگر یہ نہ ہوتا تو آج فریدوں قدر میرے پاؤں دھو دھو کر پیتا۔ جتنی تنویری میں تمہاری نگاہ مجھ سے وہ عہد لے گئی جس کو میں نے جنبور میں پورا کیا اور اب تمہارے سامنے سرخرو کھڑی ہوں آدمی کو حکم دو کہ پانی تیار کرے اور تم جس قدر جلد ممکن ہو میرے کپڑوں کا انتظام کرو۔

تنویر کی یہ گفتگو قوت کیمیائی یا کرشمہ مسیحائی تھا کہ مردہ اُچھل کر اُٹھ بیٹھا اور انتظام میں مصروف ہوا۔ فوراً مقفل دروازے کھول دئے گئے۔

شام ہو چکی تھی پھول کھل چلے تھے اور محلسرا کی روشنی -

رات کو دن بنا رہی تھی۔

تنویر جہاں نہا دھو کر اس وقت کے واسطے تیار ہو چکی تھی جو ثریا کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ آج اس کا حسن قمر چہار دہم کو جو سر پر تھا شرمندہ کر رہا تھا بال پریشان جمع ہو کر ثریا کے جگر پر برچھیاں مار رہے تھے دفعتہً تنویر ایک مستانہ چال سے ٹہلتی ہوئی آئی اور ثریا سے یہ کہکر میں باہوں کے واسطے تھوڑے سے پھول توڑ لاؤں چمن میں آئی محافظ مطمئن ہو چکے تھے۔ ثریا کے سر پر عشق کا جن سوار تھا باغ کے دروازے کھل چکے تھے چمن میں پہنچنے کے بعد تنویر کا پتہ نہ چلا کہ آسمان کھا گیا یا زمین چاروں طرف ادھر ادھر لوگ دوڑ پڑے۔ کونہ کونہ اور چپا چپا ڈھونڈ مارا مگر تنویر کا پتہ نہ چلنا تھا نہ چلا

جب ثریا کی شب عشرت اسی طرح مصیبت سے بدل گئی اور تنویر کے غائب ہونے نے اسکی تمام امیدوں کا خاتمہ کر دیا تو اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ سر پر خاک اڑاتا حسینور روانہ ہوا

فراق ابدی

ارتینیا کے لق و دق میدانوں اور سنسان جنگلوں میں اندھیری رات تنویر کے سر پر تھی اور یہ چوتھی کی دلہن جس کے پاؤں میں ہوا سر سرا۔ سر سرا کر لوٹ رہی تھی منہ اٹھائے چلی جاتی تھی۔ نازک دل دھکڑ دھکڑ اور کلیجہ بلیوں اچھل رہا تھا۔ رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی اور شبنم کے قطرے اسکے نازک رخسار کے بوسے لے رہے

تھے فرش مخمل پر تکلف کر نیوالے پاؤں ببول کے کانٹوں پر پڑ رہے تھے۔ شیروں کی دہاڑ۔ ہاتھیوں کی چنگھاڑ۔ اژدھوں کی پھنکار کانوں کے پار ہو رہی تھی۔ بندر اور لنگور برابر سے نکل رہے تھے اور راہ و لادکی ترستی خانماں برباد بیگم اپنی دھن میں مست چلی جا رہی تھی۔ بالآخر شب سیاہ نے آسمان کو کروٹ دی اور تارے جھلملانے شروع ہوئے۔ پو پھٹی۔ طائران خوش الحان شہسوار مشرق کے استقبال کو باہر آئے اور تنویر نے تھوڑے فاصلہ پر آگ روشن دیکھی۔ بدن چور چور ٹانگیں شل۔ کمر خم اور پاؤں لہو لہان تھے اسی سمت روانہ ہوئی قریب پہنچی ایک گاؤں دیکھا اور قصبہ کے رئیس کے ہاں نوکر ہو کر رہنے سہنے لگی۔ ایک روز صبح کے وقت جب آدمی نے لا کر ڈاک دی اور تنویر اپنے آقا کے پاس لیکر چلی اس نے سب سے اوپر فریدوں کا خط دیکھا بیچین ہو گئی ہر چند چاہتی کہ گھر کی بیگم سے خیر و عافیت دریافت کرے مگر ڈرتی تھی کہ کہیں راز فاش نہو جائے لیکن اپنی بیوی کو افسردہ دیکھ کر اتنا دریافت کیا کہ بیگم آج آپ اس قدر خاموش کیوں ہیں

بیگم:۔ ہمارے ایک عزیز نواب فریدوں قدر ہیں جنکی کمبخت بیوی تین بچے چھوڑ کر اپنے چچا زاد بھائی کے ساتھ بھاگ گئی آج اُن کا خط آیا ہے اُن کا چھوٹا بچہ مر گیا۔

مامتا کی ماری ماں اتنا سنتے ہی کلیجہ پکڑ کر بیٹھ گئی جتنا ضبط کرتی تھی اتنا ہی دل اُمڈا آتا تھا یوں تو ہر لمحہ اور ہر گھڑی بچوں کی تصویر اس کی آنکھ کے سامنے تھی مگر اس خبر نے تنویر کو حواس باختہ کر دیا معصوم کا خیال ایک چھری تھی کہ جگر پر چل رہی تھی تین ساڑھے تین

برس کا بچہ جو خون جگر پیکر بڑھا کھلتا ماننا چھوڑ کر آئی ہمیشہ کو چھوٹ گیا اس مسافرت میں کہ جان وبال اور زندگی مصیبت تھی اس کی علت خون بنکر گھسی اور آنسو بن کر ٹپکی دیوانوں کی طرح چاروں طرف پھرتی اور نام لے لیکر چیختی جنگل میں نکل جاتی۔ گھنٹوں چلاتی مگر مردہ دل کو تسکین نہ ہوتی اسی کرب و اضطراب میں ۶ مہینے بسر کئے بالآخر وحشت دل رنگ لائی اور ایک روز اسی پھول کی یاد میں جو بھری گود خالی کر گیا آدھی رات کے وقت باہر نکل کھڑی ہوئی۔ سادات کا خون غیرت کے مارے پاؤں نہ اٹھنے دیتا تھا مگر ماتا لال کی خاک پر لیجا رہی تھی اور دل کہتا تھا کہ اس قبر کے بوسے لوں جہاں کلیجہ کا ٹکڑا گہری نیند سو رہا ہے۔ حالت میں زمین آسمان کا فرق تھا صورت بدل چکی تھی ایک پھٹی سی چادر سر پر ڈالے اور ڈاڑھیں مارتی اسی طرف چلی پورے چار دن اسی طرح خاک اڑاتی فریدوں پور پہنچی آنکھ۔ ناک۔ صورت شکل۔ چال۔ ڈھال وضع قطع عادت خصلت ہر چیز بچہ کی نذر ہو چکی تھی۔ ناخن بڑھے ہوئے۔ بال کٹے ہوئے چہرہ مرجھایا ہوا ایک آٹھ ہی برس میں تنویر اس لائق ہو گئی کہ فریدوں پور کے بیس ہزار آدمیوں میں ایک شخص نہ پہچان سکا۔ قبر تنویری کو دیکھتی، ہوئی جبیرا تو بول رہا تھا آگے بڑھی اب وہ قبرستان تھا کے سامنے تھا جہاں ہزاروں بندگان خدا آرام کر رہے تھے دوپہر کا وقت تھا ہوا گرم تھی۔ املی کے تناور درخت کے نیچے ایک لوٹی سی قبر پر بیٹھی تو آنکھ نے اور ہی سماں دیکھا ایک تازہ پختہ قبر پر یہ کتبہ تھا [illegible]

"نواب فریدوں قدر کا منجھلا بچہ سلیمان قدر"
ایک چیخ ماری اور یہ کہتی ہوئی قبر پر گری۔ ہائے پیارے سلیمان تو بھی گیا گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد ہوش آیا قبر سے چمٹ گئی جا بجا بوسے لئے ادھر اُدھر بلائیں لیں اور پھر لیٹ گئی۔ آنسو ختم ہو چکے تھے مگر مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی ایک ہی صدمہ ایسا پڑا تھا کہ پنپنے کی امید نہ تھی اسپر یہ دوسرا داغ تنویر مصیبت کی سچی تصویر تھی تیسرے چوتھے روز آبادی میں آتی ٹکڑا اٹیرا مانگ لیتی اور چلی جاتی یہ گرمی کے پہاڑ سے دن کہ چیل انڈا چھوڑے اس کے سر پر گذر جاتے ایک چھوڑ دو دو بچے اور کیسے بچے جو ماں کے عاشق زار تھے زمین کا پیوند ہو گئے یہ بچہ تنویر کی آٹھ سال کی کمائی تھی اور دم بھر ماں کا پیچھا نہ چھوڑتا تھا یہ لال ایسا بچھڑا کہ دل قابو میں نہ رہا اس کے بدلے اس کی قبر کو دن رات کلیجے سے چمٹائے پڑی رہتی ہوش آتا تو کچھ اس درد سے فریاد کرتی کہ اولاد والوں کے کلیجے سن ہوتے ایک دن کہ فاختہ دوپہر کے وقت بے ثباتی دنیا کا درس دے رہی تھی اسکا جی بھر آیا اور اسوقت کو یاد کرکے لگی جب کلیجہ کے تین ٹکڑے آنکھوں کے سامنے کھیلتے دیکھ دیکھ کر نہال ہوتی اور سوچتی کہ ایک فریدوں قدر نے بیوفائی کی تو کیا یہ تین تین شوہر موجود ہیں ایک ایک روٹی دیں گے تو پیٹ بھر لونگی۔

سچ پوچھو تو زندگی کا سہارا عمر کا گذارہ اب جو کچھ بھی تھا تنویر کو یہ بچے تھے ورنہ فریدوں نے اپنی کرنے میں کسر نہ رکھی اور وہ تکلیفیں دیں کہ خدا دشمن کو بھی نصیب نہ کرے۔ محلوں کی بیٹھنے والی بیگم نے در در کی بھیک مانگی خدا کی قدرت ہے کہ جس کے گھر میں پرندہ بھی پر نہ مار سکتا

شہر شہر اور گاؤں گاؤں ننگے سر اور ننگے پاؤں ٹھوکریں کھاتی پھرے
اور کوئی بات تک پوچھنے والا نہو۔ سال بھر کے قریب اسی طرح سب ہوا
گڑگڑاتے جاڑے۔ جیٹھ بیساکھ کی گرمی۔ ساون بھادوں کے طوفان
اسے قبرستان میں قبر پر گذر گئے۔ ایکروز شہر میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ
نواب فریدوں قدر کا بڑا لڑکا سخت بیمار ہے اور دور دور سے حکیم و
ڈاکٹر بلائے جا رہے ہیں۔ سنتے ہی جان نکل گئی بہتیرا سنبھلی ہرچند
ضبط کیا مگر نہ سنبھل سکی اسی حالت میں روتی پیٹتی حسینپور پہنچی۔ پیہم صدمات
کھا کھا کے ٹوٹ چکی تھی اور اب صورت اس قابل نہ رہی تھی کہ پہچانی جا سکے
آنسوؤں کا دریا جاری تھا دل کے ٹکڑے اُڑ رہے تھے اور کوئی صورت
ایسی نظر نہ آتی تھی کہ پانچ برس کے بچھڑے ہوئے لال کی صورت دیکھ
سکے آدھی سے زیادہ رات محلسرا کے پیچھے بسر ہو گئی لوگ آ رہے تھے اور
جا رہے تھے مگر اتنی ہمت نہ تھی کہ کسی سے کیفیت دریافت کر لے
صبح ہوتے جب دل کی بے چینی بڑھی تو دروازے کے قریب گئی داروغہ
باہر نکلا تو ہاتھ جوڑ دیئے اور نوکری کی التجا کی۔ غرض ماتا کی ماری ماما کی حیثیت
میں بچہ کی تیمارداری پر اسکے واسطے تعینات ہوئی۔ بچہ تپ محرقہ میں
مبتلا تھا اور یہ دور سے بیٹھی حسرت سے اسکا منہ تک رہی تھی۔ جب نیند
[illegible] پچھلی رات فریدوں قدر اور اسکی بیگم خوابگاہ میں گئے تو کہہ
[illegible] بیٹا اچھا ہوا تو صرف وہ اکیلی جاگ رہی تھی
[illegible] اس کی کمائی اٹھا رہی تھی پیشانی کو بوسہ دیا
[illegible] اور بیتاب ہو کر لپٹ گئی قریب تھا کہ ایک چیخ مارے مگر
سنبھل گئی اور الگ ہو بیٹھی بن ماں کا بچہ ایک غیر عورت کی یہ شفقت دیکھ

ماں کی گود یاد کر کے رو دیا کیا حسرت انگیز وقت تھا دکھیاری لپٹ لپٹ
کر پوسے اور جھٹ جھٹ کر دعائیں دے رہی تھی۔ مریض کے زیادہ اصرار
پر اتنا کہا بیٹا مجھ دکھیاری کی بپتا کلیجہ ہلاوے گی وہ لال خاک میں جا سوئے
ایک ہو بہو تیری صورت کا تھا جسکی یاد آج کلیجہ تڑپا رہی ہے۔ ماں بیٹوں کی
گفتگو میں رات صبح ہو گئی ڈاکٹر آیا حرارت دو درجہ بڑھی ہوئی تھی غصہ
سے کہا بچہ جاگا ہی نہیں بلکہ دماغ سے کام لیا بہتر ہے کہ کمرہ بند کردو اور
آج بالکل تنہا چھوڑ دو نزلہ برعضو ضعیف تمام مصیبت اسی بیمار دا پر
آئی اور تنویر فریدوں قدر کے حکم سے فوراً محل سرا سے باہر نکال دی گئی
روتی پیٹتی باہر آئی دن بھر بارہ دری کے چکر کاٹے معاملہ اتنا نازک
تھا کہ نہ کچھ پوچھ سکتی تھی نہ کہہ سکتی تھی مگر دل پر جو گذر رہی تھی وہ خدا ہی
خوب جانتا تھا ایک ایک کے آگے ہاتھ جوڑتی تھی کہ مجھے اندر پہنچا دو۔
بھوکی ہوں ٹہل کرونگی پیٹ بھرونگی مگر کس کے دل کو لگی تھی اُس
کان سُنا اُس کان اُڑا دیا

الٰہی مامتا کی مصیبت دشمن پر بھی نہ پڑے رونے روتے آنکھیں سوج
گئی تھیں اور کچھ سجھائی نہ دیتا تھا شام کے وقت ٹلتی ہوئی ڈاکٹر کے
قدموں پر گری اور کہا ہمایوں کی کھلائی ہوں خدا کا واسطہ مجھکو میرے
بچہ تک پہنچا دو ڈاکٹر صاحب اولاد والا تھا ساتھ لے گیا گھر میں افراتفری
مچی ہوئی تھی ایک بچہ کی علالت دوسرے کی پیدائش کسی کو خبر بھی نہ ہوئی
اور تنویر بچہ کے کمرے میں پہنچ گئی

جب شب سیاہ اپنا پورا قبضہ جما چکی اور لوگ اپنے اپنے بچھونوں پر پہنچے
تو تنویر اُٹھی بچہ کے قدموں سے آنکھیں ملیں گو ڈاکٹر نے ممانعت

کر دی تھی مگر دل کی لگی دم بھر کو بھی خاموش نہ ہونے دیتی تھی اس نے آنکھ بند کی اُسکی جان پر بنی وہ خاموش ہوا یہ پریشان ہوئی کبھی سانس دیکھتی تھی۔ کبھی نبض۔ کبھی ہاتھ چومتی تھی۔ کبھی پاؤں چند گھنٹے کے مہمان پر دیوانہ وار صدقے اور پروانہ وار قربان ہو رہی تھی کلیجہ ان ہی دو داغوں سے چھلنی ہو چکا تھا اور اب تنویر اس قابل نہ تھی کہ ہمایوں جیسا بچہ جو ہزاروں منتوں اور ارمانوں سے جوان ہوا جس کے نام کی دیوانی اور صورت کی قربان تھی آنکھوں کے سامنے سے اُٹھ جائے اور وہ زندہ رہے مگر دنیا سب تماشے دکھا رہی تھی چھوٹے کی خبر سنائی منجھلے کی قبر دکھائی اور اب جوان شبیر آنکھوں کے سامنے دم توڑ رہا تھا تین تین گھنٹہ بعد دوا دی جا رہی تھی اور پانچ دن پانچ رات کی بھوکی پیاسی سب کام اپنے ہاتھ سے کر رہی تھی۔ ہوش و حواس جا چکے تھے ملنے کی دوا بھول میں پلا دی زہر کا حلق سے نیچے اترنا تھا کہ بچہ نے صرف اتنا کہا " ہائے ظالم ملنے کی دوا پلا دی اور بیہوش ہو گیا اسوقت کی حالت خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے دیواروں سے ٹکریں مارتی تھی اور تڑپتی تھی آدھی رات کا گجر بج رہا تھا کہ ہمایوں کا سانس اکھڑ گیا اسی حالت میں اُس نے آنکھ کھولی اور دیکھا کہ سر ماں کی گود میں ہے ... ہاتھ گلے میں ڈالدئے اور اتنا کہہ کر پھر بیہوش ہوا " میری بدنصیب ماں میری خطا معاف" بچہ کا اتنا کہنا تھا کہ تنویر کا دل بھر آیا لپٹ گئی اور رو کر کہا " میرے لال خطا وار میں ہوں " تنویر بچہ کو لپٹی ہوئی تھی کہ اس نے پھر آنکھ کھولی زبان بند ہو چکی تھی ماں کے آگے ہاتھ جوڑے نگاہ ماں کے چہرہ پر تھی کہ ایک ہچکی آئی اور ختم ہوا۔ بدنصیب ماں مُردے کو کلیجے سے لگائے تڑپ رہی تھی کہ

کچھ خیال آیا اٹھی وہی دوا خود پی لی اور ایک چیخ ماری اور یہ کہکر لاش پر گری "اے چاند اکیلا نہ سونے دونگی"

لوگ دوڑ پڑے فریدوں آیا ڈاکٹر کو بلوایا۔ تنویر اسوقت ہشیار ہوئی اور باآواز بلند کہا۔

میں ہمایوں کی سچی چاہنے والی بدنصیب تنویر ہوں میرے تینوں لال مجھ سے چھوٹ گئے اور اب تھوڑی دیر بعد میں بھی دنیا سے رخصت ہوتی ہوں قیامت کے روز خدا اس بات کی شہادت دے گا کہ تنویر کا دامن عصمت ہر دھبے سے پاک ہے میری قبر میرے لال کے برابر بنا دینا کہ جب تک گہری نیند سوؤں میرا بچہ میرے کلیجہ سے چمٹا رہے۔ تنویر کی گفتگو یہیں تک پہنچی تھی کہ اسکی آواز لڑکھڑا گئی اس نے فریدوں قدر سے بدقت کہا کہ "میرے سرتاج میرے قصوروں کو معاف کرنا" اور ختم ہوئی۔

مورکھ ہندی

تجھے کیونکر نہ ہنسی اس بلاغ پر آئی کہ پھرتا تھا
بہت ابھرا ہوا شیخی سے پہنے میم کی اترن

کہ تو ہندی مسلماں ہے تجھے خود بھی نہیں بھاتا
ذرا اپنے ملک کا کرتا نہ اپنے دیس کی اچکن

تجھے دیکھا ہے موٹا سوٹ لادے گرم موسم میں
پھنسی پائی ہے کالر کے شکنجے میں تری گردن

تجھے دیکھا ہے اتراتے بہت اک لال ٹوپی پر
بھلا انصاف سے کہیو یہ کچھ بھی ہے کہ اوچھا پن

فقیروں کی طرح تو مانگتا پھرتا ہے غیروں سے
گرا پڑتا ہے او بے شرم انکی جھوٹی اترن

ستایا اسقدر اس احمقانہ حرص نے تجکو — کہ اپنے گھر کی ہر اک چیز کا تو ہو گیا دشمن
مٹا دی تو نے اپنے بھائیونکی صنعت و حرفت — ملا دی خاک میں ساری ہنرمندی تمامی فن
وہ اب سر پھوڑتے ہیں اپنا بنجر بلی زمینوں میں — کہ بھر بھر کے پالیں پیٹ اور لیروں سے ڈھانکیں تن
اور انکی سوکھی سوکھی نیم عریاں فاقہ کش بچے — اُٹھاتے پھرتے ہیں گو بر جو جنتے پھرتے ہیں اپندھن
ہوئے مجبور او سفاک تیرے عیش کی خاطر — کہ یا مر جائیں یا محنت کریں یا نالہ و شیون
فراغت کو بھی لیکن جلد مل جائیگا تنخی کا — جب آفت ہو جائے گی دولت تیرا لٹ جائیگا جب دھن
قسم ہے عالم اسباب کی خود تیری نسلوں میں — بہت لاچار پھیلایا کریں گے بھیک کا دامن
اور اسپر غضب سے دعوا ہے ملکی خیر خواہی کا — سنبھل جاؤ ابھی ورنہ یہ بربادی کے ہیں لچھن
ترقی اور آزادی پہ چلتی ہے زباں تر تر — تیرے خامے کے آگے گرد ہے شہ زوری توسن
برا کہتا ہے شاہ عالم کو اور نو ممبر جعفر کو — کہ تھے یہ بندگان نفس ملک و حریت دشمن
انھوں نے بیچ دیں اپنی زمینیں اور اولادیں — کہ کھائیں ٹھوکریں وہ جیتے جی دنیا میں تحقیرا"
صحیح بیچا انھوں نے ملک تو نے اپنی دولت دی — مگر تو بھی تو ہے غدار اور تو بھی تو ہے خاین

خبر رکھ اس کا ثمرہ بھی ہے خواری چشم عالم میں
اور عقبیٰ میں ہمارا ہاتھ تیرا کوٹ کا دامن

∴

یہ کیا چل دے رہا ہے کیسی آزادی تجارت کی — کہاں کا کمپٹیشن جیکا تو قایل ہے انصاف
بھلا مفلوک ہندوستان و یورپ کی لڑائی کیا — کہاں کرگہ کہاں کرنی کہاں جھگڑا کہاں انجن
اور ان ملکوں میں بھی اب چیرہ دستی مالداروں کی — غریب اور مفلسوں پر ہو رہی ہے دن بدن روشن
ابھی زور اسپہ زردار و نگاہ اور کثرت ہے دولت کی — دے شاہد پشیمانی ہے عشرت کی تعقب زن

∴

ہیئت اجتماعیہ

انسان اور حیوان میں فرق یہی ہے کہ حیوان پیدا ہوتے ہی اپنی ضروریات سے باخبر ہو جاتا ہے۔ ہاں اتنی بات ہے کہ اُس کی فطرتی علمیت محدود ہوتی ہے۔ صرف وہیں تک جہاں تک کہ اُس کے لئے فطری ضروریات ہیں اس سے وہ ایک انچھ بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ بئے کا گھونسلا جس وضع پر اس کائنات میں قدم رکھنے والے پہلے انسان کے عہد میں ہوگا ویسا ہی آج موجود ہے اس میں ذرا بھی تغیر و تبدل نہیں ہوا ایک بئے کا گھونسلا کیا سارے حیوانی خیالات اور زندگی کا یہی عالم ہے۔ اس کی لم یہی ہے کہ ان کی ضرورتیں ابتدائے روز پیدائش سے تا دم مرگ وہی ویسی ہی اور اسی قدر چلی آتی ہیں جس قدر کہ اُن کی فطرت کا تقاضا ہے اس ضرورت میں ان کی جانب سے کچھ بھی ترقی نہیں ہوتی۔ ان کے قوائے جسمانی اور دماغی ایسے نہیں پیدا کئے گئے کہ ترقی کر کے اپنے جملہ خواہشات کے ساتھ ساتھ اپنے لوازم زندگی کو بھی بڑھاتے چلے جائیں۔ مگر انسان کی ہر بات نئی ہے وہ پیدا ہوتا ہے ایک مضغۂ محض اس میں اگرچہ قوائے جسمانی و دماغی ودیعت ہوتے ہیں مگر پہلے پہل وہ کچھ بھی کام نہیں دیتے اسکو ذرہ بھر بھی اپنے لوازم ضروریہ کا علم نہیں ہوتا۔

اس وسیع عالم میں داخل اسے فطرت اور اپنے ابنائے جنس سے بہت ساری اور بھاری لڑائیاں لڑنا اور معرکے سر کرنا ہیں وہ ابتدا بیکبینی و دو گوش بلا اسلحہ قدم رکھتا ہے اسے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اسے کیا کرنا ہے ابتدائی تین چار سال یوں ہی بیکار گزر جاتے ہیں کہ جن میں آیندہ کے لئے اس کے قوائے جسمانی کی تکمیل ہوتی ہے۔
اس کے بعد تربیت و تعلیم کا رہبر اس کے ہمراہ ہو جاتا ہے اور یہ راہبر اس وقت تک اس کے ساتھ ساتھ رہتا ہے جبتک کہ اسے بھلے برے کا امتیاز نہ آجائے اور وہ خود دلائل و نتائج سے انجام بینی اور ہر اک کام کی بھلائی اور برائی کو نہ سوچ سکے وہ جو تربیت و تعلیم سے بے نصیب ہوتے ہیں صرف حیوان ناطق ہونے کے خاصہ میں ہیں ان میں اور دوسرے حیوانات میں کچھ بھی تمیز نہیں ہوتی - وہ صرف کھاتے پیتے اور بچہ کشی کرتے اور اجل موعود پر چلے جاتے ہیں یہ اس بڑی کائنات کے کوڑا کرکٹ ہیں۔ **قرآن حکیم** ان کے اسی خاصہ پر نظر فرما کے حکم لگاتا ہے **وھم کالانعام بل ھم اضل سبیلا** (یہ ڈھور ڈنگر کے مانند بلکہ ان سے بھی بدتر ہیں) ایران کے مشہور شاعر اور تجربہ کار جہاں دیدہ بزرگوار شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی خدا کی لاکھوں رحمتیں ان کی روح پاک پر۔ فرماتے ہیں۔

بنی آدم از علم باید کمال
نہ از حشمت و جاہ و مال و منال

اس سے صاف ثابت ہو جاتا ہے کہ آدمی کا انسان بننا صرف تربیت و تعلیم پر منحصر ہے جیسی جیسی تربیت و تعلیم ہو گی انسان آیندہ ویسا ہی

قابل عظمت اور نیک نہاد یا شریر و بد نہاد ہوگا۔

انسان کا ایک بچّہ جب ذرا بڑھتا ہے بالکل جاہل رہتا ہے اسے نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں کون ہوں اور مجھے کیا کرنا چاہئے اور نہ یہ علم رہتا ہے کہ میرے آس پاس کیا ہے اور مجھ کو ان مخلوقات کے متعلق کیا کرنا لازم ہے اگر اس کی تربیت نہ ہوگی تو ویسا ہی نادان اور جاہل رہ جائے گا جیسا کہ اس کرۂ ارض کا پہلا انسان تھا۔ ہاں البتّہ اس کو اتنی ضرورت محسوس ہوگی کہ قوائے طبعیہ کے خوف سے ان کا مطیع و منقاد ہو ان سے ڈرتا رہے اور اپنے دشمنوں کی مقاومت کے لئے وسائل ڈھونڈ نکالے اور حیوانی خواہشات ادا کرنے کا جویا ہو اس کے سوا نہ یہ علم ہوگا کہ میں کون ہوں اور مجھے کیا کرنا چاہئے اور نہ وہ اپنے آئے دن کے تجربوں کو مدوّن کرے گا۔ مگر چونکہ ایسا نہیں ہوتا اس لئے تربیت یافتہ لوگ اپنے سوانح زندگی کو صرف اپنے آپ کے لئے ہی مدوّن نہیں کرتے بلکہ اپنی اولاد کو بھی ان سے فائدہ اور نتیجہ اٹھانے کا موقع دیتے ہیں۔ اور پھر ان تجارب کو بھی اپنے اسلاف سے جو انہیں اپنے ورثہ میں ملے ہیں جب سے انسان باشعور ہو کر ان متعدد انسانی تجارب کو جمع کرنا شروع کرتا ہے تب سے دنیا میں شائستگی کا نور پھیلنے لگا ہے اور اسی مجموعۂ تجارب کا نام ہے "تمدن" یا "مدنیّۃ" جو ان گنت مدتوں میں جاکر وجود پذیر ہوا ہے۔

روشنی بخش اگر لوز نہ تیرا ہوتا
محفل عالم امکاں میں اندھیرا ہوتا

تربیت کے عام معنی یہ ہیں کہ بچّہ کی ایسی تربیت ہو کہ وہ جس وسط یا

یا قوم اور آبادی میں پیدا ہوا ہے اس میں بخوبی اپنی زندگی بسر کر سکے
پس تربیت محیط کے اختلاف کے باعث مختلف ہوتی ہے۔

ایک حبشی کی ویسی تربیت نہ ہوگی جیسی کہ ایک یوروپین کی ہوتی ہے۔ وجہ یہ کہ حبشی کے محیط کا اقتضا یوروپین کے محیط کے اقتضا کے خلاف ہے ایک بچہ یا قوم کا ایک فرد والدین اور اپنے معلّم کے ذریعہ ان تمام علوم و معارف کو اس لئے حاصل کرتا ہے کہ قوم کی مدنیت یا تمدن میں شریک حال ہو اور قومی زندگی کا ایک عضو کارکن ہو

تربیت و تعلیم میں ایک بچے یا ایک فرد کی زندگی کا ایک اہم حصہ صرف ہو جاتا ہے ابتدائی تین سال اس کے تربیت اور باقاعدگی حرکات کے لئے مخصوص ہوتے ہیں پھر تیسرے سال سے چھٹے یں اور بیسویں سال اور اس کے بعد تک وہ اپنی قوم کے تجربے اور اسکے علوم و فنون حاصل کرتا ہے اس کے بعد بتدریج قومی حیات ادبیہ میں شریک ہونے لگتا ہے **حیات ادبیہ** سے ہماری مراد وہ تمام قومی اعمال اور آمال اور تعلقات ہیں کہ جن میں قوم کا ایک فرد واحد شریک ہوتا ہے

ایک لڑکے کو اپنے محیط میں زندگی بسر کرنے کے لئے کس طرح تیار کرنا چاہیئے

علم الحیات میں یہ تحقیق شدہ بات ہے کہ ایک نطفہ کو اپنے زمانہ نشو و نما میں انہی تدریجی دوروں کا طے کرنا لازم ہے کہ جس قدر دورے اس کی جنس اپنی ایام نشو و ارتقا میں طے کر چکی ہے مثلاً ایک انسانی

نطفہ یکے بعد دیگرے اپنے جنس کے ان تمام انواع کی تصویر ہوتا ہے
کہ جن سے وہ پیدا ہوا ہے۔ یہی حال تعلیم تربیت کا بھی ہے۔ تربیت
سے ابتداءً لڑکے میں قوم کی عقلی تاریخ کا نشو و نما ہوتا ہے اور
اس نشو و نما کے بعد وہ رفتہ رفتہ قومی تجارب اور انکشافات
اور سائر معلومات کو اس غرض سے جاننے لگتا ہے کہ آیندہ چل کر اپنے
اہل خاندان اور اہل وطن کا شریک حال ہو سکے کہ انسان اپنی قوم
کا ایک جزو ہے اور اس کی زندگی کبھی کبھی اس قومی مجموعہ کے
بجز نہیں قائم نہیں رہ سکتی اگرچہ قوم کے ہمیشہ زندہ باقی رہنے کے
توالد و تناسل جسدی کا تسلسل لازمی ہے مگر صرف اسی تسلسل سے
قومی حیات باقی رہ سکتی بلکہ اس کے قیام کے لیے تناسل عقلی کا
سلسلہ بھی ہونا چاہئے جس طرح کہ ایک بچہ اپنے آبا و اجداد
کے گوشت پوست اور خون کا وارث ہوتا ہے اسی طرح اس
پر لازم ہے کہ وہ قوم کے نتائج عقل کا بھی وارث ٹھیرے

اس صورت میں گویا تربیت و تعلیم کا وسیع معنی یہی ہوا کہ
ایک لڑکے یا ایک فرد کو اس طرح تیار کیا جائے کہ وہ اپنے قومی
جملہ ضروریات کے ادا کرنے کے لیے پورا مستعد ہو اور ہمارا
موجودہ موضوع (سبجکٹ) یعنی تربیت اور ہیئت اجتماعیہ اس امر
کا مقتضی ہے کہ ہم تین امور یا مبحث پر غور کریں چنانچہ وہ یہ ہیں

(۱) محیط ادبی کن باتوں سے وجود پذیر ہوتا ہے

(۲) ہیئت اجتماعیہ پر تربیت کا کیا اثر ہوتا ہے

(۳) ان مباحث کے نتائج عملیہ

اب ہم ان تین امور پر الگ الگ بحث کریں گے۔

اوّلاً محیط ادبی کن امور سے وجود پذیر ہوتا ہے

انسان کی عاقلہ قوتیں تین ہیں (۱) احساس (۲) ادراک (۳) ارادہ۔ وہ اپنے احساس کے ذریعہ ہر ایک بات کا شعور پیدا کرتا ہے ادراک سے جانتا اور قوت ارادہ کے وسیلہ سے عمل پیرا ہوتا ہے اور ان تینوں قوتوں کے تابع کئی اور مظاہر ادبیہ ہیں۔ جن میں سے کوئی احساس کا کام دیتا ہے۔ کوئی ادراک پر امادہ کرتا ہے۔ اور کوئی شناسائی کا بانی ہے اور کسی سے ارادہ عملی صورت کا لیتا ہے۔ تربیت صحیحہ کی غرض اصلی اسیطرح ابتدائی تین اصول بنیادی سے ہے جس طرح انسانی قوتوں کا شمار تین سے ہے اور ابتدائی اصول بنیادی یہ ہیں۔

اوّلاً خوبی اور خوبصورتی کی محبت۔ برائی اور بدصورتی سے نفرت اس کا تعلق احساس سے ہے۔

ثانیاً اصلیت اور حقیقت کی تحقیق اور غیر اصلیت اور توہم سے پرہیز کرنا (یہ ادراک سے متعلق ہے)

ثالثاً فضیلت کے لئے عمل پیرا ہونا اور رزیلت کو چھوڑنا (اسکا تعلق ارادے سے ہے۔

انہیں تین صفات کمالیہ۔ حقیقت۔ فضیلت اور خوبی کے لئے ہر اک اعلیٰ خیال انسان دوڑ دھوپ کرتا ہے اور اسی تین ارکان پر انسانی کمال کی عمارت قائم ہوتی ہے۔ کیونکہ

ہمارے جملہ مختلف علوم و معارف کی یہی غرض ہے کہ ہمیں ادراک حقیقت ہو اور تمام فنون کا مطلب اصلی اتنا ہے کہ ہم میں جمال اخوبی کا احساس پیدا ہو جائے اور اسکی صورت کو ہم محسوس کر سکیں پھر سب اقوام اور اشخاص کے اعمال کی غایت یہی ہے کہ انہیں فضیلت حاصل ہو اب ہم ایک نقشہ درج کرتے ہیں اس سے صاف واضح ہو جائیگا کہ محیط ادبی کن چیزوں سے مرکب ہے اور وہ یہ ہے۔

- **علم**
  - **علوم مادیہ**
    - **علوم غیر حیویہ**
      - طبیعیات
      - طبقات الارض و معدنیات
      - جغرافیہ
      - کیمیا - فلکیات
    - **علوم حیویہ**
      - علم حیات و نباتات و حیوانات
      - علم وظائف الاعضاء
      - علم التشریح
      - علم انسان
      - طبقات الامم
      - علم الاجتماع یعنی ہیئت تمدن
      - علم الاقتصاد
  - **علوم عقلیہ**
    - علم النفس
    - منطق
    - ماوراء المادہ
    - فلسفہ ادبیہ
    - ریاضیات
    - علم زبان
- **فنون**
  - ہندسہ - حکماکی رعام [illegible] معنی میں)
  - مصوری - موسیقی
  - علم ادب - مذہب
- **نتائج عقلیہ**
  - اصول دستور سلطنت و صلوٰۃ قوانین حقوق رعایا و عدالت یعنی لا
  - علم سلوک (یعنی سوانح فرد خاص)
  - علم تاریخ یعنی تدوین اجمال ہیئت اجتماعیہ

علوم

علوم نتیجہ ہیں عقل انسانی کے اس غور و خوض کا جو وہ ان مظاہر مادیہ عقلیہ کے سمجھنے میں کام میں لایا ہے کہ جن کے بیچوں بیچ وہ زندگی بسر کرتا ہے۔ علوم کی غرض اصلی یہی ہے کہ حقیقت نفس الامری تک رسائی ہو۔ دنیا جیسا کہ انسان اب تک سمجھا ہوا ہے دو چیزوں سے مرکب ہے ایک جوہر اور ایک مادہ اور ایک روح۔

علوم کی بھی دو قسمیں ہیں ایک علوم **عقلیہ** اور ایک علوم **نفسیہ** سب سے پہلے جب انسان خارجی دنیا پر نظر ڈالتا ہے تو اُسے مادہ اور مادے کے ظواہر یا مظاہر نظر آتے ہیں اور جب وہ اس کے اپنی ذات کی جانب متوجہ ہوتا ہے عقل اور مختلف قوتوں کا جلوہ اسے دکھائی دیتا ہے اور مادے کی بھی دو نوع ہیں۔ ایک کا نام عضویہ یا حیہ (زندہ ہے) اور یہ وہ چیز ہے کہ جس سے ایک زندہ مخلوق (عام معنی مراد ہیں) کے تمام اجزا اس طرح باہم ربط اور ضبط پیدا کر لیتے ہیں کہ جس سے اس مخلوق کے سارے مجموعہ کی زندگی اسی ارتباط و انضباط پر منحصر ہے جیسے حیوانات اور نباتات کی زندگی اور دوسرے کا نام غیر حیہ (بیجان) اس میں ذات شئے کے اجزا باہم ارتباط و انضباط تامہ کیے ہوئے نہیں رہتے جیسے طرح طرح کے جمادات۔

اگر جمادات سے ان کا کوئی جز نکال لیا جائے تو ساری چیز کو کچھ بھی نقصان نہیں ہوتا اور یہ بات کائنات حیہ کے بالکل ہی برعکس معلوم ہوتی ہے

سب سے پہلے انسان مادہ کے خواص دریافت کرے جس سے علم الطبیعۃ پیدا ہو پھر یکے بعد دیگرے علم طبقات الارض۔ علم معدنیات علم جغرافیہ۔ علم کیمیا اور علم فلک تحقیق اور مدون ہوگیا اس کے بعد وہ کائنات حیہ پر غور وخوض کرنے لگا اس غور وخوض کا نتیجہ یہ ہوا کہ علم نباتات اور علم حیوانات پیدا ہوگئے ان کے بعد لگے ہاتوں علم وظائف الاعضا اور علم تشریح یعنی علم ترکیب اعضا و اشکال حیوانی اور علم الانسان اور علم طبقات الامم اور علم الاجتماع (سیاست مدن) اور علم الاقتصاد (پولیٹکل اکانمی) کا دنیا میں وجود ہوا جب انسان کو خارجی دنیا کا اس قدر تھوڑا بہت علم ہوگیا وہ اپنی ذات کی جانب متوجہ ہوا۔ اب وہ اپنی ذات کے متعلق عرفان حاصل کرنے لگا۔ اس تحقیقات سے علم النفس کا قدم دنیا میں آیا۔ بعد میں انسنے ظواہر یا مظاہر نفس اور اُن کے اعمال پر غور کرنا شروع کیا جس سے فلسفہ منطق اور علم زبان اور ریاضیات وغیرہ تحقیق ہوگئے۔

انسان صرف علوم یا حقایق کے فراہم کرنے ہی پر بس نہیں کرتا بلکہ اسکو اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ وہ ان حقایق کو اعمال سے تطبیق دے کر ان سے استفادہ بھی حاصل کرے اس بارہ خاص میں یہاں تک محتاج ہے کہ اصلیت یا حقیقت کے جاننے سے پیشتر ہی وہ کام میں ہاتھ ڈالدیتا ہے اسکی وجہ اسکی زندگی کی ضرورتیں اور خود اسکی زندگی ہے کہ زندگی سب سے مقدم ہے پھر عمل کے بعد اس کی تعلیل اور تحلیل کرنے لگتا ہے اور اس سے اس لئے قواعد کلیہ استخراج کرتا ہے کہ آیندہ چل کر خود اُسے کام آئے یہی وجہ ہے کہ دنیا کا ایک ایک علم ایک پیشہ سے متعلق ہے طبعیات اس

علم ہندسہ سے متعلق ہے جو کلوں کے بنانے اور درست کرنے اور اُن
کو کام میں لانے سے خصوصیت رکھتا ہے۔ علم طبقات الارض اور علم معدنیات
زمین کے طبقوں کے اسرار سے خاص ہیں۔ کیمیا کا دخل اکثر صنائع میں ہے
فلکیات اور جغرافیا کی ضرورت جہاز رانی کے متعلق ناگزیر۔ علم تشریح اور
فزیالوجی تو طبیب کے مطب کی بنیاد ہیں۔ سلطنت اور فرماں روائی اور
حفظ امن عام کے لئے علوم اجتماعیہ کی سخت ضرورت ہے۔ فلسفہ ادبیہ
عام انسانوں کے باہمی تعلقات کی غرض سے لازمی ہے
علم نحو تحریر اور تقریر کے کام آتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس سب علوم کا یہی
حال ہے۔

علوم کی اشاعت سے متعدد فائدے حاصل ہوتے ہیں سب سے پہلا اور
عام فائدہ یہ ہے کہ وہ ایک کیا ہر ایک اشیا کے متعلق حقائق ابتدائیہ و اصولیہ
تعلیم کرتے ہیں کہ جن کے بچوں پیچ وہ ہوتا ہے جس سے وہ یہ جان جاتا
ہے کہ ان لوگوں اور اشیاء کے ساتھ کس طرح کا برتاؤ کرے۔ اس کے
سوا اور بھی کئی خاص فوائد ہیں مثلاً علوم مادیہ ہی کو لیجئے ان سے
انسانی قوائے غور و تدبر و استنتاج کی ایک گونہ مشق ہوتی رہتی ہے
اور یہ مشق ذہن اور عقل کو ایک خاص معاملہ سے عام معاملہ تک اور عام معاملہ
سے خاص معاملہ تک رسائی کرنے کے لئے رہبر ہوتی پھر اس سے ترتیب و
تنظیم افکار میں بھی بخوبی مدد مل سکتی ہے اور اس مدد کے ذریعہ ایک
شخص اپنے حوادث و واقعات کو ٹھیک انہیں کے درجہ پر رکھ سکتا ہے
ذرا علوم عقلیہ ہی پر نگاہیں ڈالو کہ کس طرح وہ انسان کو اس کے قوائے
نفسی کی شناسائی دلاتی ہیں وہ سمجھاتی ہیں کہ کیونکر انسان کو حقیقت

تک پہنچنا چاہیے ان کا تقاضا ہوتا ہے کہ فرزند آدم مبدء و مرجع کائنات
کے متعلق خوب خوب جستجو کرے اور ان کا وسیلہ اُن کا وجود مختلف انسانوں کے
اخلاق اور اُن کے طبائع کو جان جانا ہے وہ اس شخص کو فضیلت اور جمال
کی ماہیت اس غرض سے سمجھاتے ہیں کہ وہ ان دونوں کا محب اور
ان پر عمل کرنے والا ہو

فنون

فنون احساس کا نتیجہ ہیں تمام فنون اپنی مختلف اشکال کے ساتھ
خوبی کے معنی کو مکمل صورت میں تبلانے کی کوشش کرتے ہیں خوبی سے ہماری
مراد جمال ظاہری ہے اور جمال ظاہری وہ ہے کہ ایک چیز کے اجزا میں اس
طرح تناسب پیدا ہو کہ دیکھنے سے نفس کو ایک مسرت معلوم ہو پھر اس
تناسب کے باعث سارے مجموعہ میں بھی کمالیہ یا صورت کمالیہ پیدا ہو جائے
رومن لوگوں کا مقولہ ہے کہ فن سے مراد چند جزئی معانی سے ایک کلی معانی
کا نکالنا مراد ہے

اصلی فنون پانچ ہیں۔ ہندسہ۔ معماری۔ حکاکی۔ مصوری۔ موسیقی
علم ادب۔ ان سب کی غرض اصلی یہی ہے کہ جمال ظاہری کی تصویر یا تمثیل
کھینچ کے سامنے کردے مگر ایک ہندسہ معماری انسان کے لئے ایک فائدہ
حقیقی عاید کرتا ہے۔

بعض داناؤں نے فنون کے ساتھ دین کو بھی اضافہ کیا ہے اسکی
وجہ یہ ہے کہ جس طرح فنون عواطف و وجدان انسانی سے پیدا ہوتے
ہیں اسی طرح دین و مذہب کا بھی حال ہے گویا فنون و مذہب دونوں

ایک ہی مصدر اور منبع سے نکلے ہیں۔ فنون اگر وجدان اور جمال ظاہری سے پیدا ہوئے ہیں تو دین وجدان شعور آسمانی سے پیدا ہوتا ہے۔

اس صورت میں دین کی اصل یہ ہوئی کہ دین ان خیالات کا نام نہیں جو ایک انسان ان پر اعتقاد رکھتا ہے گویا اعتقاد اور عمل دونوں وجدان کے تابع ہیں۔ مگر یہ بحث اور ہے کہ کون سا وجدان دراصل سچا ہے اس میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ فنون جمیلہ کی جانب چنداں لوگوں کا خیال نہیں اور مشرق میں تو ان کی جانب کوئی نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا حالانکہ یہ وہ امور ہیں کہ جنکی تاثیر نفوس پر گہری پڑتی ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ جمال ظاہری کی محبت شعور وجدان انسانی کو پرسر ترقی اور آمادہ کرتی ہے کہ وہ ہر بات میں صورت کمالیہ کی تفتیش و تلاش کریں اور قبیح سے خواہ وہ کہیں کیوں نہ ہو نفرت کرنا سیکھیں اور فنون ہر ایک قوم کی زندگی کے لئے لازمی ہیں دنیا کا کوئی قبیلہ خواہ وہ کیسا ہی ناشائستہ کیوں نہو ایک بھی ایسا نہ ملے گا جو کم سے کم حکاکی یا مصوری وغیرہ کو نہ جانتا ہو آجکل ان فنون میں سے زیادہ اشاعت علم ادب کی ہے کہ جس سے شاعری پیدا ہوئی ہے ہم شعر کیواسطے اقوام اور اشخاص کے حالات اور ان کے طبائع اور ان کے اسباب سرور وکدورت کو بخوبی جان سکتے ہیں۔

اعمال

انسان صرف فنون اور علوم کو حاصل کرکے خاموش نہیں رہ گیا بلکہ ان علوم و فنون کو عمل سے تطبیق دینے کی کوشش کی۔ پس تاریخ صرف

اس کے تدوین اعمال کا نتیجہ یا نام ہے اور کسب صدور اعمال کی تین قسمیں ہیں یا تو اُن کا ظہور فرد واحد سے ہوا ہوگا یا قوم یا ایک ہیبت اجتماعیہ کے اعمال شرائع اور قوانین مختلفہ۔ اب ہم کو ان تمام قسم کے اعمال کی الگ الگ تعریف کرنی لازم ہے اس سلسلہ میں ہم سب سے پہلے تاریخ سے شروع کرتے ہیں جو سب طرح کے اعمال کی جامع ہے۔

(۱) تاریخ چند مشہور داناؤں کی نظر میں ان بڑے بڑے مشہور انسانوں کی سوانح عمری ہے جو بلا لشکر اور حکومت کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے کچھ اور لوگ تاریخ کی اس طرح تعریف کرتے ہیں کہ فی الواقع سیاست ماضیہ کا نام ہے۔

نپولین کا مقولہ ہے کہ تاریخ سے مراد وہ روایت ہے کہ جس کی لوگ تصدیق کرتے ہیں۔

بعض فلاسفر جو انسان کے آزاد ارادگی کے منکر اور اسکو مجبور بتلاتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اعمال انسانی یعنی واقعات تاریخی اس کے ارادے و اختیار سے پیدا ہوئے ہیں بلکہ حوادث طبعیہ ہیں کہ جن کا واقع ہونا لازمی ہے

بہرحال تاریخ تدوین واقعات کا نام ہے کہ جس میں مورخ کے شعور وجدان کا کچھ بھی دخل نہیں ہوتا۔

(۲) دستور العمل قومی اس سے ایک قوم کے اخلاق اور عادات اور رغائب مجسم نظر آتے ہیں اس کے لئے یہ لازم ہے کہ یہ اخلاق اور عادات اور رغائب طبعی طور پر ترقی کرتے جائیں نہ یہ کہ ہم ترقی دینے کے لئے ایک اعلیٰ درجہ کا دستور العمل گھڑ کے رکھ دیں ایسا دستور العمل ایسی قوم کے لئے جو ذرا بھی مستعد ترقی نہ ہو کچھ بھی فائدہ نہ دے گا اس کو

اس کو دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ قوم اپنا دستور العمل
آپ پیدا کرے نہ کہ دستور قوم پر اپنا اثر ڈالے پس معلوم ہوا کہ دستور قوم کا
تابع ہے نہ کہ قوم دستور کی تابع وجہ یہ کہ دستور اس کے رغائب کی
صورت کا نام ہے۔ دستور العملوں اور قوانین رسالیہ کی تدوین گویا
قوم کے رغائب کا ایک رمز ہے۔ اگر قومی خیالات اور دستور میں اتفاق
نہو تو دستور بیکار چلا جاتا ہے۔

(۳) قوانین ان اصول کا نام ہے کہ جنہیں ایک ہیئت اجتماعیہ اس
غرض سے بناتی ہے۔ کہ اس کا شیرازہ قایم ہو اور اُس کے اعضا بحفاظت
رہیں یہ لازم ہے کہ قوانین ایسے لوگوں کے جانب سے ایجاد کئے جائیں
جو ان کے عملدرآمد پر بھی قادر رہوں ورنہ ایسے قوانین کی کیا قدر و
قیمت جو صرف کاغذوں میں لکھے پڑے ہیں اور رائج نہیں

(۴) ایک فرد واحد کے اعمال:- ایک فرد واحد جو زندگی بسر
کرتا ہے وہ اپنی زندگی کے لئے بطور خود کچھ قوانین تیار رکھتا ہے
کہ جن پر وہ گامزن ہوتا ہے اس کے اعمال کا صالح اور طالح ہونا
غلطی اور اتفاق کی وجہ نہیں ہوتا بلکہ ان نتایج پر جو ان اعمال سے
پیدا ہو جاتے ہیں مگر اعمال صالحہ سے اس فرد اور سارے ہیئت
اجتماعیہ کو فائدہ ہوتا ہے اور اعمال طالحہ دونوں کو نقصان پہنچاتے
ہیں اچھے کاموں سے جنس بشری کی حفاظت ہوتی ہے اور برے
کام اسکو برباد کر دیتے ہیں۔

اب ہم ان فوائد کو بیان کرنا چاہتے ہیں جو نوجوانوں کو تاریخ
اور دستور العمل قوم اور قوانین قوم کے تعلیم کرنے سے حاصل ہو سکتے ہیں

اس کا پہلا فائدہ یہ ہے کہ نوجوان انسان کو معنی ہیئت اجتماعیہ معلوم ہو جاتا ہے جس سے وہ سمجھنے لگتا ہے کہ میں بھی اس ہماری جماعت کا ایک فرد ہوں اور یہ کہ بالادستی اور حکومت صرف اس ہماری جماعت کی بھلائی اور بہتری پر موقوف ہے اس سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ قوم ایک جسم کی مانند ایسے اعضا سے مرکب ہے جو کہ مشترکۃ المصلحۃ ہیں - اور دوسرا فائدہ یہ کہ طالب العلم کو اپنے ابنائے قوم کے جملہ اعمال اور ان کے عظائم امور معلوم ہو جاتے اور ان سب فخروں کا تنا سا ہوتا رہتا ہے جو اس کے اسلاف کر چکے ہیں اس کے بعد وہ خود اس قوم کے جانب اپنے آپ کے منسوب ہونے کو ایک فخر سمجھنے لگ جاتا ہے اور یہ امر جیسا کہ مفید ہے ظاہر ہے -

تیسرا فائدہ یہ کہ تاریخ کے مطالعہ سے آیندہ زمانے کے لیے عظیم انسان انسان پیدا ہوتے اور اپنے اسلاف کے خطا و صواب میں تمیز کر کے راہ خطا کو چھوڑ کر طریق صواب پر چلنے لگتے ہیں -

چوتھا فائدہ یہ کہ تاریخ کے پڑھنے سے ایک فرد واحد اپنے قوم کا عضو عامل بن جاتا ہے -

خلاصہ یہ کہ تربیت کا وجود تین چیزوں سے ہوتا ہے (۱) فنون (۲) علوم اور (۳) اعمال ایک جوان اس وقت تک مہذب یا شائستہ نہیں سمجھا جائے گا جب تک کہ وہ ان تینوں فضائل سے تھوڑا بہت بہرہ یاب نہ ہو ان تین امور میں سے اگر ایک امر بھی چھوڑ دیا گیا تو گویا اس کی تربیت ناقص رہی

پس سب مدارس کا فرض ہے کہ وہ ان فضائل کو اپنے یہاں تعلیم

کرے یعنی علوم میں سے فلسفہ طبعیہ اور کیمیا اور علم حیات دنبات و حیوان) علم النفس - ریاضیات اور قواعد زبان۔

فنون میں سے علم ادب اور شعبہائے فنون جمیلہ۔

اعمال میں سے تاریخ۔

ہماری مراد یہ نہیں ہے کہ ہماری بتائے ہوئے فروعات علوم و فنون ہی تعلیم ہوں بلکہ صرف یہ سمجھانا ہے کہ بہرحال طالب علم کو ان نبیوں فضائل سے کچھ نہ کچھ بہرہ حاصل ہو رہے اور وہ ان ترقیات کے تھوڑے بہت حصہ سے فائدہ مند ہو جائے جو عقل انسانی کے تقدم کا نتیجہ ہیں ورنہ اس پران امور کا احاطہ کرنا ناممکن - یہاں یہ ضروری نکتہ بھی معلم اور متعلم دونوں کی نظر سے فرو ہونا چاہیئے کہ تعلیم سے مراد درسہائے متعدد ہ نہیں بلکہ وہ تاثیر ہے جو ان درسوں سے ذہن میں پیدا ہوتی جاتی ہے۔

ثانیاً تاثیر تربیت ہیئت اجتماعیہ پر ہیئت اجتماعیہ پر تربیت کی مجملاً تین تاثیریں پڑتی ہیں یا دوسرے لفظوں میں تربیت کی ہیئت اجتماعیہ کے متعلق تین کام ہیں۔

پہلی تاثیر یا پہلا عمل حفظ ماضی ہے کیونکہ اگر تربیت نہوتی تو وہ تمام معلومات اور تجارب ضائع ہو جاتے ہیں جو اب تک انسان نے حاصل کیا ہے۔ تربیت ان معلومات اور تجارب کی تدوین کرتی اور ان کو ان ساری ترقیوں کے ساتھ جو روز جو بروز ہوتی جاتی ہیں ایک عہد سے دوسرے عہد کی جانب نقل کرتی جاتی ہے جس سے زمانہ کے ساتھ ساتھ ان معلومات اور تجارب کی کثرت ہوتی اور سعادت انسانی کا دائرہ اور

وسیع ہو جاتا ہے اس صورت میں گویا تربیت محافظ تمدن ہوئی جو اُس کے برباد و ضائع ہونے سے بچاتی ہے۔

دوسری تاثیر یا دوسرا عمل صیانتہ حاضر ہے اور یہ بات نفوس کی تہذیب و شائستگی اور ان کو قوانین کے اعزاز کی عادت سے حاصل ہوتی ہے جتنے بانیان سلطنت متمدنہ ہوئے ہیں ان سب نے یہی خیال کیا ہے کہ جب تک تعلیم عامہ نہیں ہوگی تب تک ان کی سلطنتیں باقی نہیں رہیں گی۔ واشنگٹن جو جمہوریت ولایت متحدہ امریکہ کا بانی ہے کہتا ہے "یہ ایک صاف بات ہے کہ ہماری آزادگی کا قیام قوم کے ہاتوں میں ہے اور قوم اس آزادی کو اسی وقت پر محفوظ رکھ سکے گی جبکہ پوری پوری تہذیب اور پوری پوری شایستگی پا چکی ہو"

اس امر کی دلیل کے لئے کہ تربیت اور شائستگی سے سلطنتیں محفوظ رہ سکتی ہیں اور یہی اس بارہ میں ایک اہم امر ہے۔ ہمکو تربیت کی اُس تاثیر پر نگاہیں ڈالنا لازم ہے جو وہ جرایم کے متعلق ڈالتی ہے اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ تربیت جرایم کی جانی دشمن ہے وجہ یہ کہ اولاً تربیت سے انسانی وجدان کمینہ خیالات سے پاک ہوتا ہے اور ارادہ میں ایک تقویت آجاتی ہے اور یہ تقویت یہاں تک پرزور ہوتی ہے کہ انسان اس کے ذریعہ اپنی تجارت پر غالب آتا ہے اور ہر اک کمینگی کو حقیر سمجھنے لگتا ہے۔ ثانیاً یہ کہ تربیت کے ذریعہ ایک موروثی مجرم کا قومی ہیئت میں ایک عضو نافع بنجانا ممکن ہے۔ ثالثاً یہ کہ تربیت سے وہ وسط یا محیط بالکل پاک اور ظاہر بنجاتا ہے کہ جسمیں لڑکا پرورش پاتا ہے اور اسطرح کوئی باطل شئے ہی پیروی کے لیے باقی نہیں ہوتی جس سے لڑکے کا

رذلیت کے جانب مائل ہونا متعذر ہو جاتا ہے

(۳) آیندہ کے لئے راہ ترقی کی تمہید۔ تربیت صرف ماضی ہی کو محفوظ نہیں رکھتی بلکہ ان امور کا بھی اس پر اضافہ کرتی ہے جو موجودہ زمانہ کی پیداوار ہیں اور یہ بات بعینہ ترقی ہے۔

دنیا کی روشن کے دو قدم ہیں ایک تقلید قدیم اور ایک استنباط جدید اور ان میں سے دوسرے امر کا وجود اسی وقت ہوتا ہے جبکہ پہلی شق کا عمل درآمد ہوتا ہے اور یہ علامت دیباچہ فلاح و بہبود ہے مگر وہ قوم جو صرف پر قدامت پر قایم ہو اور استنباط جدید نہ کرے وہ ایک قابل تنزل قوم ہوگی اس کا ایسے اقوام کے ساتھ دوش بدوش رفتار کرنا محال ہوگا جو علم اور مدنیت میں بہت آگے بڑھ چکے ہیں

جو لوگ امریکن یونیورسٹیوں سے کامیاب ہو کر نکلے ہیں دانشمندوں نے انکا اور پھر ان میں سے ایسے لائقوں کا شمار کیا جو کتاب مشاہیر امریکا کو زیب و زینت دینے کے قابل تھے تو انہیں فی چالیس میں سے ایک شخص اس طرح کا فاضل نظر آیا اور اس طرح کے جو لوگ اور یونیورسٹیوں سے نکلے ان میں فی دس ہزار ایک قابل ذکر آدمی نہ تھا۔

ثالثاً اس بحث کے نتائج عملیہ

(۱) تربیت سے قوم زندہ ہوتی ہے اور تعلیم اس کا اہم عمل ہے کہ اسی پر اس کی آیندہ قسمت کا دارومدار ہے۔

(۲) واجب ہے کہ مدرسہ کی صورت اس وسیع دنیا کا اسطرح ایک چھوٹا سا نمونہ ہو کہ طالب العلم کی حیات مدرسیہ اور حیات عملیہ میں کچھ بھی حد فاصل نہ رہے پھر یہ بھی ضرور ہے کہ نوجوانوں میں

باہمی تائید و مدد کی عادت پیدا کی جائے

(۳) قومی ہیئت کا یہ اقتضا نہیں ہے کہ اس کے افراد اپنی ذاتی فوائد کو قربان کر دیں بلکہ مصلحت عامہ اور شخصیہ دونوں یا یک دیگر رفیق ہیں کیونکہ ایک عضو کا فائدہ اسی طرح سارے جسم کا فائدہ ہوتا ہے جس طرح سارے جسم کے فائدہ سے ایک عضو کا فائدہ ہے

(۴) متعلم کے ذہن سے یہ بات فرو ہونی چاہئے کہ کتابیں صرف تجربہ شخصی کے قایم مقام ہیں اور اکثروں سے بے نیازی بھی نہیں ہو سکتی اس لئے صرف شاگردوں کے دماغوں میں اسمائے کثیرہ اور دور از کار باتوں کا بھر دینا کافی ہو گا۔

(۵) مدرسہ طالب علم کا گویا دوسرا گھر ہے اس لئے مدرسہ کا فرض ہے کہ وہ اس گھر کا قایم مقام ہو۔

(۶) مدرسہ کا فریضہ ہے کہ وہ طالب علم کو جماعت عامہ اور جماعت خاصہ کے مقتضیات کے مطابق طیار کرے یعنی ان دونوں اقتضاؤں میں سے جس امر کی ضرورت ہو اسی کے مطابق لڑکے کو تعلیم دے کیونکہ اقوام کی خواہشات اور ان کی مستعدی اور حاجتیں اُن کے طبائع اور حالتوں کے اختلاف کے مطابق ہیں۔ پس جیسی جیسی ضرورت ہو اسی لائق تعلیم و تربیت ہونی چاہئے۔

مورخ

دیہات کی زندگی

دیہات کی زندگی کا کیا کہنا۔ اس کے لطف کی کیفیت الفاظ کے ذریعہ سے بیان کرنا محال۔ اسکے دل رُبا مناظر قدرت کا خیال دلانا غیر ممکن اب کی برسات میں حسن اتفاق سے میرا جانا موضع گورہ ضلع بارہ بنکی بعد مدت مدید ہوا وہاں کی وہ دلکش تصویریں جو بچپن کے زمانے کی دیکھی ہوئی تھیں اور اب تک میری آنکھوں میں پھرتی تھیں مجھے اپنی طرف ایک قوت مقناطیسی سے کھینچ رہی تھیں۔ ہان دن ڈھلتے ہی شوق دید سے بے اختیار ہو کر چل کھڑا ہوا اور اب کہاں تھا موضع کے باہر اسی پیاری ندی کے کنارے جس سے ابھی تک رشتۂ الفت قایم تھا۔ ندی کے اُس کنارے پر جنگل کا ملاحظہ بھی موجود تھا۔ عرصہ تک آئینہ حیرت بنا دیا وہاں کی کیفیت بیخودی کے عالم میں دیکھتا رہا پرندوں کا سُریلی آوازوں میں چہچہانا عجیب دل آویز ہنگامہ بپا کیے ہوئے تھا اُسی روح پرور منظر سے متاثر ہو کر اس ہیچمیرز نے یہ نظم لکھی ڈھونڈا

نظم

دیہات کی میں اے دل اب ہوا کے صدقے ۔۔۔ کیا دلربا ہے منظر ارض و سما کے صدقے
اس خطۂ جہاں کی پیاری فضا کے صدقے ۔۔۔ اس کنج عافیت کے خلوت سرا کے صدقے
دن رات کے میں صدقے صبح و مسا کے صدقے

ہر شے ہے روح پرور، ہر چیز روح افزا آنکھوں کے سامنے ہی قدرت کا سارا نقشا
آیا نظر کہیں پر ہرگز نہ یہ تماشا کیونکر بتاؤں تم سے کیا کیا ہے میں نے دیکھا
پر اتنا کہہ رہا ہوں شانِ خدا کے صدقے

مانا کہ یاں نہیں ہیں ایوان چرخ رفعت ظاہر کریں جو ہیں اہل ہنر کی صنعت
مانا کہ یاں نہیں ہے شہر دہلی سی ثقافت گنجن نہیں برستا دولت کی یاں بدولت
پر میں ہوں دل سے یاں کے برگ و نوا کے صدقے

ہے شام شہر والے اب پارک جا رہے ہیں زندہ دلوں کا مجمع ہے۔ لوگ گا رہے ہیں
خود رو یہاں ہے سبزہ۔ گل کھلکھلا رہے ہیں جنگل میں بیٹھ کر ہم بھی منگل منا رہے ہیں
سو سو بناوٹیں ہیں سادی ادا کے صدقے

ہاں جا ہیں آپ شملہ جاتے ہیں آپ جائیں گرمی بہت ہے تو بھی منی کا لطف اٹھائیں
الموڑہ کے مناظر بھی جان و دل سے بھائیں ہم کو قسم جو یاں سے آگے قدم بڑھائیں
دل کی کلی کھلائی۔ باد صبا کے صدقے

بارش نے اس زمیں کو چھینٹا عجب دیا ہے جادو سا پھونک مارا افسوں کچھ کیا ہے
انبار لعل و گوہر اس نے اگل دیا ہے چھولوں نے چپے چپے پر قبضہ کر لیا ہے
گلہائے ناز بو کی رنگیں ادا کے صدقے

کیا لطف دے رہی ہے دریا کی بھی روانی کیا خوشنما ہیں لہریں کیا دلفریب پانی
ہم نے سنا ترانہ اس کی ابھی زبانی میٹھے سروں میں کچھ کچھ اور گنگنانی
اس خوشنوا و شیریں نغمہ سرا کے صدقے

تسبیح پڑھ رہی ہیں چھوٹے بڑے پرندے غافل نہیں ہیں ہم سے مخلوق یہ خدا کے
ہنگامہ واں بپا ہے موروں کی شور و غل ہے یاں پی کہاں پپیہا کس خوش نوا سے بیٹھے
کوئل میں تیری پیاری پیاری صدا کے صدقے

دلکش ہے دلربا ہے کھیتوں کی سبزی بھی
یہ لطف تخم ریزی وہ رنگ آب پاشی
ہر چیز اس جگہ کی ہے جان و دل کو بھاتی
دیکھوں تو کیا دکھائے اس خطہ کی جدائی
دیہات کی ہیں باسط آب و ہوا کے صدقے

باسط۔ بسوانی

وبائی امراض کا ایک تجربہ

یہ تحقیقات سے ثابت ہو چکا ہے کہ قوت خیال کا انسان کے تمام جسم پر اثر پڑتا ہے اس سے جسم انسانی میں حرارت اور سردی دونوں ہی پیدا ہیں یعنی جوش اور پژمردگی جب کبھی وبائی امراض کا دور دورہ ہوتا ہے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ دماغ کے پراگندہ ہونے کی حالت میں اموات واقع ہوتی ہیں مگر دماغ کی اچھی حالت میں رہنے سے کم موتیں ہوتی ہیں۔ بعض اوقات دیکھنے میں آتا ہے کہ محض خوف ہی انسان کو اس قدر جلد ہلاک کر دیتا ہے۔ جس قدر کہ جلد بجلی کے گرنے سے موت آتی ہے۔

مگر یہ صحیح خیال ہے کہ قوت خیال نہ کسی ہڈی کو توڑ سکے اور نہ کسی ہڈی کو جوڑ سکے تاہم یہ درست ہے کہ اس نے بہت سے لوگوں کی زندگی یا تو بچالی یا فنا کر دی اس طریقہ کے مطابق جس میں کہ انسانوں پر اس کا اثر پڑا یا تو خود مریض کی قوت ارادی پر اثر ڈالنے سے یا کسی ڈاکٹر یا نرس کے اثر پڑنے سے انسان کی قوت خیالی منتشر ہوئی اور اسکا مریض پر اسقدر برا یا بھلا اثر پڑا جو مریض کی موت یا زندگی کا باعث ہوا [illegible]

بیروت

ہمارے عزیز مولوی عبدالغفار صاحب الخیری جو آجکل بیروت میں مقیم ہیں وہاں کے مختصر حالات لکھ کر بھیجتے ہیں جو ہم شکریہ سے درج کرتے ہیں۔

یہ شہر بحیرۂ روم کے جنوبی ساحل پر واقع ہے اور جو اہمیت اسکو زمانہ سابق میں دمشق الشام کا ایک تجارتی بندرگاہ ہونے کی وجہ سے حاصل تھی اس سے کہیں زیادہ اب حاصل ہے۔ چونکہ یہاں سے مدینہ منورہ تک بذریعہ ریل برابر سفر ہو سکتا ہے اسوجہ سے علاوہ یورپین زائرین و سیاحوں کے کثیر تعداد حاجیوں کی بھی یہاں ہو کر جاتی ہے لہذا اس کے حالات ہدیہ ناظرین کرنا غالبًا دلچسپی سے خالی نہو گا۔

اس شہر کی قدامت کا پتہ بالکل نہیں چلتا اُن کتبوں سے جو مصر میں ۱۸۸۸ء میں دستیاب ہوئے ہیں صرف یہ معلوم ہوا ہے کہ مسیح سے ۱۴۸۰ سال قبل یہ شہر موجود تھا یہ وہ کتبے ہیں جو والیان بیروت اور شہزادگان سوریا نے شاہان مصر کو بھیجے تھے۔

(تام) سانکونیاتھن سے روایت کی جاتی ہے کہ دیوتا الیین نے جو جبل کا بادشاہ تھا اپنی بیوی مسماۃ بیروت کے نام پر اسکو بسایا دیہ ایک فینقی مورخ اور باشندہ بیروت کہا جاتا ہے۔ مگر اس کی تصدیق کسی قسم کی تحریر سے نہیں ہوتی۔ بعض کا خیال ہے کہ بیروت کا مخرج عبرانی لفظ بیاروتھ ہے جس کے معنی ہیں چاہات اور چونکہ

یہاں پہلے کنوئیں بکثرت تھے اس وجہ سے یہ قرین قیاس ہے۔

افسوس ہے کہ شہر قدیم کے موقع کا ٹھیک پتہ نہیں چلتا کہ کہاں تھا۔ ڈاکٹر رودیر جنھوں نے کھنڈرات کا بغور ملاحظہ کیا ہے اور اس کام میں امریکن ماہر ہیں شہر قدیم کا موقع شہر موجودہ سے تین چار میل جانب جنوب نہر غدیر کے قریب اُس سڑک پر جو صیدا کو جاتی ہے بیان کرتے ہیں کوئی ذریعہ ایسا نہیں کہ جس سے شہر قدیم کا صحیح صحیح حال معلوم ہوسکے۔

قریبًا سو برس کے بعد رامسیس دوم نے جس کی یادگاریں نہر الکلب پر موجود ہیں اس پر قبضہ کیا مسلمانوں نے دمشق پر ۶۳۵ء میں قبضہ کیا اور غالبًا یزید نے ۶۳۸ء میں بیروت کو سوریا میں ملالیا جو اس زمانہ میں والی شام تھا اور رفتہ رفتہ بلحاظ آبادی بھی یہ ایک اسلامی شہر ہوگیا اور خلفاء بنی امیہ اس کو دمشق کے واسطے نہایت لازمی بندرگاہ سمجھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ولید اول نے اس کی تعریف میں ایک نظم بھی لکھی تھی (مگر وہ مجکو نہیں ملی) زمانہ سلاطین فاطمیہ مصر ۹۰۹ء سے ۱۱۷۱ء تک) میں جنگ ہائے صلیب تک اُس پر اُن کا قبضہ رہا جس کے بعد سلجوقی ترکوں کا دور آیا جن سے جنگ ہائے صلیب وقتًا فوقتًا دو سو برس تک ہوتی رہیں اور بالآخر ۱۰۹۹ء میں بیت المقدس پر اور بقول مورخ صالح بن یحییٰ ۱۱۱۰ء میں بیروت پر نصاریٰ کا قبضہ ہوگیا اس قبضہ کا حال ولیم ٹائر یوں لکھتا ہے کہ بالڈون شاہ یوروشلیم نے بیروت پر زمین کی طرف سے اور برٹرم کاونٹ طرابلس الشام نے بحر کی طرف سے

حملہ کیا اور دو ماہ تک شہر کا محاصرہ رہا جو ۱۸ - اپریل ۱۱۱۰ء کو فتح ہو گیا مگر یہ مورخ شروع محاصرہ ۱۱۰۸ء میں بتاتا ہے جو صالح بن یحییٰ کے بیان سے مطابق ہے اس وجہ سے صحیح معلوم ہوتا ہے فتح کے بعد نصارے نے شہر میں قتل عام شروع کیا اور مظالم کی کوئی حد نہ چھوڑی۔ ان کا قبضہ بیروت اور کل سوریا پر ۱۱۸۷ء تک رہا اور چونکہ مسلمان دمشق اور لبنان میں قابض وموجود رہے۔ لہذا برابر چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوتی رہیں۔ اسی ۱۱۸۷ء میں سلطان صلاح الدین ایوبی مصر کے تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوا اور تمام سوریا پر ایک عظیم الشان فتح حاصل کی اور یوروشلیم اور کل سوریا پر قابض ہو گیا اسی کے زمانہ میں جنگ ہائے صلیبی کا زور ہوا اور شاہ انگلستان رچرڈ شیر دل سے مقابلہ ہوا جس پر ہر جنگی قابلیت اور شجاعت میں سلطان فایق ثابت ہوا۔ سلطان کی بے موقع اور بے وقت موت سے شیرازہ سلطنت بکھر گیا اور ۱۱۹۷ء میں نصارے نے سوریا پر قبضہ کر لیا اور پچاس برس تک قابض رہے۔

۱۲۵۰ء میں مصر پر سلاطین مملوک کا قبضہ ہوا جو رفتہ رفتہ سوریا میں پھر حکومت پھیلانے لگے۔ آخرش اسی خاندان کے ایک سلطان بیبرس نے (زمانہ سلطنت ۱۲۶۰ - ۱۲۸۸ء) ساحل کے نئے شہروں پر قبضہ کر لیا اور اس کے جانشین نے طرابلس الشام کو لے لیا اور باہمی یہ شرط قرار پائی کہ جبل اور بیروت پر نصارے کا قبضہ زیر سیادت سلطانی رہے گا سنہ ۱۲۹۱ء میں سلطان الملک

نے ان دونو مقامات کو بھی لیکر حکومت نصارے کا اس ملک میں خاتمہ کر دیا اور اس کے جنرل سنجر نے بیروت کے استحکامات بالکل نیست و نابود کر دئے تاکہ نصارے اگر کوشش کریں تو قابض نہ ہوسکیں

(ترک) السلطان الغازی سلیم اوّل کے زمانہ میں جب ترکوں نے مصر کا الحاق کیا تو ۱۵۱۶ء میں بیروت کو بھی لے لیا - چونکہ اس شہر پر مصائب کا تانتا بندھا رہا لہذا بقول مؤلف مشاہد الممالک ۱۸۴۰ء میں بھی پچیس ہزار سے زیادہ آبادی نہوئی - مگر اس صدی کے دوسرے نصف میں ایک لاکھ بیس ہزار کے قریب ہوگئی جس کی تفصیل حسب مؤلف مذکور حسب ذیل ہے

مسلمان	۳۷۵۰۰	ارمن کیتھولک	۴۰۰
یہود	۲۰۰	الموارنہ	۴۹۰۰۰
دروز	۵۰۰	رومن کیتھولک	۹۰۰۰
ارتھوڈکس	۳۶۵۰۰	پراٹسٹنٹ	۲۰۰۰
سریان کیتھولک	۲۷۰۰۰	لاتینی	۱۸۰۰
متاولہ	۲۰۰	ارمن ارتھوڈکس	۳۰۰
مسلمان	۳۷۵۰۰		۴۲۵۰۰
نصارے	۷۹۷۰۰		

افسوس یہ ہے کہ شہر قدیم کا کوئی نشان تک نہیں ملتا نہ کوئی محراب ہے نہ دروازہ نہ دیوار ہاں کہیں کہیں اس قسم کے پتھر پڑے ہوئے ملجاتے ہیں جن پر عبارات عبرانی تحریر ہوتی ہیں

کہیں کہیں زمین کی کھدائی کے وقت پرانے زمانہ کی مورتیں مٹی کے
برتن وغیرہ ملجاتے ہیں مگر ان چیزوں کے واسطے کوئی حدود محدود
نہیں چنانچہ موجودہ شہر میں اکثر مکانات کی بنیاد کھودتے وقت
پتھر کے تابوت زمانہ قدیم کے چراغ اور اسی قسم کی دوسری اشیا
ملتی ہیں گو ماہرین نے چپہ چپہ زمین چھان ماری مگر ایک رائے شہر قدیم
کے واسطے نہ کر سکے بلکہ ہر اک نے جو موقع تجویز کیا اُس کو خود ہی مشتبہ
بھی کر دیا ہے ؎

(مشہور اشخاص) زمانۂ قدیم کے مشہور اشخاص کا بھی کچھ پتہ نہ لگا
مگر آٹھویں صدی عیسوی میں جب بیروت پر اسلامی پرچم لہرایا
تو حضرت امام عبدالرحمان بن عمر جو امام اوزاعی کے نام سے مشہور
ہوئے اپنے مولد بعلبک سے یہاں تشریف لائے اور اپنے اصولوں
کی اشاعت میں مصروف ہوئے اس ملک میں آپ کے پیروؤں کا زور
دو سو سال تک رہا اور کہا جاتا ہے کہ اسپین کے عرب آپ ہی
کے پیرو تھے آپ کا صحیح سن پیدائش معلوم نہیں ۸۸ھ یا ۹۳ھ
میں بعلبک میں پیدا ہوئے ۱۵۷ھ میں بیروت میں وفات پائی
آپ کا مزار بیروت سے جانب جنوب دو یا تین میل کے فاصلہ
پر بحیرہ روم کے مشرقی ساحل پر ایک موضع میں ہے۔

اب الوزاعی کے نام سے مشہور ہے۔ گاؤں کا تو اب نام
ہے اب صرف آپ کا مزار ہے جس کے چاروں طرف دو منزلہ
مکانیت ہے جس میں اکثر اہل بیروت بطریق سیر وہاں جاکر
ٹھیر جاتے ہیں۔

صرف ایک مکان میں وہاں کے خادم رہتے ہیں جو کہ مقیم کہے جاتے ہیں۔ جن کی تنخواہ حکومت کی طرف سے مقرر ہے یہ مقام لبنان کے حلقہ میں واقع ہے اس کے قریب کوئی آبادی نہیں ہے مگر موقع خوش منظر ضرور ہے

ایک طرف بحیرہ روم کا پرلطف نظارہ دوسری طرف دور تک کھیتوں جنگلوں کا منظر بہت بھلا معلوم ہوتا ہے اور ان پر سے نکل کر نگاہ سامنے پہاڑوں سے ٹکراتی ہے جن پر بستیوں کے مکانات دھوپ میں چمک دار دور سے دیکھنے والوں کو نہایت لطف دیتے ہیں مگر افسوس ہے کہ سوائے اندرون مسجد و مقبرہ کے جو ایک گنبد کے اندر ہیں صفائی بے حد خراب ہے

امام صاحب کا مزار پچھلے حصہ میں ہے اور مسجد اگلے حصہ میں۔ مسجد کی جنوبی دیوار یعنی دیوار قبلہ رخ میں عزبی کونہ میں مزار پر جانے کا دروازہ ہے۔

قالین وغیرہ زائرین کے بیٹھ کر ذکر کرنے کے واسطے بچھے ہوئے ہیں مگر یہاں نہ چراغی ہے نہ کوئی مبلہ لیتا ہے حالانکہ آپ کے پیرداب بھی بہت ہیں۔

باقی آیندہ شہر جدید کا ہم مفصل حال اور لوگوں کی حالت انشاء اللہ تحریر کریں گے۔

محمد عبدالغفار الخیری

فلسفہ محبت

کیسے خوش نصیب تھے وہ لوگ جن کی ولادت پر زمانہ نے رنگ رلیاں منائیں۔ بچپن گلہائے رنگین کے گجرے ہاتھوں میں لئے آگے بڑھا۔ جوانی سدا بہار پھولوں سے آراستہ و پیراستہ پاؤں چومنے آئی۔ دنیا نے سر پر تاج شاہی رکھے۔ زندگی نے اُن کو خلعت جاودانی پہنائے اور قوت نے اُن کی شہرت کا ڈنکا چار دانگ عالم میں بجا دیا

عزیزو! انصاف کی آنکھ سے دیکھنا اور داد دینا بیسویں صدی عیسوی نے گھنٹے کی سوئیاں چار سو برس پیچھے ہٹا دیں ہندوستان تمدن جدید سے قطعی ناآشنا ہے۔ تار بجلی ہوا پانی۔ قبضہ انسانی سے باہر ہیں۔ شاہی محلسرا میں بھی دو کوڑی کا لال یعنی مٹی کا چراغ جل رہا ہے۔ مگر اطمینان کا مینہ خلق خدا کے چہرے پر برس رہا ہے اور اپنی حالت میں مگن رہنے والے وطن پرست روکھی سوکھی روٹی کو پلاؤ کی رکابی سمجھ رہے ہیں۔

بہار کا موسم در و دیوار سے ٹپک رہا ہے زندگی بہشت اور زندگی والے فلک ہفتم کی سیر کر رہے ہیں فارغ البالی اُن کے سروں پر چنور اور بے فکری ان کی اطمینان کی قسم کھا رہی ہے۔

خلوص کا فرشتہ باآواز بلند پکار رہا ہے کہ دنیا والو
چشم تامل سے دیکھو یہ تعلقات خواب وخیال ہو جائیں گے
زمانہ سرعت کے پروں سے اُڑا جا رہا ہے اور بھاگا آرہا ہے
وہ وقت جب آنکھ اور کان اس منظر کو ترس جائیں گے

بیسویں صدی کے بسنے والو! دیکھو دیکھو! غور سے
دیکھو! ان آنکھوں کو دیکھو محبت کے سرمہ سے رنگین ہیں! ان
دلوں کو دیکھو! صفائی کے پھول مہک رہے ہیں۔

دوست وضع کے پابند۔ عزیز عزیزوں کے شیدا بھائی
بھائی کے عاشق بہنیں بہنوں کی فریفتہ

ہر زمانہ کا لٹریچر اس وقت کے طرز تمدن کا آئینہ
ہوتا ہے۔ ان دنوں کے بھائی بہن دیکھو۔ ان لوگوں
کی باتیں سنو دل خون کے آنسو روئیگا اور یہ لوگ
نظر نہ آئیں گے

بھائی کے ہاں بچہ ہوا بہن پردیس سے دوڑی
آئی خوشی کے مارے باغ باغ ہے۔ اور کس محبت کہ رہی
ہے۔

ہیرن بھتیا ہیں تیری ماں کی جائی

آج بہنیں اور بھائی سب ہیں مگر یہ آوازیں کان میں
نہیں آتیں کیا تھا وہ تمدن کہ بہن بھائیوں کے حق ان کا
ننگ ہوگی سب سے مقدم تھا۔ لڑتی تھیں اور لیتی تھیں
جھگڑتی تھیں اور پاتی تھیں۔ گو ہنسی کی طرح سونے

جھونے ہیں لدنے والیاں بیسیوں پٹر نا تقد پھیلا رہی ہیں۔ اُن دینے والوں کو دیکھو خوشامد کر رہے ہیں اور دے رہے ہیں۔ حیاتِ انسانی ان دلوں پر زر و جواہر تصدق کر رہی ہے۔ زمانہ نے عالم موجودات کے ہر عیش کو ان کا گرویدہ بنا دیا۔ حقیقی مسرت کی دیویاں ان کے آگے دست بستہ کھڑی ہیں اور آسمان ان پر فرحت و انبساط کے پھول برسا رہا ہے۔

فلسفہ محبت کا اصلی راز یوں کھلتا ہے۔ کہتی ہے

میں بھنبھا سُن کر آئی
بیرن بھیا ہیں تیری ماں کی جائی

یہ سنکر کہ خدا نے یہ دن دکھایا کہ بھائی کے ہاں لال ہوا۔ دل قابو میں نہ رہا اس خوشی میں شریک ہونے کو اتنی دور سے آئی۔!

واہ محبت کے پتلو تم ہمکو انسانیت کے معنی بتا گئے اور مر کر ایسے گراں بہا لال چھوڑ گئے جو اب عالم کو جگمگا رہے ہیں۔

دعا ملاحظہ ہو کس دل سے نکلی ہے ایسے دل سے جو موتی کی طرح چمکتا اور کندن کی طرح دمکتا تھا جو کھوٹ سے پاک اور خود غرضی سے صاف تھا۔

باگوں میں جیسے آم پھلے رے

ایسے پھلے مورا بھائی

اے عصمت کی دیوی تیرے پہلو میں وہ دل ہے
کہ آنے والی نسلیں اس کو ڈھونڈیں گی اور نہ پائیں گی۔
باپ بھائی کی لاج رکھنے والی بیٹی دنیا کتنے ہی
پلٹے کھائے مگر تیرا خلوص صفحۂ ہستی سے فراموش نہ ہوگا
موت تجھکو ظاہری آنکھوں سے اوجھل کردے لیکن اس
وقت بھی جب زمانہ نئے نئے رنگ بدل کر انوکھے سانچے
ڈھالے گا۔ تحقیق تیرے قدردان پیدا کرے گی اور
چشم بینا وقعت کا چراغ لے کر تجھ کو ڈھونڈے گی در تمدن
جدید کے فدائی تیری قبر پر سدا بہار پھول چڑھائینگے

رسالہ مکمل ہو چکا تھا کہ علامہ شبلی نعمانی کی بعض نظمیں جنکی اشاعت
رد کردی گئی بدلنی اور نکالنی پڑیں اسی سلسلہ میں صفحہ ۳۱ و
۳۲-۱ دوبارا شائع ہوا

تمدن

دُنیا کی بربادی

جرمنی کا نہایت نامآور محقق علم الحیوٰۃ وطبیعات پروفیسر ارنسٹ ہیکل اپنی ایک کتاب میں دنیا کی بربادی کی بابت

کشش ثقل سے بربادی کا اندیشہ

لکھتا ہے :-

ہماری زمین جو کروڑوں برس پیشتر نظام شمسی کے اجزا کا ایک ٹکڑا تھی لاکھوں برسوں کے بعد سرد ہو جائے گی ۔ حیات بخش عنصر زائل ہو جائیگا رفتہ رفتہ اسکا محور بھی چھوٹا اور محدود ہوتا چلا جائے گا اور بالآخر وہ سطح آفتاب پر جا پڑے گی ۔ اور جھلکر بھسم بھسم ہو جائے گی اور دخان خلائی کے ساتھ جا ملیگی ۔

---

۵ رڈل آف یونیورس ص [illegible]

یورپ کے کئی عالم[1] کہتے ہیں کہ شمس سے بہت سے شہاب ثاقب سطح آفتاب پر ہزاروں کی تعداد میں گرتے رہتے ہیں جس سے حرارت شمسی کا ذخیرہ قایم رہتا ہے۔

بربادی کی بابت توہمات

دنیا کی بربادی کی بابت عوام میں طرح طرح کے توہمات اور اختلافات مختلف وقتوں میں رائج ہوتے رہے۔ ۱۸۹۹ء کے شروع میں مارچ کی کسی تاریخ کو دنیا کی بربادی کی پیشین گوئی ہوئی تھی۔ پھر تین چار برس بعد اسی قسم کی افواہ اُڑی تھی۔ اور ۱۹۰۸ء میں بھی مشہور ہوئی۔ جس سے جہلا اور ضعیف الاعتقاد لوگ بہت خائف ہوئے تھے۔ ایسا بیسیوں مرتبہ ہوا۔ یورپ میں بھی مختلف وقتوں میں عجیب اندیشہ ناک توہمات پھیل چکے ہیں۔ جب ۱۰۰۰ء شروع ہونے کو تھا تو عام خیال ہوا کہ دنیا برباد ہو جائے گی۔ جرمنی اور فرانس کے کمزور دل جمہور نے کاشتکاری اور کاروبار چھوڑ دیا۔ تجارت برہم اور زراعت برباد ہوئی۔ اس سے قحط اور گرانی نازل ہوئی۔ فرمانرواؤں نے فرماں روائی سے ہاتھ اٹھا لیا اور خانقاہوں اور سنسان گوشوں میں جا کر یادِ الٰہی اور توبہ و استغفار میں مصروف ہو گئے۔

کاربانک ایسڈ گیس

ارباب تحقیق و تجسس کا یہ خیال ہے کہ کرہ ہوا میں کاربانک ایسڈ کا ذخیرہ دن بدن بڑھتا ہے۔ اور آکسیجن کا جزو گھٹتا جاتا ہے۔ ایک ایسا وقت آئے گا کہ تمام کرہ ہوا بھاری ہونے کے سبب سے ہم پر آگرے گا اور ہم دب کر اور

[1] ہیلمہولٹس ان ہیلمنگ[illegible] (مصنف)

نیز دم گھٹنے سے مر جائیں گے۔ مشہور پروفیسر سائمن نیو کم نے جو احتمال دنیا کی بربادی کی بابت ظاہر کیا ہے وہ قابل غور ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آفتاب مع سیارگان بجھسترویگہ کی طرف جا رہا ہے۔ اثنائے راہ میں کسی نامعلوم ستارہ سے ٹکرانے کا امکان ہے۔

فلکی احتمال

ہوسکتا ہے کہ یہ کوئی کالا تارا ہو جسکے وجود سے عالمان فلکیات بے خبر ہوں۔ اگر خدانخواستہ ایسا تصادم ہوا تو یہ بالکل بے نظیر اور نہایت خوفناک ہوگا۔ نظام شمسی کے کئی ارکین چشم زدن میں تحس نحس ہو جائیں گے۔ اسکا صرف احتمال ہے مگر لازم نہیں ممکن ہے کہ آفتاب کا محور ہو۔ یا کسی اور نامعلوم سبب سے ویگہ تک پہنچنے سے باز رہے۔

حرارت شمسی کا خاتمہ دنیا کی بربادی کا پیش خیمہ ہے

چہارم صدی پیشتر کے علما کا ایک گروہ یہ مانتا تھا کہ آفتاب جلد جلد ٹھنڈا ہوتا جاتا ہے اور اسکا حجم سکڑتا جاتا ہے۔ ہیلم ہولٹس۔ ایک نہایت مشہور جرمن عالم طبیعات کا اندازہ یہ ہے کہ ستر اسی لاکھ سالوں میں حرارت ختم ہو جائے گی اور نظام شمسی کے باقی ارکین اس سے متاثر ہونگے۔ ان کی حرارت بھی ختم ہو جائے گی۔ اور وہ خود بخود سرد اور مردہ ہو جائیں گے۔ اسکا ذکر آگے آئیگا۔

پروفیسر کلفرڈ ایک بہت نامور عالم تھے۔ آپ نے بعض ضروری مسائل پر خاص مضامین لکھے ہیں۔ ان میں سے ایک دنیا کی بربادی کے لئے بھی وقف کیا گیا تھا جسکا اقتباس حسب ذیل ہے۔

سلہ ماخوذ از بارسن۔ ع ہسٹری آف دی ... جلد ۵ ... ملفوظات عقلیہ ... مسٹر ... بیلبی

اس کرۂ ارض کی نباتاتی اور حیوانی زندگی کا دار و مدار حرارت شمسی پر ہے۔ سورج کی جسامت فرسودہ ہو رہی ہے۔ اور اخراج حرارت سے سکڑتا جاتا ہے۔ اسی عمل انقباض سے اس حرارت کا ایک حصہ پورا ہوتا رہتا ہے۔ مگر یہ حالت ہمیشہ تک نہیں رہے گی۔ جب آنرجی (شکتی یا قوت) کا خزانہ ختم ہو جائے گا تو حرارت یہاں تک نہیں پہنچ سکے گی۔ اور اگر اس اثنا میں کرۂ ارض آفتاب کے گرد گھومتا رہے تو کثرت برودت اور قلت حرارت سے ہم اکڑ کر مر جائیں گے۔ یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ سورج آگے کو بڑھ رہا ہے۔ اگر اسکی کشش سے زمین اس کی سطح پر جا پڑے تو ہم کباب ہو جائیں گے۔ اگر آفتاب کی کشش زمین کو متاثر کرنا چھوڑ دے۔ اور وہ خلا کے کسی دوسرے حصہ کو چلا جائے تو ہم گرمی نہ پہنچنے سے مر جائیں گے۔ ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ کیا حشر ہو گا مگر ان دونوں باتوں میں سے ایک ہو کر رہے گی۔

اگر عالم بالا کے تمام اجرام و اجسام کو لیا جائے اور ان کے آخری حشر پر غور کیا جائے تو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کشش سے ایک جگہ جمع ہو جائیں گے اور وہاں سے گرمی کی رو نکلکر چاروں طرف خلا میں پھیلتی رہے۔ آخر کار وہ ذخیرہ ہولناک سرد و خشک ہو جائیگا اور جو روئیدگی یا جاندار کسی سیارہ میں ہیں وہ کثرت برودت سے اینٹھ کر ہلاک ہو جائیں گے۔

پروفیسر فلےمریان۔ پروفیسر کمل فلےمریان فرانس کے ایک نہایت مشہور عالم فلکیات ہیں۔ ان کی رائے آجکل کے اہل تحقیق اور طبیعات

ؔ منقول از ہارمس ورتھ ہسٹری آف دی ورلڈ جلد ہ صفحہ ۳۵ - ۴۴۳۶ +

کا آئینہ ہے۔ اس واسطے اسے قدرے وضاحت کے ساتھ درج کیا جاتا ہے۔

کرۂ ارض فانی ہے۔ نہ ازل سے تھی اور نہ ابد تک رہے گی۔ ایک روز وجود میں آئی۔ کسی دوسرے روز اسے نابود بھی ہونا پڑے گا۔ ایک طرف پانی کی مقدار اور ہوا کے آکسیجن کا جزو گھٹ رہا ہے۔ دوسری طرف براعظم اور پہاڑ فرسودہ ہو کر سمندر میں ملتے جاتے ہیں۔ کیا یہ دنیا پانی کے بے تھاہ گڑھے میں غرق ہو گی؟ یا پانی کی قلت سے اسکی بربادی ہونے والی ہے؟ کرۂ ارض کی حرارت اور جانداروں کی جان پانی سے قایم ہے۔ اگر یہ معدوم ہو جائے تو روئیدگی خشک۔ اور حیوانات بے جان۔ قدرت کا کارخانہ درہم برہم ہو جائے۔ اگر سمندر خشکی پر حملہ کرے تو بھی نباتات اور جانداروں کی سلامتی نہیں ہے۔ بنی آدم نہنگ آبی کا لقمہ بنیں گے۔

پانی کی قلت سے بربادی کا خدشہ

مریخ زمنگل) اس دنیا سے پرانا اور چھوٹا ہے۔ اور ارتقا کے تمام مرحلوں سے گزر گیا ہے۔ اسکا بڑھاپا شروع ہے بڑے بڑے سمندر غائب ہو گئے ہیں۔ ان کی جگہ دلدلی روئیدگی موجود ہے۔ اسکی ہوا لطیف اور ہلکی ہے۔ بارش نہیں ہوتی۔ مطلع صاف رہتا ہے۔ پانی کی مقدار روز بروز کم ہوتی جاتی ہے[۵]۔ بعینہٖ کسی زمانہ میں ہمارا بھی یہی حشر ہو گا۔ کائنات سے وہ عنصر اعظم مفقود ہو جائے گا جس سے اسکا کاروبار جاری اور اشیائے ذی روح قایم ہیں۔ جانداروں کے جسم میں پانی جزو لازمی ہے۔ انسان کے بدن میں ستر

۵ پروفیسر لوول ماخوذ از رومینس آف دی ماڈرن اسٹرانومی" مصنفہ ہکٹر میکفرسن صفحہ ۲۳۰

فیصدی ہے۔ اسی سے زندگی قایم رہتی ہے ہستیوں کے وجود اور نمو
کے لئے جو حرارت درکار ہوتی ہے وہ اسی سے پیدا ہوتی ہے۔ پس جب
پانی نہ رہے گا تو ہماری زندگی محال ہوگی۔ پانی ہی سے موجودات برباد نہ ہونگی
بلکہ اسکی قلت سے جو اثر کرۂ ہوا پر ہوگا وہ بھی اس بربادی میں شریک ہوگا
اس کی مقدار خواہ کتنی کم کیوں نہ ہو مگر وہ ضروریات سے ہے۔ آکسیجن
اور نائٹروجن کے دو سو ذرّوں میں ایک بھی آبی ذرہ نہیں ہے۔ تاہم
اسکی انرجی ان دو سو ذرّوں سے اسی گنا زیادہ ہوتی ہے۔

یہ ننھے ننھے ذرّے کرۂ ہوا میں سورج کی کرنوں کو مرکوز کر لیتے ہیں۔
اور اسے کرۂ ہوا کے نچلے حصّوں میں روکے رکھتے ہیں۔ لیکن جب
بخارات کا یہ ہلکا سا پردہ اڑ جائے گا تو کیا ہوگا۔

زمین کا درجہ حرارت صفر سے کہیں نیچے ہوگا۔ جاندار سردی سے

برودت کی کثرت سے ہلاکت کا خوف

اکڑ کر مرجائیں گے۔ پہاڑوں کی چوٹیوں سے برف کے تودے
لڑھک کر وادیوں میں پھیل جائیں گے۔ زندگی اور تمدنی سامان راحت
برباد ہو جائیں گے۔ نیو یارک۔ لندن۔ پیرس۔ برلن۔ وآنا۔ روم۔ قسطنطنیہ
کلکتہ۔ پیکن۔ ٹوکیو دائمی برف کے نیچے مفقود الوجود ہو جائیں گے۔ پھول
پھل۔ نباتات۔ حیوانات۔ اور تمام موجودات معدوم ہو جائیں گی۔ دریا اور
سمندر ناپید ہو جائیں گے۔ انسان کا آخری قائم مقام کسی گرم ملک کے
سمندر کے کنارہ پر بیٹھ کر جان دیتا نظر آئے گا۔ اسوقت سطح زمین کا ٹمپریچر
[illegible] صفر سے نیچے ہوگا۔ ہوا میں آکسیجن اور نائٹروجن کا عنصر بھی
[illegible] گھٹتا جاتا ہے [illegible] فیصدی کے اندر کرۂ ہوا کے ان اجزا میں [illegible]

تخفیف ہوجاتی ہے جس سے جانداروں کی زندگی قایم رہتی ہے۔ دس لاکھ برس کے بعد زمین کا ایک بڑا حصہ فرسودہ بنجر اور سنسان ہوگا۔ اسکے نہایت شاندار ماضی کے کھنڈر اسکی سطح پر نظر آئینگے۔

(۶) دنیا کی بربادی کے خلاف احتمال

جیسا پہلے مذکور ہوا ہے۔ علمار کا بڑا حصہ دنیا کی بربادی کا بڑا سبب مخزن حرارت کا عدم قرار دیتا ہے۔ مگر اسکے برعکس آج کل کے علمائے فلسفہ کائنات اس احتمال کو محال ٹھیراتے ہیں جب سے ریڈیم اور اسکی ماہیت کے باب میں نئی نئی باتیں معلوم ہورہی ہیں۔ اہل تحقیق نے یہ رائے قایم کی ہے کہ زمین پر ریڈیم مادہ بکثرت موجود ہے جس سے اسکا ذخیرۂ حرارت عرصہ دراز تک قایم رہے گا۔

مخزن حرارت غیر متناہی ہے

جتنی حرارت زمین سے نکلتی ہے اتنی ریڈیم کے ذخیرہ سے نکلکر کوتاہی پوری ہوجاتی ہے۔ ریڈیم کا وجود دیگر اجرام خلا میں بھی مانا گیا ہے۔ محققان طبیعات فلکی نے تازہ انکشافات کی روشنی میں یہ نظریہ قایم کیا ہے کہ سورج کی حرارت موجودہ شرح خرچ سے تین کروڑ سال تک ختم نہ ہوگی۔ اس واسطے کم از کم تین کروڑ برس تک کرۂ ارض ہلاکت و بربادی سے مامون ہے۔ اُسوقت تک ہمیں بربادی کا کوئی خوف نہیں ہوسکتا اور نہ ہونا چاہئے ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہم چالیس۔ پچاس۔ ساٹھ حد سو سال تک یہاں زندہ رہکر اگلی دنیا کو چلدینگے۔ جہاں دنیا اور مافیہا

ھ ماخوذ از ہارمس ورلڈ ہسٹری آف دی ورلڈ۔ ضمیمہ ملاحظہ ہو صفحہ ۴۲-۴۳-۴۴-۴۴

کی بربادی کا خرخشہ ہرگز نہیں ستا سکتا۔ علاوہ ازیں ہم مانتے ہیں کہ روح کو بقائے دوام لاحق ہے۔ اگر ہم اس خاکی بدن کو چھوڑ دیں گے اور اس سے رہائی پاتے ہی اس دنیائے فانی سے بھی منہ موڑ لینگے تو ہم پھر ایک ایسے خطہ میں داخل ہونگے جہاں کی ہر شئے اس سے بالکل نرالی ہے۔ وہاں ہم اس جہان کے تمام بکھیڑوں سے بالاتر ہوں گے۔ مرنے کا خوف بالکل نہ ستائیگا۔

علمان فلکیات کا ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ آفتاب اور زمین پرانے اور کہن سال نہیں ہیں جیسا کہ کچھ عرصہ سے تصور ہوتا رہا ہے۔ یہ ہنوز لڑکپن کی حالت میں ہیں۔ ازلیت کے سال کا ابھی چوتھا حصہ بھی نہیں گزرا ہے۔ انسان بھی ایک قلیل عرصہ سے اس سیارہ پر نمودار ہوا ہے۔

عالمان طبیعات کا یہ خیال ہے کہ عقل انسانی اُس ہولناک سانحہ کا انسداد نہیں کرسکتی جو دنیا کی بربادی کے متعلق ہے۔ کیونکہ یہ مغز کے اجزائے ترکیبی کا نتیجہ ہے۔ مظاہر فطری سے اسکا کوئی سروکار نہیں ہے۔ اس خیال کے بڑے حامی پروفیسر ہکسلے اور جرمن محقق ناؤڈسلے وغیرہ ہیں۔ لیپزگ کا ایک اور مشہور جرمن عالم ووندٹ Wundt کا یہ خیال ہے عقل و مادہ دماغ کے اجزائے طبعی اور ذہن کے عناصر روحی سے منتج ہیں۔ ان دونوں کا عمل دائر متوازی خطوط میں نمایاں ہوتا ہے اور ایک دوسرے سے بالکل مختلف رہتے ہیں۔ عالم موصوف کے اس انوکھے نظریہ کی تطبیق واقعات تجربیہ سے نہیں ہوسکتی۔ انسان کی روحانی تاریخ بھی اسکے خلاف ہے۔ انسان کو اپنے ارادوں اور خواہشوں کا پورا علم ہوتا ہے وہ ذی شعور ہستی ہے۔ مادہ پرستا اور تا ئدلست Idealism کو چاہیئے اور باتوں سے

انکار کریں مگر اسکا اقرار لازم ہے کہ ارادہ اور مقصد ہمارے اندر موجود ہے۔ ایک عجیب قوت ہماری ذات میں پنہاں ہے جس سے سب تمنائیں پیدا ہوتی ہیں اور جسے ہماری تمام حرکتوں اور فعلوں کا علم ہے۔ ہم خدا پرست اس قوت کو اسکی بے حد غیبی طاقت کا ایک ریزہ سمجھتے ہیں جس کے وسیلہ سے انسان اور خدا کے درمیان رفاقت کا احساس قایم ہوسکتا ہے۔ اس قوت ارادی یعنی روحانی طاقت میں عجیب راز بند ہیں۔ جب ان کے انکشاف اور عمل کا اسے موقع ملتا ہے تو وہ زور پکڑتی ہے اور اس سے عجیب و غریب افعال سرزد ہوتے ہیں۔ بعض فقیروں اور یوگیوں میں یہ قوت پائی جاتی ہے جسکے اظہار کا ہمارے ناظرین کو کبھی نہ کبھی ضرور تجربہ ہوا ہوگا۔ انسان اس قوت کو درجۂ کمال پر پہنچاکر جناب باری کی عینی حضوری حاصل کرسکتا ہے اور حوادث کو روک سکتا ہے راقم مضمون کا یہ محض گمان ہی نہیں ہے بلکہ سائینس والے بھی اس سے اتفاق کرتے ہیں۔ پروفیسر ہکسلے نے ایک جگہ لکھا ہے :

انسان کے اندر انرجی کا ایک ایسا ذخیرہ ہے جسکا عمل و اظہار معلوم و محسوس طریقہ سے ہوتا رہتا ہے اور جو انرجی عالم کے اندر موجود ہے وہ ہماری معنوی انرجی سے اس قدر مشابہ ہے کہ اس سے عمل فطری Cosmic Process اور قانون طبعی متوثر ہوسکتا ہے۔

اب کیا فرق ہے؟ انسان کی اصل روحانی طاقت اور قوت یزدانی میں اپنے جوہر اصلیہ میں ایک دوسرے سے مطابق ہیں۔ سمندر میں سے ایک لوٹا پانی لو۔ اسکے اندر وہی خواص اور اجزا قایم رہتے ہیں۔ جو سارے سمندر میں پائے جاتے ہیں۔

لارڈ میکالے

زندگی مشہور لوگوں کی سبق دیتی ہے یہ
شاندار خود ہم بنا سکتے ہیں اپنی زندگی

مذکورہ بالا شعر امریکہ کے مشہور و معروف فصیح البیان شاعر لانگ فیلو کے "ترانہ حیات" سے لیا گیا ہے۔ اس نظم میں شاعر یہ کہتا ہے کہ دنیا میں انسان کو مہلت کم ہے اور کام زیادہ ہیں۔ اسلئے اُسے چاہیئے کہ وہ اپنی عمر سستی میں بسر نہ کرے۔ اسکے بعد وہ کہتا ہے کہ اس دنیا میں ایسے ہزارہا شخص گزرے ہیں جن کے کارنامے لوح جہاں پر کندہ ہیں اور کتنے ہی روشن نام ایسے ہیں جو اوراق دہر پر سونے کے حرفوں کی طرح چمک رہے ہیں۔ اسلئے اگر تم اپنا نام پیدا کرنا چاہتے ہو یا اپنی یہ زندگی شاندار بنانا چاہتے ہو تو ان ہی لوگوں کے نقش قدم پر چلو۔ کیونکہ اسی صورت میں تمہیں کامیابی کی امید رکھنی چاہیئے۔

لہذا ہر شخص کو مشاہیر عالم کی سبق آمیز زندگی سے مستفید کرنے کے لیئے "تمدن" میں ایک سلسلہ مضامین شروع کرتے ہیں اور وقتاً فوقتاً بزرگ اشخاص کے مفید حالات ہدیۂ ناظرین کرتے رہیں گے۔ یہ حالات کسی ایک قوم، ایک فرقہ یا ایک ملک سے متعلق نہ ہونگے۔ بلکہ جہاں اہل ہنود کے مشاہیر کا ذکر کیا جائے گا۔ وہاں قدیم یونان و روما کے بزرگ ترین اصحاب کی زندگیاں بھی پیش کی جائیں گی۔ اسی طرح مشاہیر اسلام کے ساتھ ساتھ عیسائی مشاہیر کا تذکرہ بھی کیا جائیگا۔

اس سلسلۂ مضامین میں لارڈ میکالے کو اس لئے مقدم رکھا گیا ہے کہ چونکہ آج کل ہندوستان میں آزاد اور جبریہ تعلیم کو رائج کرنے کے متعلق بہت شور برپا ہے اور ملک کے اعلےٰ تعلیم یافتہ حلقوں میں اس خیال کو بہت پسند کیا جا رہا ہے۔ اور لارڈ میکالے وہ شخص ہے جس نے انگلستان میں جبریہ تعلیم رائج کرنے کی تائید میں ایک معرکۃ الآرا تقریر دار العلوم میں کی تھی۔ اسلئے امید ہے کہ ناظرین ہندوستان اور انگلستان کا مقابلہ کرکے اسکی تقریر کو جسکا بیشتر حصہ مضمون کے آخر میں بطور اقتباس کے درج کر دیا گیا ہے۔ نہایت دلچسپی کے ساتھ پڑھیں گے۔ اور ریاست بروڈہ کا جہاں ابتدائی تعلیم جبریہ ہے دوسری ریاستوں کے ساتھ جہاں ابتدائی تعلیم جبریہ نہیں ہے۔ مقابلہ کرکے دیکھیں گے کہ آیا ابتدائی تعلیم کو لازمی اور جبریہ کر دینا ملک و قوم کی ترقی کے لئے مفید ہے یا نہیں۔ بہر حال میکالے کے حالات زندگی حسب ذیل ہیں ؎

میکالے ۱۸۰۰ء میں بمقام لیسٹر شائر اپنے چچا طامس بابنگٹن کے مکان میں پیدا ہوا اور انہی کے نام پر اس کا نام رکھدیا گیا۔ اس کے والد ذکریا میکالے ایک سوداگر اور مشہور محب وطن تھے اور اسکی والدہ سلینا ملز برسٹل کے ایک تاجر کی لڑکی تھی والد ؎ پریسبیٹرین فرقے سے تعلق رکھتے تھے اور والدہ کویکر ؎ فرقے سے۔ بہر حال وہ بہت سمجھدار اور محبت کرنے والی عورت تھی۔ اور چونکہ وہ اعلےٰ درجہ کا کیرکٹر رکھتی تھی اسلئے اس نے اپنے بچوں کو محبت آمیز سخت

؎ انگلستان کے ایک مذہبی فرقے کا نام ہے جسے سیاسی یا دیگر معاملات دنیا سے بہت کم تعلق ہے فرقے کے ممبر خاموش رہنے کے عادی ہیں ؎

گیری کے ساتھ تربیت دی اور اسی کے زیر تربیت رہنے کی وجہ سے بچوں کے اخلاق بہت اچھے تھے۔ طامس بابنگٹن میکالے کے تین بھائی تھے اور ۵ بہنیں تھیں۔

کہتے ہیں کہ میکالے ابھی بچہ ہی سا تھا کہ مورخ ہونے کے آثار ظاہر ہونے شروع ہو گئے تھے۔ آٹھ برس کی عمر سے پیشتر اس نے "یونیورسل" (دوائمی تاریخ) کا ایک خلاصہ لکھ ڈالا اور اپنی والدہ کے پاس جا کر کہا کہ اسمیں حضرت آدم کی پیدائش سے لیکر اب تک کے بڑے بڑے واقعات سلسلہ وار درج ہیں" مگر بچپن میں وہ زیادہ وقت نظموں کے لکھنے میں صرف کیا کرتا تھا۔

میکالے نہایت ہوشیار اور سمجھ دار بچہ تھا۔ اس نے تین برس کی عمر میں اچھی طرح لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ اسکا ذہن بہت اچھا تھا اور یادداشت اس غضب کی تھی کہ جو کچھ وہ پڑھ لیتا تھا یا سن لیتا تھا۔ اسے ہمیشہ یاد رہتا تھا۔ اس لحاظ سے میکالے انگلستان کے ایسے فرزندوں میں سے ہے جنکی ذہنی قابلیتوں پر خود انگلستان نازکناں نظر آتا ہے۔

تیرہ برس کی عمر سے لیکر ۱۸ برس تک اسنے ایک پرائیوٹ اسکول میں تعلیم پائی اور وہاں اسنے اس قدر اپنی خداداد قابلیتوں کا اظہار کیا کہ سب طالب علم اسپر تعجب کرتے تھے مگر رفتہ رفتہ یہ تعجب حسد سے بدل گیا۔ مگر جوں جوں کہ اسکی عمر میں اضافہ ہوتا گیا۔ ووں ووں اس نے مدرسہ کے کام کی طرف سے اپنی توجہ کم کرلی اور بجائے اسکے وہ اپنا زیادہ وقت علم ادب اور عام دلچسپی کی کتابیں پڑھنے میں صرف

کرتا تھا۔ بیکا کے کتب بینی کا اسقدر شائق تھا کہ بعض یہ کہتے ہیں کہ کسی انگریز نے اتنی کتابیں نہیں پڑہیں جتنی کہ اس نے پڑہی ہیں حافظہ کے متعلق گذشتہ صفحہ میں کہا گیا ہے کہ اسے ہر پڑہی پڑہائی اور سنی سنائی بات یاد رہتی تھی۔ لہذا یہاں پر یہ لکھنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ اسے تمام کتابیں یاد تھیں اور بعض اوقات وہ مسلسل صفحے کے صفحے سنا سکتا تھا۔ بے شک

یہ سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

۱۸ برس کی عمر میں وہ ٹرینیٹی کالج (کیمبرج) میں داخل ہو گیا۔ یہاں بھی اسکول کی طرح اسکی زندگی ذہنی لحاظ سے نہایت شاندار گزری۔ اس نے ایک دفعہ اعلے درجہ کی انگریزی نظم لکھنے پر یونیورسٹی کے چانسلر سے سونے کا تمغہ حاصل کیا تھا۔ مضامین لکھنے کا اسے اسقدر شوق تھا کہ بی اے کی ڈگری لینے سے پیشتر ہی اس نے انگلستان کے متعدد رسالجات میں مضامین لکھنے شروع کر دیئے تھے۔ چنانچہ ایڈنبرا ،، اور نائٹس کوارٹرلی ریویو جیسے زبردست علمی رسالے اسکی رشحات قلم کے زیر احسان ہیں۔

ڈگری لینے کے بعد اس نے بیرسٹری کی تیاری کرنی شروع کی۔ مگر اس تمام عرصہ میں وہ وہٹرلے کے ساتھ علمی اور تاریخی مضامین لکھتا رہا۔ اتنے میں یکایک اسکا ایک زبردست مضمون ،، ملٹن ،، کے

ے کہتے ہیں کہ ابوالفضل اور فیضی کے حافظہ کی بھی یہی کیفیت تھی اور جس بات کو یہ دونو بھائی ایک دفعہ یا دو دفعہ سن لیتے تھے اس کو مدت العمر یاد رکھتے تھے۔

عنوان سے ایڈنبرا ریویو" میں شائع ہوا۔ مضمون کی طرز تحریر اور صائب رائے نے علمی دنیا میں نوجوان مصنف کو مشہور کر دیا۔ پانچ چھ مہینے کے بعد اس نے بیرسٹری کا امتحان پاس کر لیا۔ مگر لٹریچر اور پالٹیکس سے اسکو زیادہ محبت تھی۔

۱۸۳۰ء میں وہ ہاؤس آف کامنز (دار العلوم) کا ممبر بن گیا اور بڑے زور وشور کے ساتھ پارلیمنٹ کی اصلاح میں مصروف ہو گیا اس زمانے میں جو تقریریں اس نے کی ہیں۔ ان کی وجہ سے اسکا لقب "فصیح و بلیغ مقرر" پڑ گیا۔

میکالے رفتہ رفتہ "بورڈ آف کنٹرول" کا کمشنر بنا اور پھر اسکے بعد اسکا سکرٹری۔ پارلیمنٹ کے کام اور سرکاری ذمہ داریوں کے علاوہ اسے "ایڈنبرا ریویو" کے لئے بھی آرٹیکل لکھنے پڑتے تھے مگر ان تمام کوششوں کے علاوہ وہ اپنی اور بہنوں کی اچھی طرح سے گزر نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے سپریم کونسل آف انڈیا میں ایک آسامی کو منظور کر لیا۔ اس آسامی کی تنخواہ دس ہزار پونڈ سالانہ تھے ۱۸۳۴ء میں وہ انگلستان سے کلکتہ روانہ ہو گیا۔ یہاں اس کے ذمہ یہ خدمت تھی کہ وہ ضابطۂ قانون فوجداری تیار کرے اور جو اب متواتر نظر ثانیوں اور تبدیلیوں کے بعد تعزیرات ہند کے نام سے مشہور ہے۔ اور جس پر ہندوستان جیسی عظیم الشان سلطنت کا نظام منحصر ہے۔

کمیٹی محکمہ تعلیم کا پریزیڈنٹ ہونے کی حیثیت سے اس نے یہ رائے دی کہ ہندوستان میں اعلےٰ تعلیم فقط انگریزی زبان میں دینی چاہیے اسنے کہا کہ مشرقی زبانیں اس قابل ہیں کہ ان کی طرف سے بالکل

بے پروائی اور غفلت برتنی چاہیے اسلئے کہ وہ قابل نفرت ہیں اور
اور انکا لٹریچر خراب اور گندہ ہے چنانچہ اسی کی بات تسلیم کی گئی اور
لارڈ ولیم بنٹنگ نے ۱۸۳۵ء میں یہ حکم نافذ کر دیا کہ اعلیٰ تعلیم صرف انگریزی
ہی کے ذریعے سے دی جائیگی اور اب تک اسی قانون پر عملدرآمد ہوتا
چلا آرہا ہے۔ انگریزی خیالات اور علم ادب نے جو فتح اب ایشیائی زبانوں
پر خصوصًا ہندوستان میں حاصل کی ہے۔ اس کی ساری وجہ میکالے
کی وہ شاندار خدمت تھی جو اس نے اپنی قومی زبان اور قومی لٹریچر
کی ترویج کی خاطر انجام دی۔

اسکے بعد ۱۸۳۸ء میں وہ انگلستان واپس چلا گیا اور وہاں جاکر اس
نے ایڈنبرا کی طرف سے پارلیمنٹ کی ممبری قبول کر لی۔ تھوڑے
دنوں کے بعد وہ لارڈ جان رسل کی وزارت میں "پے ماسٹر جنرل آف
دی فورسیز" بن گیا۔

۱۸۴۷ء میں گورنمنٹ انگلستان نے عوام کی تعلیم کے لئے دارالعلوم
سے ایک لاکھ پونڈ گرانٹ کی درخواست کی۔ لارڈ میکالے نے اس گرانٹ
کے منظور کئے جانے کی تائید میں فصیح و بلیغ تقریر کی جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ
۴۷ مخالف آرا کے مقابلہ میں ۳۷۲ آرا کی تائید سے گرانٹ منظور ہوگئی
اس مقام پر ہم چاہتے ہیں کہ ناظرین تمدن کی دلچسپی طبع کے لئے اس
مشہور و معروف تقریر کے جستہ جستہ مقامات پیش کریں۔

وہو ہذا

"جناب میرا یقین ہے کہ گورنمنٹ کا یہ فرض ہے کہ وہ ادنےٰ طبقہ کے
اشخاص کے لئے تعلیم کے ذرائع مہیا کرے۔ حکومت کے فرائض کی

جو کچھ تعریف کی گئی ہے۔ یہ مسئلہ اسی تعریف کے تحت میں آجاتا ہے مگر ان فرائض کی وسعت کے متعلق قابل اشخاص میں بے حد اختلاف ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ گورنمنٹ کو چاہیئے کہ وہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں دخل دے یعنی یہ کہ وہ تجارت کو چند اوامر ونواہی کا پابند کردے ملکی اخراجات کو مناسب قوانین کے ذریعہ سے ٹھیک ڈگر پر ڈال دے علم ادب اور مذہب پر محکمۂ احتساب قائم کرے۔ بعض اسکی مخالفت میں انتہا کو پہنچکر گورنمنٹ کے لئے ایک بہت ہی محدود دائرہ جائز سمجھتے ہیں لیکن خواہ کتنا وسیع سے وسیع اور تنگ سے تنگ دائرہ کسی سیاسی فلسفہ کے فرقے نے گورنمنٹ کے لئے مقرر کیا ہو۔ میرے مطلب کے لئے بالکل کافی ہے۔ ایک پوائنٹ (مسئلہ) پر دونو گروہ کامل طور پر متفق ہیں۔ یعنے یہ کہ وہ بالاتفاق تسلیم کرتے ہیں کہ ہر حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ اسطرح سے انتظام رکھے جس سے کہ کمیونٹی کے ممبروں کے جان و مال کی پوری حفاظت اور ذمہ داری ہو سکے۔

جب یہ امر مسلّم ہو چکا۔ تو کیا کوئی شخص اس سے انکار کر سکتا ہے کہ ہماری جان و مال کی حفاظت کا سب سے زبردست ذریعہ عوام کی تعلیم ہے۔ تاہم اسمتھ کہتے ہیں کہ علم ادب۔ علوم وفنون کو خود اپنی حفاظت کرنی چاہیئے۔ مزید برآں گورنمنٹ کو امرا کی تعلیم میں بھی دخل انداز نہیں ہونا چاہیئے۔ اسلئے کہ امرا اور غربا کی تعلیم میں ضرور کچھ تفریق کرنی لازمی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ غربا کی تعلیم کا مسئلہ ایسی شئے ہے جسکا تعلق اپنی سلطنت کے ساتھ گہرے طور پر وابستہ ہے جس طرح سے کہ ایک مجسٹریٹ کا فرض ہے کہ وہ عوام میں چھوت کی بیماریاں نہ پھیلنے

دے ۔ اسیطرح اسکا یہ بھی فرض ہے کہ اخلاقی بیماریوں کی ترقی کو بھی جو جہالت کا لازمی نتیجہ ہے ۔ روکے اور پھیلنے دے ۔ اگر آپ عوام کو جاہل اور غیر تربیت یافتہ رکھیں گے تو اس سے یہ اہم خطرہ پیدا ہوگا کہ مذہبی دشمنیاں اور مخالفتیں نہایت خوفناک ۔ شورشوں کا باعث ہونگی ۔ ہاں ۔ خوفناک شورشیں پیدا ہونگی ۔ یہ آدم اسمتھ کے الفاظ ہیں جو ہر موقع پر سچے ثابت ہوئے ہیں ۔ میں ۱۷۸۰ء کے "نو پوپری" بلووں کا ذکر کرتا ہوں ۔ انگلستان کی تمام تاریخ میں مسئلہ مذکور کی تائید کے لئے بہتر ثبوت نہیں مل سکتا ۔ اس لئے کہ جہالت ہی نے جانوں اور مال و اسباب کو خطرے میں ڈال دیا تھا ۔ بغیر کسی اصلی شکایت کے ایک پاگل آدمی کے اشارے پر ایک لاکھ آدمی بلوہ میں شریک ہوگئے ۔ ایک ہفتہ تک دنیا کا نہایت مالدار اور آباد شہر شورش اور بدامنی کی حالت میں رہتا ہے ۔ پارلیمنٹ کا محاصرہ کر لیا جاتا ہے ۔ سفرائے دول کے قونصل خانے جنکی حفاظت قانون کی رو سے متبرک سمجھی گئی ہے ۔ تباہ کر دئے جاتے ہیں ۔ چیف جسٹس کا مکان منہدم کر دیا جاتا ہے ۔ قید خانے کے دروازے کھول دئے جاتے ہیں ۔ چور لٹیرے ۔ اور ڈاکو آکر مجمع کو اور زیادہ طاقتور بنا دیتے ہیں ۔ لندن میں ۳۶ مقامات پر ایک ہی وقت میں آگ لگائی جاتی ہے ۔ اسکے بعد حکومت ان بلوائیوں سے انتقام لیتی ہے ۔ ہزار ہا نشانہ بندوق بنائے جاتے ہیں ۔ کئی اشخاص کو دار پر

۱؎ ۱۷۸۰ء کے بلوے مشہور ہیں ۔ ایک پاگل آدمی کے اشتعال دینے پر ایک لاکھ انگریز بلوے میں شریک ہوگئے تھے ۔ لندن ایک ہفتہ تک بدامنی کی حالت ۔ ۔ ۔ اسکے بعد ہزاروں مارے گئے اور کچھ پھانسی پر چڑھائے گئے ۔ ۱۲

کھینچا جاتا ہے بسینکڑوں ڈوب کر خود بخود مر جاتے ہیں۔ الغرض جانوں کا اتنا نقصان ہوتا ہے کہ کسی جنگ میں بھی نہ ہوا ہوگا۔ مگر اس عظیم الشان مصیبت کا اصلی سبب کیا تھا؟ اسکا سبب عوام کی جہالت تھا اور اسی جہالت کی وجہ سے محلات۔ تھیٹر۔ عبادت گاہوں و دیگر عمارات کو بیحد نقصان پہنچا۔

انگلستان کی تاریخ میں ایسے بلووں کی بہت سی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا اس قسم کے واقعات ہوتے۔ اگر ایک مزدور کا دماغ تعلیم کی وجہ سے روشن ہوگیا ہوتا؟ اس لئے کہ تعلیم اسے بلاشبہ سکھاتی کہ وہ اپنے خالق کا ادب کرے۔ جائز ملکی قانون کا ادب کرے اور اصلی شکایات اور جائز معروضات کا با امن اور قانونی ذرائع سے چارہ جوئی کرے۔

میری دلیل یہ ہے کہ گورنمنٹ کا یہ فرض ہے کہ وہ ہماری جان و مال کو خطرے سے بچائے۔ عوام کی جہالت خطرہ کا سب سے بڑا سبب ہے۔ اسلئے حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ دیکھے کہ کہیں عوام جہالت میں تو نہیں رہتے۔

اس امر کو ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ کسی نہ کسی طریقے سے حکومت کو ہماری جان و مال کی حفاظت کرنی چاہئے۔ اگر آپ تعلیم کے ذریعہ کو ہٹالیں۔ تو باقی کیا رہ جاتا ہے؟ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ حکومت جسمانی قوت استعمال میں لائے اور جسکی ظاہری علامات بندوقیں۔ کرچیں۔ پھانسیاں وغیرہ ہوں۔ مذکورہ دونو طریقوں میں ایک طریقہ لوگوں کو بہتر زیادہ عقلمند اور بشاش بناتا ہے۔ دوسرا طریقہ انہیں بدنام کرنے کے علاوہ ان کی زندگی کو وبال جان بنا دیتا ہے۔ ہر شخص بجائے خود

دیکھ سکتا ہے کہ ان دو طریقوں میں سے اچھا کون ہے۔ میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ جس کسی کو پھانسی دینے کا اختیار ہے۔ تو اسے تعلیم دینے کا بھی حق حاصل ہے۔ اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ تعلیم گورنمنٹ کے سب سے بڑے مقصد کے حصول کا نہ صرف ایک ذریعہ ہے بلکہ سب سے زبردست ذریعہ ہے۔ اور وہ ارفع مقصد ہماری جان و مال کی حفاظت ہے۔

جب میں یہ خیال کرتا ہوں کہ دنیا کے بڑے بڑے مقنن۔ مدبر۔ سیاسی فلاسفر اپنے اپنے زمانے میں تعلیم پر زور دیتے آئے ہیں تو قدرتی طور پر مجھے اپنی رائے پر زیادہ اعتماد ہو جاتا ہے۔ یوں تو میں پرانے زمانے کے حکماء کے اقوال کو یہاں پیش کر سکتا ہوں مگر میں صرف ایسے لوگوں کی مثال پیش کرنا چاہتا ہوں جو ہمارے لئے باعث تقلید ہو سکتی ہے۔ لوگوں کو تعلیم دو۔ کی نصیحت "پین" کے ورد زبان تھی۔ جیفرسن بھی اسی پر زور دیتا رہا۔ آدم اسمتھ تو تعلیم دینے کا بہت بڑا مؤید تھا ہی۔ جیفرسن نے بھی اپنی زندگی کے آخری دنوں میں یہ کام کیا کہ اسنے ورجینیا میں حکومت کی طرف سے اعلیٰ درجہ کا نظام قائم کر دیا۔ اور یہی اسکا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

جو خیال میں پیش کر رہا ہوں۔ اسکے متضاد ایک خیال ہے اور وہ یہ ہے کہ گورنمنٹ محض ایک پھانسی دینے والی چیز ہے۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ حکومت کو سخت درشت اور ذلت آمیز ذرائع کے علاوہ اور کسی سے کچھ سروکار نہیں رکھنا چاہیئے۔ گورنمنٹ کا ایک کام یہ ہے کہ وہ ہاتھوں میں زنجیریں ڈالدے۔ قید خانے میں بند کر دے۔ سزا دیدے۔ قتل کر دے اور دار پر چڑھا دے۔ اور یہ کہ گورنمنٹ کے سلئے یہ امر باعث ظلم ہے۔

کہ وہ جرم کو کسی ایسے طریقے سے روکنے کی کوشش کرے جس سے لوگوں کا اخلاقی احساس ترقی پذیر ہو جائے اور وہ اخلاقی ذمہ داریوں کو سمجھنے لگیں۔ کیا ایک مدبر کا کام صرف یہی ہے کہ وہ بڑی بڑی بندگاہوں کو بنتا ہوا اور تجارت کو پھلتا پھولتا دیکھے؟ مگر اسے یہ یاد رکھنا چاہئے کہ خوشحالی اور امن اور شہروں کی درستی اور تزئین کا دارومدار سوسائٹی کے وجود پر منحصر ہے۔ یہ تو درست ہے مگر اسے کیرکٹر درست کرنے کا کبھی خیال نہیں کرنا چاہئے۔ وہ اگر ہزارہا آدمیوں کی جہالت کو دور کرنے کی کچھ کوشش کرتا ہے تو اسے آزادی کا دشمن کہا جاتا ہے۔ اگر بغاوت ہو جائے تو وہ اسکے رفع کرنے کے لئے سواروں کی ایک دستہ کو روانہ کرسکتا ہے وہ انہیں گاجر مولی کی طرح کاٹ سکتا ہے۔ وہ انہیں دار پر چڑھا سکتا ہے۔ الغرض وہ تعلیم دینے کے علاوہ سب کچھ کرسکتا ہے۔ وہ دیکھ سکتا ہے کہ لوگ ہزارہا برس سے قعر جہالت میں رہتے چلے آئے ہیں۔ اور یہ کہ وہ حیوانوں کی طرح بالکل تباہ ہو جاتے ہیں مگر ان تمام باتوں کا کچھ مضائقہ نہیں۔ وہ شخص بلاشبہ مذہبی آزادی کا بیچنے والا ہے اگر وہ لوگوں کی خراب حالت کو مزید ذلت سے بچانے کی کچھ بھی کوشش کرتا ہے۔

الغرض یہ خیالات ہیں جو ۱۸۴۶ء میں چند مشہور انگریزوں نے حکومت کے متعلق قائم کر لئے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس قسم کی غلطی ان قابل اشخاص سے کس طرح سرزد ہو گئی۔ ہم نے بہت ہی خونخوار جنگ کے بعد تجارت کو آزاد کرایا ہے۔ جب یہ معاملہ ابھی متنازعہ فیہ تھا تو اس وقت "مقابلہ" کی تائید میں بے شمار مضامین لکھے گئے تھے۔ اس بات کو

مدِ نظر رکھ کر یہ لوگ کہتے ہیں کہ جب آزادٔ مقابلہ تجارت میں مفید ثابت ہوا ہے تو یقینی طور پر وہ تعلیم کے معاملہ میں بھی مفید ثابت ہوگا۔ لہذا گورنمنٹ کو چاہیئے کہ وہ تعلیم کو افراد پر چھوڑ دے اور جسطرح سے کہ وہ ضروریات زندگی مثلاً کھانڈ کو اپنی مانگ کے مطابق مہیا کر لیتے ہیں۔ اسیطرح سے وہ تعلیم کو حاصل کریں گے۔

لیکن یہ منطق غلط تشبیہ پر مبنی ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ ضرورت زندگی مثلاً کھانڈ کا تعلق فردِ واحد کے ساتھ ہے۔ حالانکہ اگر اسمیں تعلیم کی کمی رہے گی تو اس سے تمام کمیونٹی کی سلامتی کا تعلق رہے گا۔

"گورنمنٹ کے ساتھ مداخلت نہ کرنے کی پالیسی کا ہم بہت عرصہ سے تجربہ کر رہے ہیں اور عوام کی تعلیم میں مداخلت نہ کرنے کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ ادنے درجہ کے لوگوں کی حالت (۱۸۴۷ء) ہر لحاظ سے خراب ہے؛ برخلاف اسکے حکومت کی طرف سے تعلیم دینے کے فوائد کا بدیہی ثبوت اسکوٹلینڈ ہے۔ سترہویں صدی عیسوی میں اسکی حالت تمام شایستہ ممالک سے خراب اور ردی تھی۔ لیکن تمام ملک میں مذہبی سکولوں کے قیام کے سبب ایسی ترقی ہوئی کہ اس سے پیشتر دنیا نے اخلاقی اور ذہنی لحاظ سے نہ دیکھی ہوگی۔" پھر اسکے بعد جہاں کہیں کوئی اسکوچ گیا۔ اس نے اعلے درجہ کی اتنی ترقی کی۔ کہ انگریز اور آئرلینڈ والے اسپر رشک و حسد کرتے تھے اسکی اصلی وجہ یہ تھی کہ حکومت نے انکی تعلیم کا بندوبست کیا تھا۔

"ہم اب اس قابل ہو گئے ہیں کہ کوئی نتیجہ نکال سکیں۔ دو قومیں ساتھ ساتھ تقریباً یکساں حالات میں عرصے سے رہتی آئی ہیں۔ ایک

قوم (انگریز) تو یورپ بھر میں نہایت مالدار اور نہایت تہذیب یافتہ تھی اور دوسری قوم (یعنی اہل اسکوٹلینڈ) نہایت غریب اور اجڈ تھی۔ مالدار اور اعلےٰ درجہ کے ملک میں آزاد مقابلہ تھا۔ غریب اور وحشی ملک میں عوام کی تعلیم کا کام حکومت کی طرف سے تھا۔ اسکا نتیجہ یہ نکلا کہ جو قوم اول تھی وہ آخر ہو گئی اور جو آخر تھی وہ اول ہو گئی۔ یہ تجربہ بالکل فیصلہ کن تھا۔

یہ ہیں وہ وجوہات جنھوں نے اس بارے میں میرا اطمینان کرا دیا ہے کہ حکومت کا فرض یہ ہے کہ وہ عوام کو تعلیم دے۔ چونکہ مجھے اس سچائی کا پورے طور پر یقین ہے اسلئے مجھے مخالفین کی ہر مخالفت کے باوجود اسکو بانگ دہل کہنے میں کچھ تامل نہیں ہے[۵]

یہ ہیں جستہ جستہ مقامات اس معرکۃ الآرا تقریر کے جسکی وجہ سے گورنمنٹ نے عوام کی تعلیم کے لیئے ایک لاکھ پونڈ کی گرانٹ دینی منظور کی انگلستان کی ترقی کا راز لازمی اور جبریہ تعلیم کا اجرا ہے۔

میکالے نے ۱۸۴۸ء میں تاریخ انگلستان کی پہلی دو جلدیں لکھیں۔ اور ۱۸۵۵ء میں باقی دو جلدیں بھی لکھ ڈالیں۔ اسکی وفات کے بعد

[۵] ہندوستان میں جرائم کی اس قدر کثرت ہے کہ جسمانی سزائیں تقریبًا ناکافی ثابت ہوئی ہیں۔ جرائم کو ترقی دینے میں جہاں اور بہت سے سبب ہیں وہاں ایک یہ بھی ہے کہ ادنیٰ طبقہ کے لوگوں میں بیحد جہالت پائی جاتی ہے۔ اگر تعلیم کے ذریعہ سے ان کی ذہنی اور اخلاقی حالت درست کر دی جائے اور عوام کی تربیت کا اس طرح سے انتظام کیا جائے کہ وہ جرائم کو برا سمجھنے لگیں تو امید ہے کہ کثرت جرائم بالکل جاتی رہے گی +

۱۸۵۵ء میں ایک اور جلد طبع ہوگئی اور اس طرح سے اسکی زیر دست کتاب کا اختتام ہوگیا۔ آخری جلدیں ولیم ثالث کے حالات درج ہیں ۱۸۵۶ء میں لارڈ میکالے نے دارالعوام سے علیحدگی کر لی اسکے تھوڑے عرصہ بعد اسے بیرن کا خطاب مل گیا۔ تقریباً دو سال تک وہ دارالعوام کا بھی ممبر رہا۔

میکالے نے دل کی بیماری سے ۲۸۔ دسمبر ۱۸۵۹ء میں انتقال کیا اور ۹۔ جنوری کو ویسٹ منسٹر میں دفن کردیا گیا۔

میکالے اپنی طرز تحریر کے لئے مشہور ہے۔ اسکی تاریخ کی نسبت مشہور ہے۔ کہ وہ نثر میں رزمیہ شاعری ہے۔ اسکی طرز تحریر انگلستان میں اور دیگر ممالک میں اسقدر پسند کی جاتی ہے۔ کہ ہر ایسا انگریزی داں جسے انگریزی علم ادب سے کچھ بھی دلچسپی ہوتی ہے۔ اسکی تحریر کی نقل کرنا چاہتا ہے۔ میکالے شاندار الفاظ استعمال کرنے کا عادی ہے۔ اس کا طریقہ استدلال بھی متاثر کرنے والا ہے۔ بہر حال بحیثیت مجموعی وہ ایسا شخص ہو گزرا ہے جس پر انگریز اور انگریزی علم ادب ہمیشہ ناز کرتے رہیں گے +

ضیاء الدین احمد برنی

قطعہ بہ طرز رباعی

عید کے دن کی خوشی بھی دیکھئے ذرا	یاد احباب میں ہم گل کی طرح کھلتے ہیں
ہے جو مشہور مثل نصف ملاقات ہے خط	اسلئے خط کے ذریعہ سے گلے ملتے ہیں

سید عبد الصمد - بدو

بہار

ہے موسم گل جوش پہ ہے رنگ معانی اے شاعر خوش فکر دکھا سحر بیانی
کر دے تو عیاں اپنی طبیعت کی روانی بندش ہو دلآویز تو دلکش ہوں معانی
گلہائے مضامین کو دم فکر کھلا دے
قرطاس کو اب تختۂ گلزار بنا دے

اس لطف کا دیکھا نہ کبھی عہد بہاری اس گلشن ایجاد کی کیا شان ہے پیاری
بلبل بھی نوا سنج ہے، ہے رحمت باری ہے شاخ گل تر کہ دلہن ہے یہ سنواری
کیا منہ سے کہوں کیسا ہے گلزار کا عالم
ہاں آنکھوں سے پوچھو در و دیوار کا عالم

یوں باد بہاری ہوئی زینت دہ گلزار ہر سمت مسرت کے نظر آتے ہیں آثار
نرگس کی کھلی آنکھ ہوئی خواب سے ہشیار خوابیدہ جو سبزہ تھا وہ ہونے لگا بیدار
مستانہ ادا ابر کی ہے چال میں گویا
یوں جھومتے ہیں نخل کہ ہیں حال میں گویا

سنبل کی بھی ہے زلف عجب دلکش و دلجو لالہ بھی ہے صف بستہ عجب شان سے اک سو
اور سرو نظر آتا ہے خوش قامت و خوش رو اترائی ہوئی پھرتی ہے گلزار میں خوشبو
جنت کی ہوائیں ہیں کہ گلشن کی ہوائیں
حوروں کے یہ نغمے ہیں کہ بلبل کی صدائیں

آنکھوں نے نہ دیکھی یہ کبھی رونق گلزار ہے چار طرف گرم عجب حسن کا بازار
کس طرح لچکتی ہے ہر اک شاخ ثمردار شبنم نے کئے موتیوں کے ہار ہیں تیار

بلبل کی دعاؤں نے کیا ہے یہ اثر آج
صیاد کا کھٹکا ہے نہ گلچیں کا خطر آج

باسط بسوانی (سیتاپور)

غزل

اک شمع رو کو دیکھا کل ہمنے انجمن میں
انداز میں نرالا ہیٹھل بانکپن میں

گفتار میں ہے جادو اعجاز ہی دہن میں
لاکھوں میں ایک تو ہی بانکا ہی بانکپن میں

بھرتی ہے بھیس بدلے عشاق کی محبت
گلزار میں ہے بلبل پروانہ انجمن میں

گیسوئے مشکبو میں نگہت جو ہمنے سونگھی
مشک خطا میں پائی ہمنے نہ وہ ختن میں

آغوش میں جو اپنے اُس رشک گل کو دیکھا
پھولے نہیں سمائے ہم اپنے پیرہن میں

دل زلف میں پھنسا کر برسوں بلا میں جھیلیں
جھانکے کنویں ہزاروں عشق چہ ذقن میں

مدت سے پھنک رہا ہوں فرقت میں شعلہ رو کی
اک آگ سی لگی ہے اپیاری تن بدن میں

سوز فراق جاناں تجھسے ہی خوف ہمکو
بستی کو چھوڑ دینگے بیٹھیں گے جاکے بن میں

کیوں آج تک جہاں میں زندہ ہی نام اُسکا
کیا بات تھی زیادہ باسط سے کوہکن میں

باسط بسوانی

خریدار براہ کرم خط و کتابت مین نمبر خریداری ضرور تحریر فرمائین

شہادت الطیر

علم لسان الحیوان کا مشہور ماہر و محقق علامۂ ابو الطیر جب دسویں صدی عیسوی میں مملکت مصر میں پہونچا تو گو مصریوں نے نہایت فراخ دلی سے اسکا استقبال کیا مگر اسکا مقصود چونکہ صحرا و چمنستان میں محدود تھا وہ تیسرے روز علی الصباح دمشق کیطرف روانہ ہوا۔ موسم سرد تھا دہوپ ناگوار نہ تھی۔ فراعنہ کی مشہور وادیوں میں مختلف العنوان و اقسام حیوانوں کو دیکھتا بھالتا اور نتیجہ اخذ کرتا پھر رہا تھا کہ آسمان پر ابر سیاہ نمودار ہوا اور آناً فاناً تمام صحرا اندہیرا گھپ ہو گیا۔ مصر کی آبادی اس مقام سے تیرہ میل اور کچھ فرسنگ تھی پناہ کی کوئی جگہ نہ ہونے سے ابو الطیر شمال مشرق کی طرف بڑہا جہاں کچھ آگ روشن تھی مگر تھوڑی دور جا کر معلوم ہوا کہ نگاہ نے مغالطہ کھایا اور یہ روشنی آگ نہیں بلکہ انسانی ڈہانچوں کے فاسفورس کی تھی تاہم وہ اس امید پر بڑہے گیا کہ کسی گاؤں میں پہنچکر رات بسر کر لوں مگر وہ کہیں بھی نہ پہونچا تھا کہ موسلادہار بارش شروع ہو گئی اور اس غضب کا طوفان آیا کہ مسافر کے ہوش و حواس گم ہو گئے دریائے نیل لہریں لیکر آگے بڑہ رہا تھا بجلی کی چمک اور بادل کی کڑک کلیجہ دہلائے دے رہی تھی۔ اور کوئی درخت بھی ایسا نہ تھا کہ جسکے نیچے دم لے لیتا رات کے تین پہر یہ قیامت خیز مینھ اس کے سر پر

رہا۔ جب چار بجے کے قریب صبح صادق اسکی حالت پر کھل کھلا کر ہنسی اور زور شور کی بارش ہلکی سی بوندا باندی رہ گئی تو دامن کوہ میں اسنے ایک چٹان پر زیتون کا درخت دیکھا گو دن کی روشنی شب سیاہ پر غالب آچکی تھی مگر آسمان ابھی تک ان پردیسیوں کو جواب حرارت کی ہیئت میں اسکے مہمان تھے کلیجہ سے لگائے کھڑا تھا اور ہوا ان دور افتادگان وطن کو گود میں لئے مختلف مقامات کی سیر کرا رہی تھی۔ ایسی حالت میں کہ ابوالطیر کو آسمان کی طرف سے بالکل اطمینان نہ تھا وہ اس چٹان پر چڑھکر درخت کے نیچے بیٹھ گیا گو سردی نے اس کو حواس باختہ کر رکھا تھا مگر اسکو زیادہ تر افسوس اپنی تفنیع اوقات کا تھا۔ کیونکہ اسی ہفتہ میں اسکو طائران مصر کی مکمل رپورٹ پیش کرنی تھی اور جہاز کی روانگی کا وہی روز تھا وہ اسوقت ایک ایسے مقام پر تھا جہاں کوسوں انسان وحیوان کا مطلق پتہ نہ تھا سر پر فضائے عالم پاؤں میں کنارۂ دریا کی خاک سامنے پانی کی روانی اور چٹان پہلو میں زیتون کا درخت اپنے سفر کے نتیجۂ ناکامی میں مستغرق تھا کہ ایک ہلکی سی آواز نے جو ابوالطیر کے سر پر نغمہ ودلکش میں نکلی اور بسرعت ہوا میں پھیلی اور چٹان میں گونجی اسکو چونکا دیا یہ سریلی آواز ایک بلبل خوش الحان کی تھی جو اپنے رفیق وہمراز مادہ کو پہلو میں لئے ہوئے زیتون کی شاخون میں چھوٹا سا گھونسلا بنائے زندگی بسر کر رہا تھا۔ طائر خوش نوا کے الفاظ یہ تھے پیاری صہارانی مینھ (بارش) تھم چکا بچے بھوکے ہیں چلو دانہ دنکا چن لائیں باہر تلا کھڑا ہے ایسا نہ ہو یہ کلیجے کے ٹکڑے اٹھ بیٹھیں اور ہم سے ان کی پرورش

کے کسی جزو میں غفلت ہو جائے۔

(مادہ) سری مہاراج بہت اچھا مجھے تعمیل میں کیا عذر ہے آؤ پہلے ہم اس خالق الموجودات کے گیت گائیں۔ جسنے اس چھوٹے سے گھونسلے میں ہم کو ہر طرح کا اطمینان دیا کہ کڑاکتے جاڑوں میں ہم برف اور سردی سے محفوظ ہیں۔ ہزار ہزار شکر تیرا اے حکیم الاطلاق اس قیامت خیز مینھ میں جب دنیائے حیات کا ہر ایک ذرہ متحرک تھا ہم اس گھونسلے میں خاموش اپنے لالوں کو کلیجے سے چمٹائے اور پروں میں دبائے بجلی کی کڑک بادل کی چمک سب سے امن میں تھے۔ گفتگو کے ختم ہوتے ہی نر اور مادہ دونوں نے سریلی آواز سے اس طرح کچھ نغمہ سرائی شروع کی کہ جنگل اور پہاڑ دونوں گونج اُٹھے دریائے نل کی لہریں قدرت کی اس مخلوق کو جو صانع حقیقی کی قدرت کا ایک نمونہ تھی غور سے دیکھ رہی تھیں اب ہوا سرسرائی اور آسمان خاموش ہوا اور دونوں نر اور مادہ چہچہاتے ہوئے آشیانے سے باہر آئے۔ اسوقت بظاہر ان کی آزادی میں کوسوں کوئی چیز رخنہ انداز نہ تھی مگر درخت کے نیچے ایک انسانی صورت کے نظر آتے ہی مادہ نے نفرت کی صدا بلند کی اور قریب کی ایک چوٹی پہ بیٹھ کر نظر استعجاب سے اس انسان کو دیکھا اور نر سے کہا وہ قابل ملامت مخلوق جو انسان کے نام سے تعبیر کی جاتی ہے اور جو یقیناً صداقت محبت سے انسلی محروم ہے جسکے وجود نے ہم سے آباد دنیا چھڑوا کر یہ جنگل بیابان بسوایا افسوس صد افسوس آج اس خطے میں بھی موجود ہے قریب آپہنچا ہے وہ وقت کہ یہ مکار و خود غرض خاکی پتلا صرف اسلئے کہ ہماری

نغمہ سنجی سے اسکو فرحت ہو وا ہم تر و بہ بچا کر ہماری سچی محبت کا خاتمہ کردے چلو بچوں کو اٹھاؤ اور جسقدر تیز اور جلد اڑا جائے کسی ایسی سمت کا رخ کریں جہاں ایسی مکروہ صورت دوبارہ نظر نہ آئے۔

(نر) میری محبت کی سچی قدر کرنے والی مادہ درحقیقت انسان ہمارے فطری جذبات سے قطعی ناآشنا ہے اور کسقدر مضحکہ انگیز ہے۔ یہ بحث کہ اشرف المخلوقات ہونے کا مدعی بہرحال اب ہمارا یہاں قیام نامناسب اور اندیشہ ناک ہے مگر پیاری مادہ بچے چھوٹے ہیں ننھے ننھے پروں میں طاقت پرواز نہیں۔ مجبور ہم کو اسوقت تک صبر کرنا چاہیئے جب تک دونوں بچے نقل آشیاں میں ہمارے شریک ہوں۔

مادہ اتنا سنتے ہی نر کی طرف جھکی اور اس حیوانی جوڑے نے ایک دوسرے کے منہ چوم کر [illegible] کے موثر جذبے کو پورا کیا اور دونوں ہوا میں اڑنے کے وقت [illegible] کی دیکھیا اور ماتا کی ماری نیچے جھکی اور [illegible] قریب تھا کہ وہ اس دانہ کو چکی زبردست [illegible] ہٹنے کے [illegible] صندوق کے [illegible] بال نے اسکی تمام امنگوں کا خاتمہ کر دیا۔ [illegible] مگر دانہ کی کوئی صورت [illegible] چند لمحہ قریب [illegible] انسان کی [illegible] جو ایک [illegible] مظلوم [illegible] [illegible] کردی گئی۔

(۲)

میں بیگناہ ہوں [illegible] میں نے اپنی عزت ایک ظالم مکار سے محفوظ رکھی صرف اسلئے کہ اپنا دامن عصمت بچائے [illegible]

کی چھوٹی محبت سے آلودہ کرتی اپنے لال کے خون سے رنگا قتل کی
جاتی ہوں۔ دنیا والو! تمہاری دنیا تم کو مبارک۔ یہ درحقیقت ہمارے
رہنے کا گھر نہ تھا۔ مگر یاد رکھو۔ دور نہیں ہے وہ وقت۔ جب ایک
زبردست ہاتھ۔ ہمارا تمہارا فیصلہ کرے گا۔ انسانی صورت میں چھپے
ہوئے شیطانو۔ ہمنے محض تمہاری وجہ سے اپنی آزادی کھوئی
قید ہوئی پردہ میں بیٹھے۔ مگر تم کو صبر نہ آیا۔ پتھر سے زیادہ سخت
دل رکھنے والی صورتوں۔ تمہارے ہاتھ سے اپنی عفت بچانے
میں ہم کو بڑی بڑی قربانیاں کرنی پڑیں لیکن اے لیٹروں۔
قزاقوں۔ بازار حسن میں۔ دن دہاڑے۔ عفت وعصمت کے خزانوں پر
ڈاکہ ڈالنے والوں۔ تم۔ اپنی حرکتوں سے باز نہ آتے۔ بھولی بھالی
بچیوں کو۔ جال میں پھنسایا۔ سیدھی سادی بیویوں کو دھوکے دیئے
اور غریب مسکین بیویوں کو پیسیوں کا لالچ اور جھوٹی امیدیں دلا کر برباد
کردیا۔ میں بھی تمہارے ایک ادنی کرشمہ کا شکار ہوں مگر بہت
خوش ہوں کہ میری پاکدامنی آب وتاب سے چمک رہی ہے
اور عصمت وعفت کے پھول میرے ہر رونگٹے میں کھل رہے ہیں
[illegible] اور [illegible]
[illegible] اور [illegible] اور
[illegible] مگر پھر کبھی
[illegible]

شہنشاہ اسمٰعیل بن منصور کے عہد سلطنت میں ایک عورت۔ تو ایک
معصوم بچہ کے قتل کی مرتکب ہوئی۔ اور شہزادہ سلیم کی شہادت سے

جرم تجھپر ثابت ہوگیا۔ اس لئے میں قصاص کا فتوےٰ دیکر تیری گردن تن سے جدا کرواتا ہوں۔ شہنشاہ اسمٰعیل کی دوران حکومت میں یہ پہلا اتفاق تھا۔ کہ مجرم سزا کو ظلم اور خود بیگناہ ہونے کا مدعی ہو۔ مگر منجھلے لڑکے شہزادہ سلیم جیسے ثقہ مسلمان کی شہادت ایسی نہ تھی کہ اسمٰعیل یقین میں متامل ہوتا۔ تاہم وہ عورت کی یہ تقریر سنکر متحیر تھا۔ کبھی قاضی کو دیکھتا۔ کبھی مفتی کو تکتا۔ اور کبھی طائر خوش الحان پر نگاہ ڈالتا۔ مجرم و جلاد مقتل میں پونچے۔ تیغ آبدار میان سے باہر آئی۔ اور آناً فاناً تن بیجان زمین پر تڑپنے لگا۔

(۳)

آج اُن باتوں کو پانچ برس سے زیادہ گذر گئے مرنے والی عورت کی ہڈیاں خاک ہوگئیں۔ شہنشاہ اسمٰعیل متفکر و مغموم بیٹھا ہے امراء و روساء حاضر ہیں۔ دفعتہً بادشاہ نے ابوالطیر سے خطاب کیا۔ یہ مرغ پرند جسمیں مٹھی بھر پروں کے سوا کچھ نہیں جو انسان کو حقارت و نفرت سے دیکھے یقیناً خدا کی قدرت کا نمونہ ہے ایک وقت وہ تھا میں ہزاروں پرندوں کا مجموعہ میرے پیش نظر رہا۔ اور اگر وہ تمام تعداد شمار کی جائے جو آج تک میرے مطالعہ میں رہی تو غالباً لاکھوں تک پہونچے گی۔ لیکن میں نے ایسا مغرور اور قابل پرند دیکھا نہ سنا۔ اسکی فراست۔ حافظہ اور دماغی قابلیت یقیناً انسان سے متجاوز ہے۔ ابوالطیر۔ دن کی بھوک۔ اور رات کی نیند سب اڑگئی۔ اس بچہ کا انصاف کرنے میں اب صرف ایک ہفتہ باقی ہے۔ اسکے پاس کوئی ثبوت نہیں کہ اسکی ماں بےگناہ قتل ہوئی ادھر دیکھتا ہوں تو قتل کی

سب سے بڑی وجہ اس سلیم کی شہادت ہے جو قیامت تک جھوٹ نہ بولے گا۔

ابو الطیر۔ والا قدر۔ ہم سب اس معاملہ میں متحیر ہیں۔ ادہر لڑکا کہتا ہے بادشاہ میری فریاد سن۔ اور داد دے میری ما۔ بے گناہ قتل ہوئی۔ ادہر صاحب عالم جیسا جوان صالح جسکی نظیر مشکل ہے جرم کا شاہد۔ الغیب عند اللہ۔

بادشاہ۔ خدارا تم سب میری مدد کرو۔ ایسا نہ ہو سلیم کے مقابلہ میں یتیم انصاف سے محروم رہے۔ عزنا برحق اور یوم الحساب یقینی۔ دعا کرو کہ مقدمہ کا نتیجہ دودہ کا دودہ اور پانی کا پانی ہو۔ لیکن۔ للہ۔ مجھے صلاح دو کیا کروں۔

پرسوں فیصلہ کی تاریخ ہے۔ اللہ ہمپر کرم کرے!!

نمبر ۴

رات اپنی تیسری منزل پار کر چکی تھی اور آسمان قریب ہے۔ کہ اس روز کے آفتاب سے بغل گیر ہو جسکے انتظار میں خلق اللہ گھڑیاں گن رہی تھی۔ اور یہ وہ دن تھا کہ وہ دس برس کی معصوم روح جو اپنی بے گناہ ما کے قتل کی مدعی تھی دربار اسمٰعیل سے اپنی داد لے بادشاہ رات کے اس سنسان وقت میں کہ تمام دنیا نیند کے مزے لے رہی تھی۔ متحیر و پریشان بیٹھا تھا۔

ابو الطیر جو ہر وقت کا ہمدم و ہمراز تھا سرنگوں اور خاموش بیٹھے بیٹھے اکتا کر اس طرح عرض کرنے لگا؟

والا منزلت پریشانی اور تفکرات کی حد ہو چکی۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم

صاحب عالم کی شہادت کو نا قابلِ اعتبار تسلیم کریں۔ یقیناً یہ لڑکا جھوٹا اور کسی مفسد گروہ کا سکھایا پڑھایا ہے۔ دعوے خارج کیجئے اور اس بچے کو ایسی سزا دیجئے کہ آیندہ کسیکو اس قسم کی غلط بیانی کی جرأت نہ ہو۔

بادشاہ۔ تین مہینے کے متواتر غور و فکر کے بعد جس نے میری صحت بگاڑ دی۔ میں بھی اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں۔ کوئی شک نہیں کہ یہ تیغنی بچہ جو فساد کی پوٹ ہے۔ سخت سزا کا مستحق ہے؟

بادشاہ کا یہ فقرہ ابھی ختم نہ ہوا تھا کہ بلبل خوش الحان کھلکھلا کر ہنسی اور کہا۔

او دغاباز انسان ابوالطیر ایسی جھوٹی خوشامد نہ کر کہ ایک ایسا یتیم معصوم جسکے ساتھ کوئی وارث نہیں انصاف سے محروم رہے اور تو او مکار ابوالطیہ تو صرف اس لئے کہ سلیم شاہزادہ ہے بادشاہ کو انصاف نہ کرنے دے۔ اگر تو اور تیرا بادشاہ دونوں وعدہ کریں کہ مجھے آزادی نصیب ہو جائے گی تو میں غفلت کا پردہ تم دونوں کی آنکھوں سے اٹھا دوں اور بتا دوں کہ لاوارث یتیم اپنے دعوے میں کہاں تک سچا ہے اور شاہزادے کا بیان کیسا ہے۔

بلبل کی اس گفتار سے ابوالطیر اور بادشاہ دونوں سناٹے میں آگئے اسمٰعیل اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا طائر خوش بیان میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تو اس راز کا انکشاف کر دے تو تجھ کو ہمیشہ کے واسطے آزاد کر دوں گا۔

بلبل۔ بادشاہ بہتر ہوگا کہ ابوالطیر بھی ہمارے اس قول میں شریک ہو

ابو الطیر۔ مرحبا۔ طائر خوش نوا للہ ہماری حالت پر رحم کر اور اس راز کو کھول جسنے ہماری بھوک پیاس سب کا خاتمہ کر دیا۔

بلبل۔ سن۔ اے سنگدل انسان سن۔ اور اگر غیرت وحیا کا مادہ موجود ہے۔ تو کوشش کر کہ پردہ دنیا پر انسان کا وجود باقی نہ رہے سال بھر کے قریب ہونے آیا گرمی کے موسم میں جبکہ بساط زمین پر چاندنی نکھری ہوئی تھی۔ شاہزادہ سلیم نے اس عصمت مآب عورت کو جو ایک معمولی چیری تھی۔ آدھی رات کے وقت جگایا غور کرو؟ اے ظالم مردوں غور کرو۔ اور خیال کرو کیا کہ رہا ہوگا دل اس بدنصیب بے اور بیکس عورت کا جسکے سر پر کوئی حمایتی موجود نہ تھا اور ایک سلطنت کا ولی عہد جسکے سر پر انسانیت کا بھوت سوار تھا اسکی عزت کے در پے تھا دور ہو جاؤ میرے سامنے سے انسانیت کا دعوے کرنے والے مردوں میری آنکھوں کے سامنے ہے وہ وقت جب ایک حسن کی دیوی اور عصمت کی ملکہ لرزتی اور کانپتی۔ ولیعہد کے قدموں میں گری پڑی ہے اور اپنی عصمت بچانے کی کوشش کر رہی ہے آہ اے ابو الطیر رات اسکی گریہ وزاری میں صبح ہو گئی۔ مگر ظالم سلیم کا دل نہ پسیجا یہاں تک کہ روز روشن نے مظلوم کی حالت پر رحم کیا اور ظالم کے قبضے سے نکلوا دیا۔

نظام عالم بدستور اپنا کام کر رہا تھا جب آفتاب غروب ہوا تو جھٹ پٹے وقت یہ بدنصیب عورت کلثوم جسکی عدت بھی پوری نہ ہوئی تھی اپنے آٹھ برس کے بچہ کا ہاتھ پکڑا اور چھوٹے بچہ کو گود میں لئے ایک سپید چادر اوڑھ باہر نکلی مگر تقدیر ساتھ نہ تھی دروازہ محل پر سلیم سے مت بھیڑ

ہوئی اور وہ شقی القلب بجبر واپس سے آیا۔

ایک بدنصیب لونڈی دکھیاری بیوہ کی اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ زبان سے شکایت نکال سکتی اپنے پھٹے ہوئے بچھونوں پر لیٹ کر خدا کے حضور میں عرض کرنے لگی۔

احکم الحاکمین لاوارث بیوہ کی عصمت تیری سپرد ہے۔ معبود حقیقی میری حفاظت کر اور سنگدل کے پنجہ سے بچا۔

اسمٰعیل! انصاف کی آنکھیں کھول اور دیکھ! وہی آدھی رات کا وقت ہے اور سلیم اس حسن کی کان پر جبر کر رہا ہے جب کسی طرح کامیاب نہ ہوسکا تو دودھ پیتے بچہ کو گود میں لئے خنجر آبدار نکالا اور کہا اگر اب بھی تو اپنی ہٹ پر قائم ہے تو یہ بچہ قتل ہوتا ہے اور تو اس کے قتل میں گردن زدنی۔

کلثوم۔ اگر اس بچہ کی قربانی اور میرا قتل میری عصمت کو بچائے تو اس سے زیادہ مجھے کوئی خوشی نہیں ہوسکتی۔

سنگدل بچہ کے باپ بادشاہ اسمٰعیل خنجر نے دفعۃً اس ننھی سی جان کو ہمیشہ کے لئے خاموش کردیا۔ اور مامتا والی جس کی چھاتیوں سے دودھ اُبل رہا تھا اپنے پھول کی گردن تڑپتی ہوئی دیکھ رہی تھی۔ سلیم کا خونی لباس املی کے اس درخت کے نیچے دفن ہے اور وہ بتادے گا کہ بچہ کا قاتل کون تھا۔ کلثوم کے برخلاف یہ بیان کہ وہ بدچلن تھی اور اسلئے کہ بچہ روکر ماں کے عیش میں خلل انداز تھا ماں کے ہاتھوں قتل کیا گیا صریح بہتان ہے۔

سچ بتا ابو العیر! کیا یہ ہی ہیں وہ افعال جو انسان کو حیوان سے

تمیز کریں۔ اور کیا یہی ما بہ الامتیاز ہے مجھ پر رحم کر کے کھڑکی کھول
دے اور میری اس دعا میں شریک ہو کہ اب بقیہ عمر انسان کی صورت
نہ دیکھوں۔

بادشاہ اور ابوالطیر دونوں ششدر تھے درخت کھودا گیا اور
سلیم کا لباس خون میں رنگا نکلا۔

شہسوار مشرق چادر آسمان پر طلوع کر چکا تھا ارکین دربار حاضر
ہونے شروع ہوئے۔ بادشاہ تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ ولیعہد دائیں
طرف کرسی زرنگار پر تھا کہ معصوم بچہ آکر زمین بوس ہوا۔ اور بآواز
بلند کہا۔

"بادشاہ! میرا انصاف کر! میری ماں بیگناہ قتل ہوئی! میری داد دے
یا مجھے بھی میری ماں سے ملا دے"!

اسوقت اسمٰعیل کی گردن نیچی تھی وہ خاموش تھا چند لمحہ بعد اسنے
آسمان کی طرف دیکھا اور ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "اے ازلی و ابدی راج والے
بادشاہ مجھے توفیق دے کہ انصاف کے میدان میں ڈگمگا نہ جاؤں"۔

اتنا کہکر اسمٰعیل نے وزیر کی طرف دیکھا اور حکم دیا کہ جلاد کو حاضر
کرو"۔

تمام دربار ساکت تھا اور کسی کی عقل کام نہ کرتی تھی کہ اسوقت
کیا ہوگا۔ بظاہر بچہ کی موت یقینی تھی۔ اور اسکے بچپن پر ہر متنفس افسوس
کر رہا تھا۔

دفعتہً اسمٰعیل اٹھا اور اسکے ساتھ ہی تمام دربار دست بستہ کھڑا ہوا
اب اسمٰعیل نے سلیم کی طرف منہ کیا بلبل کا پنجرہ ہاتھ میں لیا اور کہا۔

اونا بکار تو اسی واسطے ولیعہد بنایا گیا تھا کہ خدا کے بندوں پر علانیہ ظلم کرے اور اپنی جھوٹی غرض کے واسطے ایک پاک لڑکی پر ایسی لڑکی پر جو تمام سلطنت کے واسطے مایہ ناز تھی۔ الزام لگائے اسکے معصوم بچہ کو قتل کرے اور شہادت دے کہ مقتول کی قاتل یہی ہے۔

یہ مٹھی بھر پر جو ایک بلبل کی صورت میں تیرے سامنے ہین تیری تمام حقیقت بیان کر چکی۔ اس لباس کو دیکھ جو تیرے قتل کی شہادت دے رہا ہے۔

واقعات چونکہ اچھی طرح ثابت کر چکے کہ تیری شہادت جھوٹی تھی جس کی وجہ سے ایک بے گناہ قتل ہوئی میں حکم دیتا ہوں کہ میرے روبرو جلاد تیری گردن تن سے جدا کر دے"

اس حکم نے محل میں کہرام مچا دیا تمام درباری ساکت رہگئے ہر شخص سلیم کی حالت پر رو رہا تھا۔ لوگ بچہ کے قدموں میں گرے کہ وہ اپنے دعوے سے باز آئے۔ مگر وہ اسکے سوا کچھ جواب نہ دیتا تھا کہ انصاف کرو یا مجھکو میری ماسے ملا دو۔

محلوں کی بیٹھنے والیاں بچہ کی منت خوشامد کر رہی تھیں وہ کسی طرح راضی نہ ہوتا تھا۔ یہانتک کہ ایک برقع پوش عورت مجمع میں آئی اس نے اپنے منہ پر سے نقاب اُٹھا کر اس بچہ کو دیکھا اور باآواز بلند کہا۔

"دعوے سے باز آ اور اپنی ماسے مل"

اتنا سنتے ہی بچہ بیتاب ہو کر دوڑا اور ماما کہتا ہوا اُس عورت

سے لپٹ گیا۔

حاضرین پر سکتہ کی حالت طاری تھی اور کسیکی عقل کام نہ کرتی تھی کہ ماجرا کیا ہے۔

وزیر سلطنت اس موقعہ پر اٹھا اور عرض کیا۔

جہاں پناہ! مجھے اس عورت کے بیگناہ ہونے کا یقین تھا۔ اتفاق سے ایک واقعی خونی عورت ان دنوں جیلخانہ میں موجود تھی جو قتل کی گئی۔ اور یہ لڑکی کی حیثیت سے آجتک میرے پاس محفوظ رہی بچہ کا خون یہ معاف کرتی ہے۔ اسلئے جہاں پناہ بھی شہزادے کو رہائی دیں۔

اب بلبل ہزار داستان پھڑ پھڑائی اور کہا شہنشاہ وعدہ پورا کر۔ سر اُٹھا اور درخت پر دیکھ اس گھونسلے میں میرا نر آجتک اپنی تنہا زندگی بسر کر رہا ہے اور صرف اس لئے کہ ہم دونوں تھوڑی دیر کو آپس میں ایک دوسرے کو دیکھ لیتے ہیں تمام تکلیفیں ہیچ ہیں۔ بادشاہ دیکھ اور انصاف کر۔ انسان کس طرح اپنی زندگی گزار رہا ہے اور ہم جانور کیونکر جیتے ہیں بادشاہ ہمسے سبق لے اور یاد رکھ کہ انسان جسکی زندگی کا مقصد خود غرضی کے سوا اور کچھ نہیں انسانیت میں جانور سے بہت گرا ہوا ہے۔

کھڑکی کھلی ہوئی تھی بلبل یہ کہکر باہر آئی درخت پر بیٹھی اور دونو نر مادہ خدا حافظ کہکر اپنے وطن کو رخصت ہوئے۔

نہر لمودری

کیا آب و تاب تجھ میں نہر لمودری ہے — پربت کی تو ہے دیبی یا قاف کی پری ہے
آب حیات تو ہے، روح نبات تو ہے — تو جان و دل کی ٹھنڈک و آنکھ کی تری ہے
تو کھیلتی ہے بن میں و پودتی چمن میں — نسرین و نسترن میں تیری مصوری ہے
گہنا ہے وہ رنگیلی شالی وہ [illegible] — ریحان وہ نیلی پیلی کیا صنعت داوری ہے
رخشندہ سنگ پارے [illegible] چاند و ستارے — تیری جو کنکری ہے الماس سے کھری ہے
لعل و گہر کے معدن ہیں [illegible] — اور موتیوں سے ہر دم جھولی تری بھری ہے
چشمے ترے معطر ہیں جام جم سے بڑھ کر — چیلوں کی فوج [illegible] سد سکندری ہے
پر آب ہے لبالب ہر دم ترا ہی ساغر — ساقی بزم تیرا خورشید خاوری ہے
حسن و جمال تیرا غنج و دلال تیرا — ہر خط و خال تیرا غیرت دہ دلبری ہے
ہے تیری [illegible] کیا [illegible] — جنگل میں کوئی جوگن محو نواگری ہے

ناظر کی ہیں نظر میں تیری ادائیں پیاری
کچھ مجھ سے سنتی چلتی ہے داستاں تمہاری

[illegible] — [illegible] ہیں
آفاق [illegible] دونوں [illegible] — [illegible] ہیں
[illegible] ہم دونوں [illegible] — [illegible]
نے کوئی [illegible] کوئی [illegible] ہے — پربت کی چوٹیوں کو [illegible] ہیں
[illegible] ہیں — ہم [illegible] ہیں

بندہ [illegible] محمد خالد

دہریت اور تصوف

ایگنوسٹیسزم یعنی لا دریت کا موجد چارلس ڈارون ہے لیکن اسکے خیالات کی اشاعت اور تحقیقات کی ترویج زیادہ تر ہبنری نکسلے نے کی جو اسکا ایک ممتاز شاگرد تھا۔ ڈارون کی رائے میں انسانی زندگی کا مقصد اعلیٰ بنی نوع انسان کی خدمت ہے اور اس عقیدہ کی ایک جماعت اب ایسی پیدا ہو گئی ہے جو خود تکلیفیں اٹھا کر دوسروں کو راحت پونچانے کے مدعی ہے۔ اور وہ پیدایش انسان کی علت غائی اسی حد تک محدود سمجھتے ہیں۔

اسوقت یہ لوگ دو قسموں پر منقسم ہیں ایک وہ جو مبدا عالم کو ایک شئے تصور کرنے کے بعد مادہ یا عقل کل کہتے ہیں۔ دوسرے وہ جو یہ کہتے ہیں کہ شروع میں مادہ اور عقل کل دونوں کا وجود تھا اور عالم و باقی العالم کے وجود کا سبب یہی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ کائنات جو اسوقت پیش نظر ہے اسکا ظہور دفعتہً نہیں ہوا بلکہ کروروں تبدیلیوں نے اسکی یہ ہیت کی۔ کائنات میں انسان بھی شامل ہے جو کئی لاکھ برس کا زمانہ گذار کر اس درجہ کو پہنچا مذہب کا اصل الاصول یہی ہے مگر مسلمہ زندیق کے بعض معترف بھی اسمیں مختلف ہو گئے ہیں۔ مثلاً ہربرٹ سپنسر کہتا ہے کہ ہم عالم کی علت عقل کو معلوم نہیں کر سکتے

زمانہ موجودہ کا سب سے بڑا خدا پرست اور علمائے طبقات کا

قابل فخر شخص الیوزللج ہے جو اس معاملہ میں یوں کہتا ہے۔

دنیا عناصر کا مجموعہ عظیم ہے مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ کب ابلتے ہوئے مادہ کا ہولناک سمندر تھی البتہ یہ قرین قیاس ہے کہ ابتدا چاند اور زمین سے ہوئی یہ دونوں خلائے لامحدود ہیں۔ جب وقت نظام شمسی کسی بڑے نیبولہ کے ٹکڑے سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہوگا وہی قیامت ہوگی مگر عالم مرئی کو مطلق اس سے واسطہ نہیں اس قسم کے واقعات بہت سے ہوئے اب بھی ہوتے ہیں اور آیندہ ہونگے یہ ظاہر ہے کہ وجود نظام شمسی سے پیشتر کوئی شئے تھی جو اسکے وجود کا سبب ہوئی

فرانس کا مشہور فلاسفر اگسٹ کومٹ اس مسئلہ پر بحث کرتا ہوا یہ نتیجہ نکالتا ہے مشاہدہ و عقل جس دعوے کے تسلیم کرنے میں تامل نہ کریں وہ حقیقی ہے اور اسکے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ تصنع۔

جرمنی فیلسوف اس معاملہ میں سب سے بازی لے گئے ازلٹ ہیکل باوجود وحدت الوجود کے معترف ہونے کے اپنا عقیدہ اس معاملہ میں اسطرح ظاہر کرتا ہے۔

وسعت عالم کا محدود کرنا غلطی ہے وہ لامحدود اور بے حساب ہے جسمیں خلا کا پتہ نہیں موجودہ عالم حیات کا ہر ذرہ ہیولے سے لبریز ہے جسکا ارتقا ایک میعاد مقررہ کے منقضی ہونے پر ہوتا ہے۔

اب ہم تصوف کے مسئلہ ہمہ اوست پر نظر ڈالتے ہیں کہ حکمائے یورپ اسی عقیدہ میں مشرق سے کس حد تک متفق ہیں۔

اس خیال میں متفق ہیں کہ اس تمام صنعت کا کوئی صانع ضرور ہے اور یہ جو کچھ بھی دنیا میں ہو رہا ہے اسی

روشنی کا ایک ذرہ ہے اور ہر جزو چونکہ کل ہے اسی طرح متفق ہے جس طرح کل اپنے جز پر محیط ہونے کے واسطے ہوتے وہی صانع حقیقی ہے۔

ہربرٹ سپنسر بھی وحدت الوجود کا قائل تو ضرور ہے مگر اس مسئلہ میں اسکا خیال مختلف ہے وہ عناصر ہی کو مبدا عالم یقین کرتا ہے شاید یہی باعث اس عقیدہ کو ابتدائی حالت میں مادہ اور تکمیل پر توحید کہتا ہے۔ اور اسی مقام پر ہے کہ وہ باختلاف ابدک ہمہ اوست کی طرف جھک گیا ہے۔

وہ کہتا ہے موجودہ کائنات ایک صانع کی محتاج بھی اور یقیناً وہ کسی ہستی سے پیدا ہوئی صنعت اور صانع دونوں کا اصلی جوہر ایک ہی ہے۔

مسئلہ ہمہ اوست مشرقی تصوف میں ہمیشہ معرکۃ الآرا رہا ہے اب تک جہاں جہاں اس مشرب کے لوگ پائے جاتے ہیں وہ اسی کے معتقد ہیں مگر دیکھنا یہ ہے کہ یورپ جو لا مذہبی کا گھر ہے وہاں بھی اور نتیجہ یہ ہے کہ وہی لوگ جو دہریت کے مدعی ہیں ان کے یقین میں تصوف کی جھلک صاف نظر آ رہی ہے اور شاید یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اگر ایک اہل باطن صوفی اس میدان میں گامزن ہو جائے تو لا مذہبیوں کا بڑا حصہ ان کے دلائل بخوشی سننے پر آمادہ ہو۔

جلال احمد

تغلق آباد

بن بن کر بگڑنے اور بگڑ بگڑ کر سنورنے والے شہر شاہجہاں آباد کی شان میں مولانا حالی کے اس شعر کی تصدیق

چپہ چپہ پہ ہیں یہاں گوہر یکتا تہ خاک
دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانہ ہرگز

اسوقت ہوتی ہے جب ایک سیاح شہر کے چاروں طرف نظر ڈالتا ہے اور دیکھتا ہے کہ کہیں تاجداران ذوی الاقتدار قیامت کی نیند اور کہیں سلطنت و قدرت کے شہریار بے خبر پڑے سوتے ہیں کسی جگہ اقلیم سخن کے درِ شاہوار خاک میں رُل رہے اور کسی جگہ علوم و فنون کے باکمال مٹی میں مل رہے ہیں شہر کا ایک ایک ذرہ بآواز بلند اس سے کہتا ہے۔

لے کے داغ آئے گا سینہ پہ بہت اے سیاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

دلّی! تیری کس کس ادا پر جان قربان ہو۔ کیسے ہوں گے وہ مکین جنکے مکان آجتک زمانہ کو عبرت کا سبق دے رہے ہیں۔

تغلق آباد کی ایک ایک اینٹ اس جلیل القدر بادشاہ کا نام زندہ کر رہی ہے جو صفحۂ تاریخ پر غیاث الدین تغلق شاہ کے نام سے مشہور ہوا اور جسنے ۷۲۱ھ میں اس قلعہ کی بنیاد ڈلوائی بظاہر تمام قلعہ برباد ہوکر خاک میں مل گیا اور اب چمگادڑوں اور ابابیلوں کا مسکن ہے

مگر قلعہ کے وسط میں جو بلند اور وسیع بارہ دری ہے وہ آج بھی
یہ دعوے کر رہی ہے کہ وسعت و گنجایش کے اعتبار سے بینظیر ہوں
اس قلعہ کے باون دروازے اور ستاون کوٹ ہیں۔ سمت مغرب
میں یہ قلعہ آباد ہوا اور شمال جنوب و مشرق میں شہر تغلق آباد بسایا
گیا جو اب جی آئی پی ریلوے کا دلی صدر سے پانچواں سٹیشن ہے
سب سے بڑا کمال جو پہلے ہی نظر آتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ فصیل شہر
اور قلعہ کی فصیل کا اتصال نہایت کاریگری سے کیا گیا ہے۔ قلعہ
ایک پہاڑی پر آباد ہے اور اسپر کھڑے ہونے سے گرد و نواح
کا منظر بہت اچھی طرح دکھائی دیتا ہے قلعہ کے مغرب میں تغلق بادشاہ
کی قبر ہے۔ جو ساڑھے پانچ سو برس پہلے کی تعمیر ہے جسکو ملک فخرالدین
جونا تغلق شاہ کے بیٹے نے بنوایا ایک خوبصورت عمارت میں یہ قبر
محفوظ ہے۔ اور یہ عمارت اسقدر خوبصورت ہے کہ اب بھی اچھے اچھے
مقبروں سے مقابلہ کو موجود ہے۔ مقبرہ کے اندر کی چاردیواری
سنگ سرخ سے بنی ہوئی ہے۔ بیچ میں سنگ مرمر کا برج ہے
اور فصیل سنگ خارا کی ہے۔ سنگ سرخ میں سنگ مرمر کی دھاریں
اور بیل بوٹے نہایت نفاست سے بنائے گئے ہیں۔ برج میں تین
قبریں ہیں۔ بیچ والی قبر سلطان غیاث الدین تغلق کی ہے اور دائیں
طرف محمد عادل شاہ کی ہے جو سلطان محمد تغلق شاہ کا لڑکا تھا تیسری
غیاث الدین تغلق شاہ کی شاہ کی بیگم کی قبر ہے جسکا خطاب مخدومہ
جہاں تھا۔ افسوس ہے کہ قبور کے تعویذ موجود نہیں جو مفصل کیفیت
بتاتے۔ صحن میں جو خوبصورتی میں اب بھی کچھ کم نہیں گائین جینیس

بندھتی ہیں۔ جو وہاں کے زمینداروں کی ہیں۔

قلعہ سے باہر نکلکے عمارت ہزار ستون ہے جو ملک فخرالدین جونا نے اپنی زندگی میں بنوایا۔ یہ تعمیر ۷۲۵ھ میں شروع ہوئی اور تین برس میں مکمل ہوئی جس میں پورے ایک ہزار ستون لگائے گئے۔ مگر اب بالکل برباد ہو گئی اور ایک آدہ ستون کے سوا کچھ بھی موجود نہیں بدر شاشی نے جو اس زمانہ کا مشہور شاعر تھا اسکی تاریخ فادخلوھا نکالی تھی۔ ملک فخرالدین جیسے خونخوار بادشاہ کی محنت سے تیار کی ہوئی تعمیر کا یہ حشر کہ کھنڈر ہوا جائے عبرت کا سبق ہے۔ احمد

۲۰۔ ماہ حال کو ہمارے پاس ایک تار محترمہ عائشہ بیگم صاحبہ کا وصول ہوا کہ وہ امروہہ سے معہ الف خاتون صاحبہ کے تشریف لاتی ہیں۔ چنانچہ شام کو یہ بی بیاں تشریف لائیں اور ہمکو دلی افسوس ہوا یہ سنکر کہ ایک شخص عبداللہ سوداگر نامی نے اس خدمت میں جو وہ اعجاز نما چاول کے ذریعہ سے کر رہی ہیں رخنہ ڈالا حالانکہ اس شخص کا کوئی وجود امروہہ میں نہیں اور پولس سرگرم تحقیقات ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ہماری محترمہ بہنوں کی یہ خدمت وقعت سے دیکھی جائے گی ۔

ایڈیٹر

مرکز حقوق نسواں

تین سال کے قریب ہونے آئے کہ خان بہادر محمد اشرف خاں صاحب پوپلزئی وغیرہ نے تحریک کی تھی کہ عصمت میں ایک ایسا فنڈ کھولا جائے جس سے ان حاجت مند پردہ نشین خواتین کو مدد دی جائے جنکے سروں سے ان کے وارث اٹھ گئے اور جو اپنی آبرو بنائے اور بچوں کو کلیجہ سے لگائے بھوکی پیاسی دن اور راتیں بسر کر رہی ہیں یہ تحریک دل سے پسند کی گئی اور بہت سی بہنوں نے اسکی تائید کی بالخصوص بنت بابو اللہ بخش صاحب حصار نے گرمجوشی سے اسکا استقبال کیا مگر تجویز کے ہر پہلو پر نظر ڈالتے ہوئے نہایت افسوس کے ساتھ اس ارشاد کی تعمیل سے مجبوری رہی اور یہ زیادہ مناسب سمجھا کہ سردست ہمارے لٹریچر میں ایک ایسا ذخیرہ ہو جو مردوں سے حقوق نسواں کا مطالبہ کرے اجرائے تمدن کا اصلی منشا یہی تھا اور جسکو ہم بار بار ظاہر کر چکے ہیں گو اکثر احباب نے ہماری بہت بڑھائی اور حوصلہ افزا خطوط لکھے مگر کام کو حسب دلخواہ کامیابی میسر نہ ہوئی تاہم یہ غنیمت ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ کام کر رہا ہے اور اگر ناظرین تمدن اسکے وجود کو ضروری سمجھتے رہے تو انشاء اللہ وہ اپنے مقصد میں کبھی نہ کبھی ضرور کامیاب ہوگا مگر یہ دیکھ کر دلی رنج ہوتا ہے اور اسکا شاید [illegible] ہے کہ کس [illegible] سے مسلمان [illegible] زبان فرقہ

حقوق غصب کئے اور اللہ آمین کی بیویوں کو لونڈیوں سے بدتر بنا دیا ہم مسلمان بیویوں کو صرف اس حالت میں دیکھنا چاہتے ہیں جس حالت میں ہمارے مذہب مقدس نے ہم سے توقع کی مگر برخلاف اسکے جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہمارے موجودہ تمدن روزمرہ کی زندگی گھروں کی کیفیت اور عدالت کے کاغذات سے ظاہر ہے اور ضرورت ہے کہ بیٹیوں کے باپ اور بہنوں کے بھائی متفقہ کوشش سے ایک ایسا مرکز قائم کریں جس سے وقتاً فوقتاً حقوق نسوان کی حمایت میں آواز بلند ہو یہ تو ظاہر ہے کہ جہاں مرد کیا خود عورتوں میں ہی اپنے حقوق کا احساس پیدا نہیں ہوا اس کا کامیاب ہونا معلوم - مگر ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ کوشش ہمارا کام اور اسکی تکمیل خدا کے ہاتھ اس لئے آج ہم اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کی توقع پر اعلان کرتے ہیں کہ جو حضرات مرکز حقوق نسوان کا وجود پسند کریں وہ ہم کو مطلع کریں تاکہ ایک ضروری مسئلے پر بحث ہونے کے بعد عملی کارروائی شروع ہو - مرکز حقوق نسوان کی خدمات بالفعل ہماری رائے میں مختصرہ ہوں گی -

(۱) اردو لٹریچر میں ان کتابوں کا پیدا کرنا جو حقوق نسوان کی حمایت میں ہوں ۔

(۲) مسلمانوں سے ان حقوق نسوان کا مطالبہ جو اسلام نے عطا کئے ۔

(۳) مختلف مقامات پر واعظین کے ذریعہ سے حقوق نسوان کی تلقین -

(۴) ان بیکس اور لاوارث لڑکیوں کی جو ظالم شوہروں کے قبضہ میں زندگی وبال سمجھ رہی ہیں اعانت وحمایت۔

(۵) ان غریب مفلوک الحال پردہ نشین رانڈوں اور دکھیاریوں کی اعانت جو کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلا سکتی ہیں اور سخت مصیبتیں بھگت رہی ہیں۔

(۶) مردوں کو ایک سے زیادہ نکاح کی اجازت میں شارع کے منشا کی اشاعت اور ایسے رانڈوں کے نکاح کی کوشش جو نکاح کے قابل ہوں۔

(۷) تعلیم یافتہ لڑکیوں کے واسطے ایسے لڑکے تلاش کرنا جو حقوق نسوان سے اچھی طرح آگاہ ہوں۔

یہ مرکز حقوق نسوان کی خدمات کا مختصر خاکہ ہے جسکا مفصل اعلان آیندہ ہوگا امید ہے کہ حامیان حقوق نسوان ہمارا ہاتھ بٹائیں گے اس سلسلہ میں جو خط وصول ہونگے وہ ہمیشہ درج ہوکر نتیجہ شائع ہوگا۔

بجلی کا حیرت انگیز اثر

بلوسن پیج اپنی ایک قریبی اشاعت میں بجلی کے اثر کے متعلق ایک عجیب اثر بیان کرتا ہے لکھتا ہے کہ ہادو باراں کے طوفان میں ایک نوجوان وانگ کے قریب جنگل میں سے گھوڑے پر سوار گزر رہا تھا۔ یکایک اسکے سامنے والے ایک درخت پر بجلی گری اور درخت کے پھٹ کر دو ٹکڑے ہوگئے۔ اس خوفناک آواز سے گھوڑا یکایک بھڑکا اور پھٹے ہوئے درخت کے ٹکڑوں کے اندر سے بھاگ کر نکلنے لگا۔ عین اس موقعہ پہ جبکہ اسکا سارا دھڑ نکل چکا تھا اور صرف دم ذرا سی نوک باہر تھی درخت کے دونوں حصے یکدم پھر سے ملگئے اور اسکی دم کے کچھ بال اٹکے رہ گئے۔ چنانچہ یہ بال آجتک اس درخت میں لگے ہوئے ہیں نوجوان کو صدمہ تو پہنچا مگر باقی ہر طرح خیریت سے بچکر نکلگیا۔

آزادی

آزادی۔ کیا ہے وہ دل خوش کن لفظ ہے۔ جس کے پانچ حرف ایک سے ایک جدا ہیں۔ اور جو کبھی آپس میں ایک دوسرے سے ملنے کی کوشش نہیں کرتے۔

تھمے ہوئے پہاڑوں۔ بہتے ہوئے دریاؤں۔ چلتے ہوئے جانوروں کو دیکھتے ہوئے اگر آپ یہ باور کریں کہ ان میں سے کسی ایک کو آزادی حاصل ہے۔ تو غالباً غور و تفکر تھوڑی دیر کے بعد آپکے اس خیال کو اپنی جگہ سے دور پھینکنے میں پوری کامیابی کے ساتھ حصہ لیگا۔ اور آپ خود اپنے کو اوسکی تقلید کرتے ہوئے پائیں گے۔ دیکھئے اور غور کیجئے پہاڑ اپنی جگہ سے جنبش نہیں کر سکتے۔ دریا اپنے بہاؤ کا رخ نہیں بدل سکتے۔ جاندار اپنے ارادہ میں ناکامیاب ہیں۔ جہاں ان کی نظر پہونچ سکتی ہے وہ نہیں جا سکتے۔ جہاں ان کا خیال جا سکتا ہے وہ نہیں پہونچ سکتے۔ ہاں ان کا خیال البتہ کسیقدر آزاد ہے۔ جو سماعی اور دیکھے ہوئے مقاموں تک پہونچ سکتا ہے۔

ناظرین کا خیال ہوناکہ خیال تو بالکل آزاد ہے جہاں چاہے پہونچ سکتا ہے گو یہ صحیح بھی ہو تو بھی خیال دیکھی ہوئی چیزوں کو بعد میں اسی حالت سے اوسی صورت سے ذہن میں لا سکتا ہے جیسا کہ آنکھیں دیکھ چکی ہیں لیکن کچھ زمانہ گزرنے کے بعد یہ حالت تشکوکیت کو بڑھانے میں مدد دیتی رہتی ہے۔ اور زمانہ دراز گزر جانے پر صرف وہم و گمان

باقی رہ جاتا ہے۔

سماعی چیزوں اور مقاموں کی اصلی ہیئت و ماہیت دکھلانے میں قریب قریب خیال بالکل قاصر ہے گو یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے لاؤبالی ڈھکوسلوں سے اپنے فرضی دعووں سے ایک من گھڑت اور خیالی تصویر پر تاریک نما روشنی ڈال سکے اور ایک ایسا فوٹو پیش کر سکے جو حقیقتاً بے بنیاد ہو۔

ہاں مذہب میں اسکو بڑا دخل ہے۔ فلاسفر اور مادّہ پرست کہتے ہیں کہ ہر ایک شے میں خود وہ جس حالت میں ہو یا جس صورت میں اسکی ہیئت تبدیل ہو جائے اس شئے میں ان سب باتوں کے ہو جانے کے لئے مادہ موجود ہے یعنے قلب ماہیت کر سکتی ہے۔

نصاریٰ باپ بیٹے روح القدس کو خدا مانتے ہیں۔

اہالیان ہنود کا خیال ہے کہ ہر ایک کام ایک دیوتا سے جسکے وہ اختیار میں ہے تعلق رکھتا ہے۔

مسلمان خدا کو وحدہٗ لاشریک مانتے اور اسکے رسول پر ایمان لانے والے ہیں۔

ایسے ہی آریا اور دیگر قومیں سب اپنے اپنے خیال کے موافق اپنے اپنے مذہب کے پابند ہیں۔

پس میرا یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ تمام مذہبوں اور فرقوں کا خیال ایک محدود حد تک پہونچ سکتا ہے اور پھر اس سے آگے بڑھنے کی اس میں طاقت نہیں رہتی۔ پس ایسی حالت میں وہ آزادی سے کہیں دور رہ جاتا ہے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ خیال ایک ایسا تیز عنصر ہے کہ جسکی تیز رفتاری کے آگے ریل اور تار اور بے تار خبر رسانی کے ذرائع دم نہیں مار سکتے۔

میری اس تحریر کو تعجب کی نظروں سے دیکھتے ہوئے آپ متفکر ہوں گے اور خیال ہوگا کہ جب آزادی کوئی چیز نہیں تو اس بے معنے نام کا وجود اور عدم وجود برابر ہے۔ اور اس صورت میں آزادی اور پابندی میں میز احساس کرنے کی قوت اپنے آپ کو الوداع پکارنے کے لیے بجان و دل حاضر ہے۔

نقطۂ نظر سے خوض کرتے ہوئے میں اپنی آواز اون لوگوں سے ملاتا ہوں جنہوں نے آزادی کے چند مشہور اقسام بیان کرنے میں زبان قلم سے گوہر افشانی کی ہے۔

فکر معیشت سے آزادی۔ قید علایق سے آزادی۔ قید مصیبت سے آزادی عالم اسباب میں آزادی کے مشہور اقسام ہیں۔

شعرا کو سرو کی آزادی کی تعریف میں دیوان رنگنے میں پس وپیش نہیں ہوتا۔ آزادی کے لئے اوسکا بے ثمر ہونا دکھلایا جاتا ہے حالانکہ قانون قدرت نے کسی چیز کا بے ثمر ہونا آزادی کے لئے کوئی بین دلیل اور کافی ثبوت نہیں رکھتا۔ اگر خیال کیا جائے تو سرو کے شاخوں اور پتیوں کا بار بمقابلہ ایک بار آور درخت کے اس سے کہیں زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ پس سرو کی شاعرانہ آزادی کے متعلق آزادی سے کچھ کہنے میں میرا قلم قاصر ہے۔

اب میں ناظرین کی سمع خراشی کرتے ہوئے ہر سہ اقسام مندرجہ بالا کی نسبت اون کو توجہ دلاتا ہوں۔

قید علایق ۔ فکر معیشت کی آزادی کو تباہی اور بربادی کے غار کی طرف رفتہ رفتہ دھکیلنے میں کافی مدد دیتی ہے اور اپنے پوشیدہ مگر دراز ہاتھوں کی بدولت اوسکے سر سبز اور ہرے بھرے چمن کو خزاں بے بہار بنا دیتی ہے یا یوں سمجھ لیجے کہ جس طرح گھن اپنے تیز اور نرم دانتوں سے بڑے بڑے درختوں کو تو وہ خاک بنا دیتا ہے، ایک قالب بے جان بنا دیتی ہے ۔

تیسری قسم ۔ قید مصیبت سے آزادی ۔ مجھے اسکے متعلق چنداں کہنے کی ضرورت نہیں ۔ کیونکہ یہ ایک نہایت مشہور اور معروف قسم آزادی کی ہے ۔

اسکے علاوہ میری رائے میں ایک اور قسم بھی مشہور ہونے کے لئے ان سب سے زیادہ ہے اور اسکو پبلک ۔ قید ہستی کے نام سے موسوم کرتی ہے ۔ یہ سب قیدوں سے آزادی دلانے والی قسم ہے ۔ اسکے حصول کے بعد نہ فکر معیشت باقی رہتی ہے اور نہ قید علایق ۔ نہ قید مصیبت ۔

تجمل حسین زکی

رباعی

زردار کو فکر زر بڑھانے کی ہے
محتاج کو فکر روز کھانے کی ہے
منعم ہے گدا گدا ہے منعم ان میں
تفریق فقط دھر و کھانے کی ہے

منکرِ مے بودن و ہم رنگِ مستاں زیستن؟

معترض ہیں مجھ پہ میرے مہربانانِ قدیم — جرم یہ ہے میں نے کیوں چھوڑا وہ آئین کہن؟
میں نے کیوں لکھے مضامیں سست سیاسی پہ — کیوں نہ کی تقلیدِ طرزِ رہنمایانِ زمن
کانگرس سے مجھ کو اظہارِ برأت کیوں نہیں — کیوں حقوقِ ملک میں ہوں ہندوؤں کا ہم سخن

خیر میں تو شامتِ اعمال سے جو ہوں سو ہوں — آپ تو فرمایئے کیوں آپ نے بدلا چلن
آپ نے شملہ میں جا کر کی تھی جو کچھ گفتگو — ما حصل اسکا فقط یہ تھا بس از تمہید فن
"سعی بازو سے ملیں جب ہندوؤں کو کچھ حقوق — اس میں کچھ حصہ ملے ہمکو بھی بہرِ پنجتن"
یعنے جا کر شیر جب جنگل سے کر لائے شکار — لومڑی پہنچی کہ کچھ مجھ کو بھی اے سرکارِ من!

لیکن اب تو آپکی بھی کھلتی جاتی ہے زباں — آپ بھی اب تو اڑاتے ہیں وہی طرزِ سخن
اب تو مسلم لیگ کو بھی خواب آتے ہیں نظر — اب تو ہے کچھ اور طرزِ نغمۂ مرغِ چمن
ملک پر اپنی حکومت چاہتے ہیں آپ بھی — تھا یہی تو منتہائے فکرِ یارانِ وطن
آپ نے بھی اب تو نصب العین کہا ہے وہی — کانگرس کا ابتدا سے ہے جو موضوعِ سخن
آپ بھی تو جادۂ (سید) سے اب ہیں منحرف — اب تو اوراقِ وفا پر آپ کے بھی ہے شکن

جب یہ حالت ہے تو پھر مجھ پر ہے کیوں خشم و عتاب
"منکرِ مے بودن و ہم رنگِ مستاں زیستن؟"

شبلی [illegible]

عالمِ خیال

رات کے اس حصہ میں جب دماغ دن بھر کے افکار سے اکتا کر سکون کی طرف راغب ہوتا ہے قدرت اپنے ہاتھ سے لوریاں دیتی ہے کبھی کبھی تخیل وہ صورتیں سامنے لا بٹھاتا ہے جنکو آنکھ سے چھپے مدتیں ہوگئیں تعلقات ہمیشہ کے واسطے بھلا چکے اور دنیائے حیات نے جنکو بخیر و خوبی رخصت کر دیا دل انپر روتے روتے تھک چکا نگاہ ان کو ڈہونڈتے ڈہونڈتے ہار گئی اور اب انکا سراغ صرف اتنا چل رہا ہے کہ فانی روح قفس عنصری سے اڑگئی اور جسد خاکی ایک مٹی کے ڈھیر میں دبا پڑا ہے جو ہوگیا یا اب خاک ہونے والا ہے۔

رات کے اسی حصہ میں جب نیند آنکھوں میں بھری ہوتی ہے۔ یہ بچھڑی ہوئی صورتیں جو وقت سے پہلے اٹھ گئیں یہ نازک پھول جو کھلنے سے پہلے مرجھا گئے عالم خیال میں گلے سے لپٹتے ہیں۔ روتے ہیں رلاتے ہیں ہنستے ہیں ہنساتے ہیں۔ ترسی ہوئی نظریں محبت میں ڈوبی۔ ان کے استقبال کو اٹھتی ہیں اور آنکھوں میں لا کر بٹھا دیتی ہیں۔

اب ان کی باتیں۔ ان کی زندہ راہیں ان کے سن۔ بہار سے بھرے دن جنکو عالم حیات۔ الوداع کر چکا۔ خیالستان کی نازک سرزمین میں۔ سامنے آنے ہیں۔ اور کچھ دیر تک وہی اگلے پچھلے جلسے اپنا رنگ جما دیتے ہیں۔

رات کے اسی حصہ میں، جب عمر بھر کی حسرتوں کا خون اپنی تصویر دکھاتا ہے۔ اور وہ ہری بھری کونپلیں۔ جو لہلہاتے لہلہاتے مرجھا گئیں۔ اجڑی ہوئی نظر آتی ہیں۔ تو یہ خیال ادہر اُدہر کی ٹھوکریں کھاتا دماغ کی ان حدود میں پونچتا ہے جہاں بہ بچھڑے دوست جمع ہوتے ہیں۔ جلسہ شروع ہوجاتا ہے۔ مقدس عمامے۔ سیلہ چادریں۔ رنگین ڈوپٹے۔ بھولے بھالے چہرے۔ موجود ہوتے ہیں۔ چاند سر پر ہوتا ہے۔ تارے جگمگاتے ہیں۔ دل مجروح اہل مجلس کے پاؤں چومتا اور ان قدم سر آنکھوں پر رکھتا ہے۔

رات کا وہی حصہ ہے۔ اور وہی محبت۔ اللہ اللہ کیسے کیسے لوگ جمع ہیں۔ دل جنکے ملنے سے نا امید۔ اور آنکھیں جنکے دیکھنے سے مایوس ہوچکی تھیں۔ ہاتھ جنکو ناپید کرچکے تھے۔ عالم خیال آج ان کو پیدا کررہا ہے۔

آؤ آؤ۔ دل پر حکومت کرنے والی تصویروں آؤ۔ آنکھیں تمہارے واسطے فرش راہ ہونگی۔ اور دل تم کو پہلو میں جگہ دے گا۔ تمہاری مفارقت کا ہر حرف دیکھنے والوں کو سبق دے گا۔ جنہے تم کو بھلا دیا آنے والے ہم کو بھلائیں گے۔ تمہاری صحبت کوئی دم میں درہم برہم ہوتی ہے۔

رات کا وہی حصہ ہے۔ مگر اب تخیل تمہارا ساتھ چھوڑے گا۔ قدسی لوریاں اپنا کام کرنے لگیں۔ نیند کا جادو چل گیا۔ اٹھو۔ اٹھو۔ تمہاری تصویریں دہندلی ہوگئیں کلیجہ سے لپٹو۔ اور زندوں کے ساتھ سو رہو۔

وہ بے ادب صدا تھی جو غیر کو نہ بھائی

جو ہیں رفارم کرتے جو ہیں بنے سپیکر اسٹیج پر جو آکر دیتے ہیں اپنے لکچر
مذہب میں اپنے جو ہیں محو خلاف دیگر تعلیم سے ہیں جتنے جویائے راز نیچر

ان سب سے ہم ہیں کہتا اپنے ادب کو دیکھو
پہلے یہ کام کر لو آخر میں سب کو دیکھو

جو چاہے کچھ اثر ہو لفظوں سے اسکے پیدا تحریر سے جو چاہے پورا ہو اسکا منشا
تقریر سے جو کرے دشمن کو دوست اپنا باتوں سے جو کہ چاہے ہو موم سنگ خارا

وہ نسخہ ادب کو ہر وقت پاس رکھے
اللہ کی مدد کی ہر وقت آس رکھے

گر چاہتے ہو دل میں غیروں کے گھر بنانا گر چاہتے ہو اپنا اجڑا محل بسانا
منظور ہے جو تم کو قسمت کا آزمانا گر چاہتے ہو ظاہر ہو تم سے فعل مردانا

تو کر لو یاد اپنے بھولے ہوئے ادب کو
پھر مات دے سکو گے باتوں سے اپنی سب کو

انگلش کی پالسی میں بے وقت کچھ نہ بولو انکی مخالفت میں اپنی زباں نہ کھولو
جس سے کہ تم مخالف انکے سمجھے ہو لو ہر وقت گنگا میں دامن ہوا کو دھو لو

راضی کہیں نہ ہووے کوئی مخالفت سے
راضی ہو ہر طبیعت سچی موافقت سے

ہر بات میں ادب کو سمجھو تم اپنا رہبر ہر بات میں ادب کو سمجھو ہے خضر پیکر
یہ تاج ہے تمہارا معراج شاہ و قیصر یہ ہے تمہارا بھائی یہ ہے تمہارا لشکر

ہوتے ادب سے دیکھے دنیا میں دوست دشمن
روشن وہ گھر ہے جس میں شمع ادب ہے روشن

اللہ کی رحمت سید نے تھا یہ چاہا کالج میں جمع کر دیں مجموعہ اک ادب کا
جسکو دیکھیں لڑکے برتیں وہ طرز انشا ہر دہ کا تفاوت سمجھے ہر ایک لڑکا

لیکن یہ کام اب تک یوں ہی پڑا ہوا ہے
کر لو اسے مدون یہ قوم کی دوا ہے

معدن پہ تم کھڑے ہو لیکن نہیں سمجھتے ہوتا لعل کیسا ہوتے ہیں کیسے ہیرے
معدن سے تم نے پائے بلور کے ہیں ٹکڑے تم کو وہ نور سمجھے بلور ہی کو اپنے

لئے کاش یہ نہ لیتے ہیرے کے بدلے پتھر
لیتے تو چن کے لیتے یاقوت و لعل و گوہر

اکبر کے نورتن میں علامی اور فیضی دونوں ادب کے پتلے گذرے جہاں میں نامی
جو بات جس ادب سے پاؤ تم انکی لکھی میسر ہوئی ہی لازم۔ اردو میں شان اسکی

انگلش میں تم کو لازم منشا اسی ادب کا
تصویریں سو بناؤ لیکن ایک ہو کینڈا

بیچے بدی کے حسن ادب کو دیکھو جتنے ادیب گذرے لفظوں کو سب کے دیکھو
سعد اللہ خاں کے لطف حسن طلب کو دیکھو کس طرح سرد کرتے جوش غضب کو دیکھو

پڑھ جاؤ دل لگا کر آئین اکبری کو
دیکھو ادب سے لیکر توقیع سنجری کو

تم شاہنامے کو پڑھ جاؤ ادب کی باتیں اسکو نہ دیکھو اسمیں لکھی ہیں کب کی باتیں
تم دیکھ لوگے اسمیں پاؤگے سب کی باتیں اظہار غم کی شکل۔ لطف و طرب کی باتیں

اسکا مذاق سے پیارا اپنا ادب بناؤ
اردو میں فارسی کی سی شان ادب دکھاؤ

تاریخ کے کچھ نمونے ہو جائیں گر میسر انکو ادب سمجھ کر کھو تم اپنے سر پر

علمائے فارسی میں گر عالمانہ دفتر　　　انگلش نے جس ادب کو سمجھا ہی پناہ ہر

ان سب کو جمع کر کے مجموعہ اک بناؤ

انگلش زباں میں اپنی وضع ادب دکھاؤ

انگلش مذاق تم کو آئے نہ راس اصلا　　　ممکن نہیں ہے ہووے دونوں کا ایک منشا

وہ ملک کے ہیں مالک تم انکی ہو رعایا　　　مفتوح کا مساوی درجہ ہوا نہ ہوگا

طاقت تو کر لو پیدا ہاتھوں پلٹکل کی

پھر سب نکال لینا جو آرزو ہو دلکی

رباعیات ثاقب اشہری

کیا غم ہے جو کیسے میں زر و مال نہیں　　　کیا غم ہے جو اولاد نہیں آل نہیں

اسنے فتنوں سے بچایا مجھکو　　　آزاد ہوں جھگڑا نہیں جنجال نہیں

کیا ملک و زر و مال کی حاجت مجھکو　　　کافی ہے مرا گوشۂ عزلت مجھکو

للہ مرے حال پہ اب رحم کریں　　　کیوں چھیڑتے ہیں صاحب دولت مجھکو

افلاس بڑی بلا ہے انسان کے لئے　　　مفلس ہو کے جئے تو کیا خاک جئے

تنگ آ کے یہاں تک اسکے ہاتھوں اکثر　　　کرنیکے نہ تھے کام جو کچھ وہ بھی کئے

جس سے قایم رہیں نہ انساں کے حواس　　　افلاس ہے افلاس ہے افلاس ہے افلاس

انسان کے لئے [illegible]　　　[illegible]

سوسائٹی کی اندرونی حالت

گذشتہ سے پیوستہ

اور ایک عجیب شرمگیں سی ادا سے کہا۔ تم ہو بھائی آفتاب! بس وہ اک ایسی ناشدنی گھڑی تھی کہ مجنوں ہو گیا۔ اور از خود رفتگی نے پیر پھیلائے۔

اب کہ یارائے صبر وخودداری نہیں رہی تو اس عریضے کے ذریعے یہ چاہ رہا ہوں کہ تم کو میری محبت اور سوز پنہانی کی اطلاع ہو جائے۔ اور یہ مجھے معلوم ہو جائے کہ آیا میرے جنوں کا بھی اثر ہے کہ نہیں۔ بے ادبی کی معافی۔ زیادہ کیا لکھوں۔

مبتلائے مصیبت

"آفتاب"

از دشت منزل۔ (دوسرے خط کا جواب)

اچھے .... آفتاب!

تسلیم۔ نوازش نامہ بہنوں کے ہاتھ پہونچا۔ یاد آوری کا شکریہ۔ افسوس مجھ تنگ خاندان کو بے غیرت زندگی کا ساتھی ہونا پڑا! مجھ سے جس قسم کے استفسارات کا جواب چاہا گیا ہے۔ اُن کا جواب میری زبان قلم کو زیبا نہیں۔ جواب لکھنے کے لئے جن واسطوں کو تراشا ہے وہ چھچھلے ہیں۔ مگر ہر وقت پہلے نہیں لگتے۔ خیر لکھتی ہوں!

(۱) تمہارے پیغام کو اماں نے بعض مصلحتوں سے واپس کیا ہے!

جنکو میں قلمبند نہیں کرسکتی۔ آگے چل کے خود معلوم ہو جائے گا۔!

(۲) چھوٹے ماموں صاحب کے متعلق یہاں کوئی گفتگو نہیں نہیں مجنونانہ وہم ہو گیا ہے۔۔۔۔۔۔۔ ذرا ہوش کی باتیں کیا کیجیے! اگر بفرض محال ایسا ہوا بھی تو یاد رکھئے حبیبہ ۔۔۔۔۔۔۔۔ فقط تمہاری ہے۔ طبیعت پر جبر ممکن ہو مجھپر مشکل ہے۔ اگر یہ بھی ہوا تو تم خوش جینا۔ اور ضرور جینا۔ مگر میری جان ۔۔۔۔۔۔ تصدق ہو جائے گی۔

والتسلیم۔ کوتاہ قلمی کی معافی۔

تمہاری ناشاد

(حبیبہ)

'صدمہ جانکاہ'

مرنے والا مر جاتے۔ مگر اوسکی عادات خصائل اور سب سے زیادہ یہ کہ اوسکے تعلقات پیچھے والوں کے لئے ایسی صدمہ دہ یادگار بن جاتے ہیں کہ برسوں کے لئے نقش فی الحجر ہو رہتے ہیں۔!

گرمیاں گئیں جاڑے! برسات کے جھالے موجیں سے چکے پشمینے اور دوشالے تہ کر کے صندوق میں داخل ہو گئے۔ دنیا کی موجودات میں انقلاب ہوتے رہیں! اب کی باتیں فسانہ۔ اور پہلے فسانے پرانے ہو جا دیں! سب کچھ ہو۔ مگر جانے والی صورت۔ ہر صورت و واقع حال پر منطبق نتائج کے سلسلے سے اوسکی باتیں۔ اور ملاقاتیں یاد دلاتی اور سیاہ کرتا نہ کرتی رہیں گی!! اور اسیطرح پھر تعلقات کے مدارج وامتیاز ہیں۔ دوست کو دوست کی۔ اہل غرض اور معاملہ کو بہ قدر رفاع احتیاج۔ اور بیٹے کو ماں کی! بہن کو بھائی اور بھائی کو بہن کی افادہ کو